تذکرۂ ستاریہ
مؤلفہ
امیر حمزہ شنواری
مترجمہ: سید طاہر بخاری
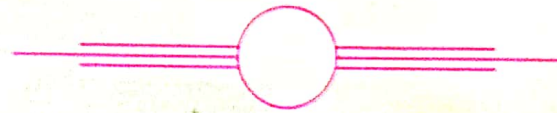
تذکرۂ ستاریہ

تصنیفِ لطیف

الحاج امیر حمزہ شنورای چشتی نظامی نیازی

مدظلہ العالی

مترجمہ

سید طاہر بخاری

کتاب	:	**تذکرۂ ستاریہ**
نام مؤلف	:	امیر حمزہ شنواری
نام مترجم	:	سید طاہر بخاری
سنۂ اشاعت	:	2003ء (دوم ایڈیشن)
مطبع	:	جدون پرنٹنگ پریس، پشاور۔
اہتمام	:	ڈاکٹر مسعود احمد پولیس ہسپتال پشاور
قیمت	:	-/200 روپے

ترتیب

برادرِ طریقت ٹھیکیدار حاجی غلام سرور خان شنواری کے نام۔
جنہوں نے نہ صرف حضور مرشد پاک کی درگاہ میں مسجد تعمیر فرمائی۔ بلکہ اس کے علاوہ **''تذکرۂ ستاریہ''** کی اشاعت میں بھی بھرپور حصہ لیا۔

فجزاہُ اللہ احسن الجزاء
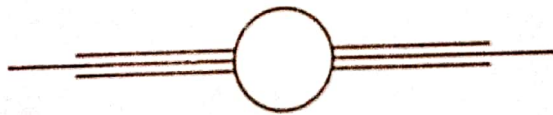
حمزہ نظامی نیازی شنواری

عرضِ مؤلف

حضور بادشاہ جؒان کے وصال فرمانے کے چند دن بعد میں نے تذکرۂ ہذا لکھنا شروع کیا تھا اور وقتاً فوقتاً لکھتا رہا اور مکمل ہو جانے کے بعد کچھ ایسے حالات رونما ہو گئے کہ اس کی طباعت کا انتظام نہ ہو سکا۔ ﴿کل امر مرھون باوقاتھا﴾۔

برادر طریقت جناب سید طاہر بخاری نے اسے پشتو سے اردو میں ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور میں نے بھی مناسب سمجھا کہ تذکرۂ ہذا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ اس لئے کہ پشتو پڑھنے والوں کی تعداد نہایت ہی کم ہے کیونکہ انگریزی حکومت نے پشتو کو نصاب تعلیم میں کوئی جگہ نہیں دی تھی۔ اور برصغیر کی تقسیم کے بعد جب پاکستان بنا تو تب بھی نصاب تعلیم کا وہی حال رہا جو انگریزوں کے عہد میں تھا۔ گو بعد میں کسی حد تک پشتو نصاب میں داخل ہو گئی۔ مگر وہ بھی لازمی نہیں بلکہ اختیاری مضمون کی حیثیت دے دی گئی۔ اس لئے پشتو پڑھنے والوں کی تعداد برائے نام ہی رہی۔ اور اب تک یہی حال ہے۔ گو نئی تعلیمی پالیسی میں علاقائی زبانوں کو مڈل تک ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی گئی ہے۔ مگر سنا جاتا ہے کہ اس کے خلاف بھی برادران وطن کی ایک متعصب جماعت جدوجہد میں مصروف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضور بادشاہ جؒان سے روحانی تعلق رکھنے والے صرف پشتون ہی نہیں تھے۔ ہندوستانی، پنجابی، سندھی اور بنگالی بھی تھے۔ جو اگر تذکرۂ ہذا صرف پشتو میں شائع کرا دیا جاتا تو وہ لوگ محروم رہتے۔ اس لئے میں نے سید طاہر بخاری سے اتفاق ظاہر کیا۔ اور انہوں نے نہایت محنت اور جانکاہی سے اس کا ترجمہ اردو میں کر دیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزا"

میں نے اس......تذکرۂ میں صرف وہی حالات لکھے ہیں جو میرے مشاہدہ میں آئے ہیں۔ یا چند وہ واقعات جن کے راوی دیانتدار اور پاکیزہ کردار کے مالک تھے۔ گو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا۔ مگر اس میں مرور ایام سے حافظہ میں کچھ دھندلی یادیں ہی رہ گئی تھیں۔ اس لئے انہیں نظر انداز کر دینے میں بہتری محسوس کی۔

علماء کرام سے گزارش ہے کہ تذکرۂ ستاریہ کو ایک عالم انسان کی تالیف نہ سمجھیں بلکہ مدرسۂ تصوف کے ایک ادنی طالب علم کے افکار جان کر درگزر سے کام لیں۔ اور مؤلف کو اس کی غلطیوں کی اطلاع دیں۔ تاکہ دوسری اشاعت میں ان کا ازالہ کیا جائے۔

حمزہ شنواری

لنڈی کوتل 3-11-69

ھوالکل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یامعین

عرضِ مترجم

الحمد للہ منہ بہ علیہ والصلواۃ من لدیہ الیہ
ازاں شمائل و الطاف وحسن خوش کہ تراست

میان بزم حریفاں چو شمع سر برکن

برہان المحققین، سالکِ تجرید، تاج العارفین، مالک ممالک تفرید، سیمرغ قاف یقین، فخر العلماء الاولیاء، ولایت وسیادت پناہ۔ مکرمی ومحترمی وسیدی ومولائی حضور وقبلہء انوار سید عبد الستار شاہ بادشاہ جان، مظہر حق، مجددِ بے نوا رضی اللہ عنہ پیکر حیا، مجسم علم عمل، بے ریا عاشق صادق اور عارف کامل تھے۔ ان کا سینۂ اقدس ظاہری اور باطنی علوم کا گنجینہ تھا، فخر علم خفی آپ کا خطاب تھا۔ آپ کے اشارات ومعاملات کو خصوصی قبولیت حاصل تھی۔ آپ عابدِ مستانہ اور زاہدِ رندانہ تھے۔ آپ بیک وقت امام شریعت اور شہنشائے قلمروئے معرفت تھے۔ آپ عبد منیب کے درجہ علیاء پر فائز تھے۔ اور کشتۂ خنجر تسلیم ورضا تھے۔ سبحان اللہ العظیم۔

بیان وصف تو گفتن نہ حد امکان ست
چرا کہ وصف تو بیروں زحد امکان ست

فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ سالک حضرت ملکوت، شاہد عزت جبروت اور مقبول چادر عصمت لاہوت تھے۔ تذکرۂ ستاریہ کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگی۔ کہ فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ، ناطق حقائق اسرار مکمل نور ہدایت اور مظہر حق تھے۔ آپ صحیح معنوں میں "**تخلقوا باخلاق اللہ**" کی تفسیر۔ الفقر فخری کے مفہوم۔ وبہ افتخر کی شرح **کُنتَ کَنزاً مخفیاً** کے اعلان عام اور **فَاَحبَبتُ** کا مظہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صدر نشین مسند ولایت وعنایت۔ فخر سادات وسیادت' مقرب ومقبول ذاتِ احدیت اور نقطۂ دائرہ توحید تھے۔ فقر ودرویشی آپ پر ختم تھی۔ "**واذا اتم الفقر فھو اللہ**"۔

اے بادشاہِ صورت و معنی کی مثل تو
نادیدہ ہیچ دیدہ و نشنیدہ ہیچ گوش

فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ کے سیادت وعصمت پناہ والدین رحمۃ اللہ علیہم اور ساتھ ہی ان کے تمام خاندان سیادت و ولایت پر تا شاہِ ولایت' یعسوب المومنین مولائے کائنات' شمس المشارق والمغارب' مشکل کشا علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور رسالت پناہ رسول رحیم وکریم محمد

مصطفیٰ ؐ احمد مجتبیٰ ؐ مظہر اتم واکمل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بے شمار درود وسلام ہو۔ جن کے مقدس ومطہر صلبوں میں وہ منتقل ہوتے رہے۔ اور اس مقام، اس گھر، اس گاؤں اور اس سارے علاقے پر لاکھوں سلام ہوں۔ جہاں ہمارے حضور بادشاہ جانؒ نے علم احدیث ذات سے ہو کر اس عالم رنگ و بو میں ظہور فرمایا۔ نیز ان پیرانِ پیر باصفا اور مرشدان اتقیا رضی اللہ عنہم کی مقدس ارواح پر حق سبحانہ وتعالےٰ کی ان گنت رحمتیں نازل ہوں۔ جنہوں نے اس عالم کون وفساد میں ہمارے حضور بادشاہ جانؒ کی بکمال لطف وکرم روحانی تربیت فرمائی۔ اور اسی کے طفیل ہمارے حضور بادشاہ جانؒ نیابت وخلافت الٰہی عز اسمہٗ سے سرفراز ہو کر تاج ولایت عصائے کرامت، عمامۂ بزرگی اور لباسِ تقویٰ سے مزین ہوئے۔

ذالک خیرط۔

شکر خدا کہ ہر چہ طلب کردم از خدا
برمنتہائے مطلب خود کامران شدم

اے پشاور! اے منتخب ومحبوب شہر! بخدا تم قابل رشک ہو، کیونکہ ابد تک تم کو بجا طور پر یہ فخر حاصل رہے گا۔ کہ فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ نے تیرے ہی ایک جگر گوشہ میں ابتدائی قیام شروع فرمایا۔ جو علاقہ ڈبگری کہلاتا ہے۔ اور اسی ڈبگری میں اس تاجدار ملک ملکوت نے عشق کی دکان ہی نہیں بلکہ پورا بازار کھول دیا اور یہی وہ مقام ہے جہاں فخر علم خفی وقبلہ انوار بادشاہ جانؒ نے توحید الٰہی کی شمع ہی نہیں بلکہ رشد وہدایت کے تابندہ ودرخشندہ آفتاب ومہتاب کو بھی روشن فرمایا۔ اور من بعد اسی مرکز انوار سے برعظیم ہند وپاک، افغانستان، سرزمین آزاد قبائل اور خدا جانے کہاں کہاں تک اسرارات الٰہی اور عشق الٰہی کی کیف آور گرمی سے الحاد زدہ اور غفلت سے یخ بستہ قلوب کو توحید الٰہی کی روشنی اور عشق خداوندی کی حرارت سے متحرک فرمایا۔ یہی وہ ڈبگری ہے جہاں رہ کر ہمارے حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی درسگاہ معرفت وسلوک میں قرآنی بطون کے کوثر وسلسبیل سے مردان باصفا کے سینوں کو لبریز فرما کر ہمیشہ کے لئے مقفل فرمایا۔ اور ایسے ایسے مردان راہ سلوک اور باوفا مریدوں کی عرفانی تربیت فرمائی جس پر آسمانی مخلوق کو بھی فخر رہے گا۔ **سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا۔**

ملک درسجدۂ آدم زمیں بوس تو نیت کرد
کہ درحسن تو چیزے یافت غیراز طور انسانی

مخالفین

فخر العلماء والاولیاء حضور بادشاہ جانؒ کے مخالفین کا بھی بے حد شکریہ، جنہوں نے روایتی مخالفتوں کو بروئے کار لاکر باری باری اپنے حربوں کو آزمایا۔ ظاہر ہے۔ کہ اس سے حضور بادشاہ جانؒ کو تو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا البتہ مخالفین کو حضور بادشاہ جانؒ کی ذات بابرکات سے ضرور فائدہ پہنچا۔ اس طرح کہ مخالف عنصر کی بناء پر حضور بادشاہ جانؒ کے باطنی علوم کو مزید در مزید آشکار ہونے کا موقع میسر آتا رہا۔ ساتھ ہی ان کا بے مثال صبر و تحمل بھی رنگ لاتا رہا۔ چنانچہ اس خلق عظیم سے مخاصمت رکھنے والے حضرات بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مخالفین پر بھی حضور بادشاہ جانؒ کی جلالت شان ظاہر ہوگئی۔ اور بحمد اللہ ان کے مخلص ارادتمندوں کی صف میں شامل ہو کر گرویدہ بن گئے۔ **اللہم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔**

چہ رہ بود اینکہ زد در پردہ مطرب
کہ می رقصند باہم مست و ہشیار

تو ایسی قدسی صفت ہستی جن کے طور و اطوار بات چیت نشست و برخاست اعمال و خصائل القائی الہامی قدروں کے حامل ہوں۔ اور اس کے باوصف یقین و استقامت میں یگانۂ روزگار ہو۔ علوم ظاہر و باطن کا مجمع البحرین ہو۔ رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہو۔ معاملت اور رموز و نکات میں یکتائے زمانہ ہو۔ جود و کرم اور عفو و درگزر میں بے مثال ہو۔ شکل و صورت میں حسین اور صاحب جمال ہو۔ اولاد علی علیہ السلام ہو۔ فخر سادات ہو۔ زیرک و معاملہ فہم اور انتہائی دانا ہو۔ الغرض ہر طرح سے کامل اور اکمل انسان ہو۔ اور برضائے الٰہی عزوجل راضی ہو۔ تو ایسی بابرکت ہستی کی سوانح اقدس پر قلم اٹھانا۔ ظاہر ہے۔ کہ ہر کہہ و مہہ کا کام نہیں۔ چہ جائیکہ اس کا پورا پورا حق بھی ادا کر سکے۔ مانا کہ تذکرہ ستاریہ سے قبل بھی بعض کرم فرما عقیدتمندوں نے مقدور بھر کوشش کی تھی۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک ان اصحاب کے خلوص و محبت کا تعلق ہے تو بالیقین وہ لائق تحسین ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ اسے بہ نظر استحسان ہی دیکھا جائے گا۔ مگر خدا لگتی بات یہ ہے۔ کہ خلوص و محبت سے قطع نظر ایسے عقیدتمندوں کی تالیفات اکثر و بیشتر ارادتمندوں اور خصوصاً باریک بین اہل علم حضرات کی تشفی نہ کر سکتی تھیں۔ اور نہ ہی یہ ممکن تھا۔ **لا یعرفھم غیری۔**

خلقے زباں بہ دعویٔ عشقش کشادہ اند
اے من غلام او کہ دلش بازباں یکے ست

چنانچہ فخر علم خفی حضور بادشاہ جانؒ کی سیرت اقدس کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے ایک بحر علم کی

ضرورت تھی۔ جو نہ صرف منتخب روزگار عالم ہو۔ بلکہ حق پرست محقق۔ بیحد محتاط اور ظاہر و باطن میں یک رنگ ہو۔ یہاں تک کہ وہ خود حضور بادشاہ جانؒ کے مثل ہو۔ یعنی ایک ایسی جامع کمالات شخصیت جو نشست و برخاست، اکل و شرب، سخاوت و معاملت قول و فعل، اخلاق و آداب اور علم و بینش میں بہ ہر انداز حضور بادشاہ جانؒ کے مشابہ ہو۔ اور ان کی دور رس نگاہوں میں اس قدر وسعت موجود ہو۔ کہ فخر علم خفی حضور بادشاہ جانؒ کے اشارات وارشادات کو خورد بینی نظر سے جانچنے اور پرکھنے کی مکمل استطاعت رکھتی ہو۔ اور بایں ہمہ حضور بادشاہ جانؒ کے سخن ہائے رموز و نکات کو پھیلا کر شرح و بسط سے حوالہ قلم کرسکتی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس عاجز و بے ہیچ کا اشارہ پیر و مرشد جناب و قبلہ حضرت امیر حمزہ باباؒ شنواری کی طرف ہے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ ان معنوں میں جناب و قبلہ حضرت حمزہ باباؒ کی ذات والا صفات ہی مذکورہ بالا معیار پر پوری اترتی ہے۔ اور شبہ نہیں رہتا کہ بایں علم و دانش حضرت حمزہ باباؒ کو حضور قبلۂ انوار بادشاہ جانؒ کی سوانح اور خصوصی طور پر ان کے طریقۂ تربیت کو منظر عام پر لانے پر پورا عبور حاصل تھا۔ اس لئے بھی کہ میرے حضرت حمزہ باباؒ برسہا برس حضور بادشاہ جانؒ کے سفر و حضر میں رفیق رہے اور اس حقیقت میں بھی کوئی شک نہیں کہ حضور بادشاہ جانؒ نے دانستہ طور پر باریک ترین علمی نکات۔ ادق ترین تحقیقی مسائل اور نازک ترین عرفانی کلام بیان فرمانے کا تعلق صرف اور صرف حضرت حمزہ باباؒ سے رکھا۔ کیونکہ حضرت حمزہ باباؒ صحیح معنوں میں اس کی اہلیت رکھتے تھے۔ اور حضور بادشاہ جانؒ کی نگاہ اقدس سے یہ امر مخفی نہ تھا کہ حضرت حمزہ باباؒ ہی ان کے نکتہ رس اور صحیح معنوں میں مزاج شناس ہیں۔ لہٰذا ان منفرد خصوصیات کی بنا پر حضور بادشاہ جانؒ نے از راہ کرم گستری نہایت شفقت اور بڑی احتیاط سے حضرت حمزہ باباؒ کی خصوصی تربیت فرمائی۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر دہابی ملا (حضور بادشاہ جانؒ کے ایک عالم مرید) کی ایک بات کے جواب میں خود حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا تھا۔ کہ ''میں ہی حمزہ کی زبانی بول رہا ہوں'' چنانچہ یقیناً ان اقدسی الفاظ کے پس منظر میں کچھ مخصوص مصلحتیں کارفرما تھیں۔ جن کو صاحبان فہم بخوبی جان سکتے ہیں۔ گویا ایک ایسا مقام آ گیا تھا۔ کہ حضرت حمزہ باباؒ مجسم حضور بادشاہ جانؒ ہو گئے تھے۔ اور ان کے لئے من دیگرم تو دیگری کا پردہ درمیان سے ہٹ گیا تھا۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حضرت حمزہ باباؒ کے اشعار میں بھی واضح طور پر اشارات موجود ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنے ایک شعر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ۔

ما آویار کہ مخامخ کری حہ حاصل دی؟
آئینہ بہ آئینے تہ مقابل کہ؟

(مجھے اور میرے محبوب کو اگر آمنے سامنے بٹھا بھی دیا جائے۔ تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ یہ بالکل ایسی بات ہو گی جیسے ایک آئینہ دوسرے آئینے کے سامنے رکھدیا جائے) سبحان

اللہ صفائی اور یکرنگی کا یہ کونسا عالم تھا؟ بہرحال ایک اور شعر بلاتبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

داسے داشنا کرم چہ خپل خان دِ کرم
ورک یم لہ خپل خانہ پہ خپل خان یمہ

(اے میرے محبوب تم نے اپنے سے مجھے اس طرح آشنا کر دیا ہے۔ کہ اب ہم دونوں میں غیریت نہیں رہی۔ گویا اپنے آپ سے گم ہو کر اپنے آپ ہی کو پا رہا ہوں)

مقصد یہ ہے کہ اہل نظر حضرات ان۔ اور ان جیسے دوسرے اشعار و اشارات سے حضور بادشاہ جانؒ اور حضرت حمزہ باباؒ کی یکرنگی اور یکسانیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بہرحال ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس عاجز و بے ہیچ کا تو اس بات پر بھی مکمل ایقان ہے کہ اب بھی۔ بعد از وصال حضور بادشاہ جانؒ کا مزار اقدس نہ تو زیر زمین ہے اور نہ ہی سطح زمین پر۔ بلکہ اب وہ حضورؒ، حضرت حمزہ باباؒ کے قلبی گنبد میں منتقل ہو کر اسی پایۂ تخت میں سکونت پذیر ہیں۔ قلوب الابرار قبور الاسرار

بعد از وفات تربت مادر زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

تاہم نامعلوم مصلحتوں کی بنا پر حضرت حمزہ باباؒ بے پناہ اخفیٰ سے کام لے رہے ہیں۔ کسی کی تسلی کی خاطر اور بھول کر بھی کسی طرح سے بھی ایسی باتوں کا اظہار نہیں فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس عاجز کے لئے بھی اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ خاموش رہے ورنہ جی تو چاہتا ہے کہ اس بحث کو شرح و بسط سے حوالۂ قلم کیا جائے۔ وجف القلم بما ھو کائن۔

زمرغ صبح نہ دانم کہ سوسن آزاد
چہ گوش کرد کہ بادہ زباں خموش آمد

تو عرض یہ کرنا تھا کہ حضرت حمزہ باباؒ کی تفویض و سپردگی اور حضور بادشاہ جانؒ کی قبولیت کا یہ عالم تھا۔ چنانچہ اسی امر سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے۔ کہ تجدید تربیت و سلوک کا وہ منفرد طریقہ جو ہمارے حضور بادشاہ جانؒ کا طرۂ امتیاز تھا۔ حضرت حمزہ باباؒ اس کے ہر باریک سے باریک تر نکتے سے بخوبی واقف اور باخبر تھے۔ جو بعد میں بلاشک وشبہ ان کو ورثے اور امانت خاص الخاص کے طور پر بھی مل گیا۔ جسے انہوں نے بکمال وجوہ اپنایا۔ ابھی تک اسے نبھا رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ نبھاتے رہیں گے۔ اس حقیقت پر بھی حضرت حمزہ باباؒ کے اشعار گواہی دیتے ہیں۔ مثلاً حضور بادشاہ جانؒ سے خطاب ہوتا ہے۔ کہ

ستا بے نوائی شوہ دحمزہ نصیب
اوس پہ دتل مستہ نوا اور مہ

(اے مرشد دل آگاہ تیری "بے نوائی" حمزہ کے حصے میں آ گئی اور اب میں ہمیشہ کے لئے تیری ہی

صورت سرمدی اور تیری ہی قدسی صداؤں کو سماعت کرتا رہوں گا)

المدعا--------- کانہ ھو---

تلقین درس اہلِ نظر یک اشارتست
کردم اشارتے و مکرر نمے کنم

غرضیکہ حضور بادشاہ جاؒن کی سوانح اقدس پر صحیح معنوں میں کچھ تحریر کرنا صرف حضرت حمزہ باباؒ کا کام تھا۔ مگر اس سے یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ کسی دوسرے عقیدتمندوں کو ایسا کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔ معاذ اللہ بات یہ نہیں. کہنے کا مقصد محض یہ ہے۔ کہ بالغ نظر حضرات سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اس ذیل میں ---جب---- حضرت حمزہ باباؒ کا نام نامی اور اسم گرامی آئے گا تو یہ بات اظہر من الشمس ہوگی۔ کہ ان کی محتاط روایت ثقہ بھی ہوگی. اور انفرادی خصوصیات کی حامل بھی ہوگی۔ ورنہ یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ اور سب کو معلوم ہے کہ حضور بادشاہ جاؒن کے بے شمار عقیدتمند اور لا تعداد ارادتمند ہوتے تھے۔ اور اب بھی موجود ہیں. مگر اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا. کہ حضرت حمزہ باباؒ کی بات دوسری ہے۔ **وعلمنٰہ من الدنا علمائہ** ط۔

سواد نقطۂ بینش زخال تست مرا
کہ قدر گوہر یکدانہ گوہری داند

حضرت حمزہ باباؒ نے تذکرۂ ستاریہ مرتب فرما کر برادران طریقت پر بڑا احسان کیا. اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہوں نے تذکرۂ کو پشتو زبان میں تحریر فرمایا. ویسے تو تذکرۂ ستاریہ جولائی 1960ء میں مکمل ہو چکا تھا۔ اور حضرت حمزہ باباؒ اکثر اوقات اپنی محفلوں میں اس کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے۔ بالآخر عقیدتمندوں کے اصرار پر انہوں نے غالباً اوائل 1968ء میں نظر ثانی فرمادی۔ عمومیت کے پیش نظر تذکرۂ ستاریہ کو اردو میں بھی پیش کرنا تھا۔ اور یاد نہیں کہ کس موقع پر اس عاجز کے چھوٹے منہ سے بڑی بات نکل گئی۔ گویا اس بے ہیچ نے پشتو سے اردو زبان میں ترجمہ کرنے کی پیش کش کردی۔ ادھر حمزہ باباؒ کی مبارک عادت ہے کہ کسی کی بات کو رد نہیں فرماتے۔ چنانچہ انہوں نے انکار نہ فرمایا۔ اور اسی طرح تذکرۂ ستاریہ کے اردو ترجمے کا مبارک فریضہ اس بے ہیچ کے سپرد ہوگیا. والی اللہ ترجع الامور.

چوں پیر سالک عشقت بہ مے حوالہ کند
بنوش -و منتظر رحمت خدا مے باش

سو اس عاجز نے کمر ہمت باندھ کر بتاریخ 15 شعبان المکرم 1388ھ میں بروز جمعرات (مطابق 7 نومبر 1968ء) ترجمہ شروع کر دیا. مگر جلد ہی معلوم ہوگیا کہ کس قدر مشکل کام تھا جو شروع کیا گیا تھا۔ اس عاجز کا خیال تھا۔ کہ بڑی سرعت سے چند ہی دنوں میں ترجمہ ختم ہو جائے

گا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ کام نہایت سست رفتاری سے ہو رہا تھا۔ یہ عاجز بیٹھ کر پہروں قلم گھسیتا۔ لیکن جب پلٹ کر دیکھتا تو پورا ایک صفحہ بھی نہ لکھا ہوتا۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ اگر حضرت حمزہ باباؒ کی خصوصی توجہ نہ ہوتی۔ تو اس بار گراں سے عہدہ برآ ہونا اس ناتوان کے بس کا روگ نہ تھا۔ بہر حال بروز جمعہ بتاریخ یکم صفر المظفر 1389ھ مطابق 18 اپریل 1969ء اردو ترجمہ مکمل ہوگیا۔ جس کو یہ عاجز اپنی خوش نصیبی اور سرمایۂ دارین سمجھتا ہے۔ ربنا لک الحمد

از نامۂ سیاہ نہ ترسم کہ روز حشر
با فیض لطف او صد ازیں نامہ طے کنم

تذکرۂ ستاریہ پر کچھ لکھنا اس عاجز کو زیب دیتا ہے اور نہ وہ اس کے اہل ہے۔ البتہ اپنے چند تاثرات پیش کئے بغیر بھی نہیں رہا جاتا۔ کیونکہ یہ ایک ایسا آئینہ ہے۔ جس کو کسی بھی رخ اور کسی بھی زاویہ سے دیکھئے تو حضرت حمزہ باباؒ اور حضور بادشاہ جانؒ میں کوئی غیریت محسوس نہ ہوگی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس چوکھٹ کے اندر حضور بادشاہ جانؒ ہی نظر آئیں گے۔ ایک لحاظ سے یہ حدیث دیگراں ہے۔ اسے از ابتداء تا انتہا پڑھ لیجئے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ حضرت حمزہ باباؒ ہی حضور بادشاہ جانؒ کے روپ میں محو کلام ہیں۔ اور یہاں کوئی غیریت نہیں۔ جسمک جسمی لحمک لحمی۔

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت بگو میگویم

قارئین کرام کو معلوم ہوگا۔ کہ اردو اس عاجز کی مادری زبان نہیں۔ علاوہ ازیں اپنی کم فہمی، ناتوانی اور کوتاہیوں کا بھی احساس ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ترجمہ میں زبان کی شستگی، محاوروں کی چستی، عبارت کی روانی اور لہجے کی نمکینی مفقود ہو۔ بدیں وجہ قارئین کرام کی خدمت میں بصد عجز وادب التجا کی جاتی ہے۔ کہ اگر کہیں غلطی ہوگئی ہو۔ تو براہ کرم درستی فرما لیجئے۔ اور نیز گرامہ کی... فرو گذاشتوں۔ زبان کی لکنت اور محاورات کی غلط بندشوں سے بھی درگذر فرما لیجئے۔ یہ نہ دیکھئے کہ مترجم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ بلکہ یہ ملاحظہ فرمائیے۔ کہ (کون کیا کہہ رہا ہے؟) بنگر کہ کہ مے گوید اور اگر ایسا ہو سکا تو اس عاجز کو اپنے محبوب اور جلیل القدر سلسلے کے طفیل اُمید واثق ہے کہ الحاد و انکار کے اس طوفانی دور میں عام پڑھنے والوں کو عموماً اور طالبان حقیقت کو خصوصاً خاصا روحانی فائدہ ہوگا۔ اسی طرح منجملہ دیگر فوائد کے تذکرۂ ستاریہ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا۔ کہ حضرت حمزہ باباؒ کس پایہ کے بزرگ ہیں۔ اور جب وہ ایسے ہیں تو جس قدسی صفت ہستی سے انہوں نے فیض حاصل کیا ہے وہ کیا ہوگی۔

ثم اورثنا الکتب الذین اصطفینا من عبادنا

قیاس کن ز گلستانِ من بہارمرا

الغرض حضور بادشاہ جانؒ ایک کامل اور اکمل فقیر تھے۔ لگی لپٹی نہ فرماتے تھے۔ مرد آزاد۔ کامل درویش اور دلربا اہل اللہ تھے۔ حب علیؑ اور محبت اہل بیت کرامؓ اس کے نصب العین میں شامل تھے۔ حضرت شاہ ولایت علیؑ اور حضرت سید الشہداء امام حسینؓ سے خاص روحانی نسبت تھی۔ فعلی مولاہ

آں را کہ دوستی علی نیست کافرست
گوزاہد زمانہ و گو شیخ راہ باش

علاوہ ازیں حضور بادشاہ جانؒ اپنے مریدوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور للہ فی اللہ اور بغیر کسی رو رعایت کے ان کو صحیح تربیت دینے اور ان کی انسانیت کو حیوانیت اور ملکیت پر غالب کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اسی طرح الحاد کی بیخ کنی بھی ان کے مشن میں شامل تھی۔ اور بڑے خلوص و جفاکشی سے نام ونمود کو بالائے طاق رکھ کر مصروف عمل رہے اور حق یہ ہے۔ کہ اس جدوجہد میں اپنی ہمت صرف فرمائی۔ (**وسنیقول له من امرنا یسرا**)

غلام ہمت آں نازنینم
کہ کار خیر بے روئی ریا کرد

حق سبحانہ وتعالےٰ کا بے انداز شکر واحسان ہے۔ کہ قحط الرجال کے اس جمودی دور میں حضور بادشاہ جانؒ کے باقیات، صالحات میں سے حضرت حمزہ باباؒ جیسے گوہر یک دانہ موجود ہیں۔ جو بہ ہر لحاظ اپنے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اور جو صحیح معنوں میں فقر کے راز ہائے سربستہ سے واقف ہیں۔ اور بحمد اللہ جنہیں دیکھ کر طالبان صادق کو یک گونہ تسلی ہوتی ہے۔ یہی وہ جوہر یکتا ہے جو حضور بادشاہ جانؒ کی درویشی کے اصل مغز سے واقف ہیں۔

بندۂ پیرِ مغانم کہ درویشان وو
گنج راز بے نیازی خاک بر سر میکنند

آخر میں اسی قدر گزارش ہے کہ جو حضرات کسی واقعہ کے دوران حضور بادشاہ جانؒ کی حیات اقدس میں ان کے ہمراہ رہے ہوں۔ تو تذکرۂ ستاریہ کا ایسا ہر واقعہ ایسے عقیدتمندوں کو ماضی کی کیف آور یادوں میں محو کرادے گا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ایسے ارادتمندوں کو بیمثال روحانی خوشی حاصل ہوگی۔ رہے وہ احباب جنہوں نے حضور بادشاہ جانؒ کو ان کی حیات مبارک میں دیکھ تو لیا تھا مگر قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ یا وہ حضرات جنہیں حضور بادشاہ جانؒ کو ان کے دوران حیات میں دیکھنے کا اتفاق ہی نہ ہوا تو اس قسم کے احباب اور حضرات کو تذکرۂ ستاریہ کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ فخر العلماء الاولیاء حضور وقبلۂ انوار سید عبدالستار شاہ بادشاہ جانؒ کی روحانی طاقت۔ باطنی بصیرت اور آفاقی ہمت کس قدر بلند تھی۔ نیز ان کی ادبی شخصیت، خصوصی طریقۂ تربیت اور

بالاتر علمی و عملی درجہ کتنا عالیشان اور باکمال تھا۔

اوتو العلم درجٰت۔

لبے حکایت حسنت شنیدہ ام جاناں
کنوں کہ دید مت الحق ہزار چندانی

عاجز

طاہر بخاری (مترجم)

جمعرات 13 صفر المظفر 1389ھ

مطابق 1 مئی 1969ء

ھوالکل (786) یامعین

بِسمِ اللّٰہِ

بسم اللہ۔اس ذات پاک کے نام سے۔جورحمٰن ورحیم ہے وہ اسم مبارک جوکل ہے اور کوئی جزونہیں رکھتا۔اس ذات پاک کے نام۔جس کے اول وآخر کوئی شئے ممکن ہی نہیں۔اس مقدس ذات کے نام جس کے وجود کے ظاہر وباطن میں کوئی غیریت نہیں ہے۔اور نہ ہی اس میں اول وآخر قرب و بعد کا امکان ہے۔وہ وجود مطلق جیسے پہلا تھا اب بھی ویسا ہی ہے۔اور اسی طرح رہے گا۔اس وجود کے ساتھ کسی دوسرے وجود کا امکان محال ہے۔

اس احد کے نام۔جس کے وجود اور ذات کا تعین معرفت اور ادراک مرتبۂ احدیت میں اس وقت تک ناممکن تھا۔جب تک کہ اس نے مرتبہ وحدت میں نزول نہ فرمایا اور اپنے لئے ذات اور صفت کے اظہار کی ابتداء نہ فرمائی۔وہ ذات اقدس۔جس نے مرتبہ وحدت میں حامد سے محمد ﷺ بنا کر اساس ہستی کے لئے ازل کا تعین فرمایا۔میں اس مطہر ومنور ذات ﷺ اور۔اس کے آل پر درود و سلام بھیجتا ہوں۔جن کے عشق کی گرمی کی وجہ سے حیات انسانی کی نبضیں متحرک ہیں۔

اس ذات پاک کے نام سے شروع کرتا ہوں۔جس نے مرتبہ وحدت سے مرتبۂ واحدیت میں نزول فرمایا۔اور نبوت کے قالب سے امامت وخلافت تخلیق فرمائیں۔اور اعلیٰ سے علی علیہ السلام ہوگیا۔بعدازاں احدیت نبوت ورسالت کا برزخ اور نبوت ورسالت کا برزخ امامت وخلافت متعین ہوگیا۔اور ان دونوں کا امتزاج ولایت کہلایا ہے۔

اے وہ ذات۔اے اللہ کے مقدس ومطہر نام۔جس کی صفات رحمٰن ورحیم ہیں۔اور تو خود بسم اللہ کے الف کی طرح قرات وکتابت کے میدان سے نکل گیا ہے۔

---خداوندا----- تیرے عاشق تیری ہستی کا ادراک ودریافت ---نقطہ---میں کرتے ہیں. اور اس طلب میں خود بھی ---نقطے کی طرح بے مفہوم ہوکر--آخر میں غائب ہوجاتے ہیں-- بعینہ اسی طرح میں بھی --کچھ نہ سمجھ سکا--اور اگر کچھ سمجھا تو محض اسی قدر سمجھ سکا--کہ--یہ بھی تیری ہی سمجھ اور تیرا ہی علم تھا---اور جب--کچھ بھی فہم میں نہ آیا---تو سمجھ گیا--کہ صرف تیری ذات اقدس ہی علیم وبصیر ہے۔

بارخدایا--میں نے بھی کسی حد تک--تیری ہستی کے سمندر میں فکر کی کشتی دوڑائی--مگر میری خرد کی (روشنی) نے مجھے الحاد کی تاریکیوں تک پہنچادیا---پھر؟ انکار کا مقام آیا--لیکن یہ انکار خرد کی وجہ سے تھا۔نہ کہ عشق کی وجہ سے۔اسی مقام پر خرد کا قول آخر یہ تھا کہ آگے کچھ بھی نہیں۔لیکن

دوسری جانب عشق کا اصرار یہ تھا کہ۔۔۔خبردار۔۔۔یہ صرف تمہاری تگا پوئی وفہم کی آخری حد ہے ۔اور اس گرداب عظیم سے صحیح وسلامت نکلنے کے لئے کسی دانائے راز رہنما کے محتاج ہو۔ہر چند۔۔اگرچہ تم (معلم) ہو گئے ہو۔تاہم جب تک۔۔۔متعلم۔۔نہ بنو گے تب تک مقصد اعلیٰ نہ پا سکو گے۔۔اور میرے خداوند۔۔یہ تیرا ہی فضل وکرم تھا کہ میرا انکار بھی۔۔۔عین اقرار تھا۔۔۔ اس لئے کہ میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ درحقیقت انکار کا یہ مقام لا الہ کی انتہا تھی۔۔ لاریب۔۔یہ نفی کا آخری مقام تھا۔اور اس سے نکل کر آگے الا اللہ۔۔یعنی اثبات کا قدسی مرحلہ آنے والا تھا۔اور شک نہیں کہ جب تک لا الہ کی منزل ختم نہ ہو تو الا اللہ کی منزل کہاں سے اور کیونکر آ سکتی ہے؟ فی الحقیقت۔۔یہی نفی۔۔وہ جہنم ہے جس کے بارے میں تو نے خود ارشاد فرمایا ہے **وان منکم الا واردھا**.(اور یاد رکھو تم میں کوئی نہیں جو اس منزل سے گذرنے والا نہ ہو) خداوند۔۔۔تیری ذات ہی کے نقطے سے ہستی کا دائرہ معرض وجود میں آیا ہے۔۔۔اور پھر۔تیری ہستی کا وہی نقطہ جو تیری بلا کیف ہستی کے نقطے کا ترجمان ہے اسی دائرے میں نابود ہو گیا ہے۔پروردگار تو ہی مجھے علم دے کہ میں کس طرح سے ابتدا کروں۔؟معبود حقیقی۔۔مجھے میری اپنی (ہستی) کے دائرے سے نابود اور گم کردے۔تاکہ میں پیدا ہو جاؤں۔۔

بار خدایا۔۔۔جس قدر بھی میں تیرے حبیب ﷺ کی تعریف کرتا ہوں۔تو سمجھ لیتا ہوں کہ درحقیقت میں تیری تعریف کرتا ہوں۔اس لئے کہ تیری شان احدیت تو تعریف وتوصیف کے مقامات سے مبرا ومنزہ ہے بدیں وجہ کہ جب تیری ذات احدیت۔۔اشارے اور سمت کو قبول نہیں فرماتی۔تو۔۔تعریف کیونکر قبول فرما سکتی ہے؟ حقا؟ ذات کا دوئی سے کوئی نسبت اور کوئی سروکار نہیں اور۔۔لاریب۔۔کہ تیری احدیت مزاج وادراک سے پاک ہے۔لیکن۔بلاشبہ۔تو اپنی تعریف مرتبۂ وحدت میں قبول فرماتا ہے۔اور اس حقیقت کے رو سے ظاہر ہے کہ اس مرتبہ میں تیرے حبیب ﷺ کی تعریف خود تیری تعریف ہوتی ہے۔اور بغیر واسطہ کے جو کوئی بھی تیری تعریف کرتا ہے وہ بھی دراصل تیری ہی تعریف وتوصیف ہوتی ہے تیرے حبیب ﷺ کا ہر کلام تیرا اپنا کلام۔اور تیرے حبیب ﷺ کی ہر خواہش تیرے منشا۔اور تیری رضا کی دلیل ہے۔اسی لئے تو خود تو نے مخاطبہ فرمایا ہے۔**وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی** (اور اے پیغمبر ﷺ جب تم نے (میدان جنگ میں مٹھی بھر خاک) پھینکی تو حقیقت یہ ہے کہ تم نے نہیں پھینکی تھی (بلکہ) خدا نے پھینکی تھی)۔

خداوندا۔۔۔جس طرح محمد ﷺ تیرا سر ہے اسی طرح علی علیہ السلام۔محمد ﷺ کا سر ہے. وہ علی علیہ السلام۔۔جو تیرے حبیب ﷺ کا نفس ہے۔۔

وہ علی علیہ السلام۔۔جو مظہر العجائب ہے۔اور تیرے جلال وجبروت کا آئینہ ہے

وہ علی علیہ السلام ۔۔۔جو محض تکمیل انسانیت اور رفعت اسلام کی خاطر تو نے اپنے حبیب ﷺ کی ذریت الٰہی کی پشت سے پیدا فرمائی۔
وہ علی علیہ السلام ۔۔جو تیرے علوم کا دروازہ ہے۔
وہ علی علیہ السلام ۔۔جن کا دامن اقدس شرک اور گناہ کبیرہ سے آلودہ نہ ہوا تھا۔
وہ علی علیہ السلام ۔۔جن کا نور حضرت آدم علیہ السلام کی پشت مبارک میں تیرے حبیب ﷺ کے مطہر نور کے ہمراہ تھا۔۔اور۔۔
وہ علی علیہ السلام ۔۔جن کی محبت کے گہرے نقوش تو نے بچپن سے میرے قلب و جگر پر ثبت فرمائے تھے۔۔سو میرے پرودگار۔۔اسی پاک اور متبرک برزخ سے میرے دل کے آئینے پر۔۔ ان انوار مقدسہ کا نزول فرمادے۔جو فقر کے رازہائے سربستہ اور نکات معرفت حق پر محمول ہوں۔ ۔۔معاً۔۔میرے خداوند۔۔مجھے توفیق عطا فرما۔۔کہ میں اسی باب علم سیدنا علی علیہ السلام کے ایک نواسے۔حضرت سیدنا و مرشدنا۔۔سیادت و شرافت پناہ حضور سید عبدالستار شاہ بادشاہ جانؒ کی حیات طیبہ کے حالات قلمبند کرلوں۔۔اس عظیم القدر اور عظیم المرتبت انسان کامل کے حالات جن کا لقب۔۔بےنوا۔۔تھا۔۔نیز میرے پرودگار۔۔مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اس بےنواؒ کے طریقہ تربیت و سلوک کو بیان کروں۔
بار الا۔مجھے اپنے حبیب ﷺ کے صحابہ کرامؓ کے جذبہء ایثار سے بھی نوازیئے۔وہ صحابہ کرامؓ جنھوں نے پرخلوص محبت و الفت کے ساتھ۔اپنی جانیں اور اموال۔تیرے حبیب ﷺ پر نچھاور کردیئے۔ان سب پر تیری بے پناہ رحمتیں اور بے شمار برکتیں نازل ہوں۔
خداوند ہم فقیر ہیں اور تو غنی۔تیری غنا تو ہمیں زیب دیتی ہے۔لیکن ہمارا فقر تجھ سے نہیں سجتا۔البتہ اگر ہم تیرے فقیر ہوگئے تو یہ بجا طور پر ہمارے لئے باعث صد افتخار ہوگا۔لیکن اگر (خدانخواستہ) ہم اپنے نفسوں کے اسیر و فقیر ہوگئے تو لعنت کے قابل ہوجائیں گے۔اسلئے میرے پرودگار۔ ہمارے حصے کی یہ لعنت بھی ابلیس لعین کے حوالے کردے تاکہ اس کے توشۂ لعنت میں مزید در مزید اضافہ ہو۔اس لئے بھی کہ ابلیس لعین کے علاوہ اس طوق کو برداشت کرنے اور سہارنے کی طاقت و سکت تیری کسی اور مخلوق میں موجود نہیں اور جس طرح ہم ابلیس لعین کی دلاوری، سے پناہ مانگنے کے طلبگار ہیں۔اسی طرح وہ لعین ہماری عاجزی سے پناہ مانگتا ہے۔
خداوند۔اپنے اولیاء (رحمہم اللہ) کی محبت پر ہمارے وجدان کی پرورش فرمادے۔وہ اولیاء (رحمہم اللہ) جن کے قلوب مشکوٰۃ نبوت کی ضیاء باریوں سے منور ہیں۔اور جن کو تیری محبت نے ہر قسم کے خوف و خطر سے بے نیاز کردیا ہے۔وہ مطہرین۔جنھوں نے اپنی عزیز عمریں اور گراں اوقات تیری یاد۔اور تیرے حبیب ﷺ کی محبت میں گذاری ہیں۔وہ مایۂ ناز اور بزرگ ہستیاں۔جو فقط

تیری یاد کی خاطر مایہ ہر دوسرا کو پس پشت ڈال کر ناسوتی دریا سے شور و غلغلہ کی طرح نکل گئی ہیں۔ وہ یکتا و بے ہمتا موتی جنہوں نے ناسوت کے صدف کو بے مثال عزت و شرافت بخش دی ہے۔
وہ غیور افراد۔ جن کو تیری ذات کے علاوہ کوئی دوسری چیز مطمئن نہ کر سکی۔

خداوندا۔۔۔

ہم کو ان سے ملا دے تا کہ ہم بھی خوف و خطر سے آزادی حاصل کر لیں۔ ہم کو ان کے جلال و جمال سے حصہ عطا فرما دے۔ ہم کو ان کے سکر و صحو سے خوش چینی کا موقعہ عطا فرما دے۔ ہم پر ان کے جذب و سلوک کی راہیں کھول دے۔
ہمارے لئے ان کے ورع و تقویٰ، علم و صبر اور تسلیم و رضا مشعل راہ بنا دے۔
ہم کو ان کی طرح ترک اور ترک ترک سکھا دے۔

پروردگار۔ ایسا ترک نہیں جس کے ترک کرنے میں دوسرے (ماسوی اللہ) کے حصول کی فکر پنہاں ہو۔ اور نہ ایسا حصول جس کا نتیجہ ترک ہو۔ اس لئے کہ جب ہم ترک کا تصور کرتے ہیں تو جان لیتے ہیں۔ کہ ہمیں کچھ حاصل تھا۔ ورنہ عدم کا ترک تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بس۔ بعینہ اسی خیال کا ترک کرنا ہی اصل ترک کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ اور۔ اور یہی ترک ترک ہے۔ تو جس وقت ہم یہ جان لیتے ہیں کہ اس خیال کا ترک کرنا بھی یہی ثابت کرنا ہے کہ ہمیں کچھ حاصل تھا۔ (یعنی خیال) اور اسی خیال کو بھی ترک کرنے پر قادر ہو جائیں۔ تو لا محالہ۔ پھر بھی۔ ہمیں ایک چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہی ترک ہے۔ تو مقصد بھی یہی ہے۔ اور اگر بعد از ترک ہمیں ترک حاصل ہو جائے۔ تو ہمارے خداوند ذوالجلال۔ ہمارا یہ ترک۔ یا۔ ہماری یہ نیستی۔ عین تیرا وجود ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارا علم محو اور ہماری عقل اندھی ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں وقوف کی آنکھیں پگھل جاتی ہیں۔ اور ہر طرف اور ہر سمت لا ادری کی قیامت خیز پکار سے ماحول دہل جاتا ہے۔ البتہ وجدان کی اتھاہ گہرائیوں سے ضرور ایک صدا سی جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہوتی ہے۔ کہ ترک۔ ترکِ ترک۔

خداوندا علم و خرد۔ عقل و بصیرت۔ سبھی کچھ تو خود ہے۔ تو خود ہی کچھ چاہتا ہے۔ اور اپنے ہی نظارے میں اپنے سے غیر ہے۔

زان د زان په ننداره له زانه غیر شی
جام له خپله زانه جوړ کړی جم دزړه

(اپنی جان اپنے ہی نظارے میں خود سے غیر ہو جاتی ہے۔ اور دل کا جمشید خود بخود اپنے آپ سے جام بنا لیتا ہے۔)

باب (۱)

ولادت

ولادت وابتدائی تعلیم :۔

۱۷ ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ میں سید برہان شاہؒ کے ہاں ایک بچہ تولد ہوا۔ جو سید عبدالستار شاہؒ کے نام سے موسوم ہوا۔ بلند پایہ شخصیتوں کی نشست و برخاست بچپن ہی میں روشن مستقبل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ سید برہان شاہ کے فرزند ارجمند کی خوبصورتی کو دیکھ کر لوگ انگشت بدندان تھے۔ میرانوکلی (اگر در ضلع ہزارہ) میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔
سید برہان شاہؒ کو مبارکباد دینے کیلئے دور اور نزدیک سے لوگ آئے۔ انہوں نے بھی اس موقع پر حسب استطاعت خیرات اور دعوت احباب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اور اسی طرح زمانے کا دور چلتا رہا۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ فاضل باپ کو بچے کی اعلیٰ تربیت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ وہ بچہ جس کے لئے مستقبل کی ترقی اس کے شباب کا بڑی شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ پانچ برس کی عمر میں سید عبدالستار شاہؒ کو ان کے فاضل باپ مکتب لے گئے۔ اور اسی طرح انہوں نے ایک مشفق استاد سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ طالب علمی کے دوران میں مشفق استاد اپنے گرانمایہ شاگرد کا خاص طور پر خیال رکھتے۔ وجہ یہ تھی۔ کہ اس کے خیال میں سید عبدالستار شاہؒ مستقبل کے نابغہ تھے۔ آثار بتا رہے تھے۔ کہ منفرد شاگرد کی فطرت کی گہرائیوں میں قدرتی استعداد نمود و شہرت کی انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ سید برہان شاہؒ کو ان کے دوست و احباب یہ مشورہ دینے پر مجبور ہو گئے کہ ایسے بچے عام طور پر شاذ ہی زندہ بچتے ہیں۔ اور جلد یا بدیر سید عبدالستارؒ کو بھی نظر بد لگ جائے گی۔ لیکن وہ اپنے دوستوں کو یہی جواب دیتے کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اس بچے کو پیدا فرمایا ہے اور وہی اس کا نگہبان بھی ہوگا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ جس شخص کو حق سبحانہ وتعالیٰ کسی خاص کام کے لئے پیدا فرماتا ہے تو اسی کام کی خاطر اس کو زندہ بھی رکھتا ہے یہاں تک کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اس خاص کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے کارخانہ قدرت سے اس کی خصوصی پرورش کا بھی انتظام فرمالیتا ہے۔ اور یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے نیک بندے انتہائی بلند خیال اور بلند حوصلہ کے مالک ہوتے ہیں۔ اور پھر شاہ ولایت مشکل کشا علی علیہ السلام کی اولاد تو شجاعت کے پتلے اور دلیری اور جرات میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں۔

بچپن میں مرغابی کا شکار:۔

ایک روز خود حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے مجھے ارشاد فرمایا کہ۔
" کہ طالب علمی کے زمانہ میں جبکہ میری عمر بمشکل آٹھ یا نو برس ہوگی۔ میں اکثر شکار کھیلنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ اور میرا سب سے پہلا شکار ایک مرغابی تھی۔ وہ اس طرح کہ جونہی یہ مرغابی ایک تالاب میں آ کر بیٹھ گئی۔ تو میں نے شست لگا کر فوراً اپنی توڑے دار بندوق داغ دی۔ مرغابی وہیں تالاب میں ڈھیر ہوگئی۔ بندوق دور پھینک کر لگے ہاتھوں میں نے بھی تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ اس وقت میں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ تالاب کا پانی کس قدر گہرا ہوگا؟ تاہم اپنا شکار تالاب سے باہر لے آیا۔ میرے ہم عمر لڑکوں میں سے ایک لڑکے نے جب یہ ماجرا دیکھا تو بھاگ کر میرے والد محترم کو مژدہ سنایا۔ جس کے سنتے ہی والد محترم باہر تشریف لے آئے۔ اور وفورِ محبت سے مجھے گود میں اٹھالیا۔ بعدازاں والد محترم نے میرے اولین شکار کھیلنے کی خوشی میں خیرات دی۔ اور اس تقریب میں گاؤں کے لوگوں کو مدعو کیا"۔

حضور بادشاہ جانؒ میں بدرجہ اتم پختون ولی موجود تھی:۔

پختون خوا کے سادات کرام بھی رسم و رواج کے سلسلے میں عام پختونوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ویسے تو نسلاً یہاں کے سادات بلا شبہ اہل سادات ہوتے ہیں۔ لیکن عادات و روایات اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے بہرانداز عام پختونوں کی طرح ہوتے ہیں اور ہمارے حضور بادشاہ جانؒ کی تو بات ہی دوسری تھی۔ وہ بدرجہ اتم پختون تھے۔ یہاں تک کہ پختون قوال سے پشتو کی غزل سماعت فرمانے کو اوروں پر ترجیح دیتے تھے۔ اور یہ بات ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ کہ ایک پختون کسی غیر زبان سے اپنے ذہن کو مانوس کردے۔ اگرچہ حضور بادشاہ جانؒ بیک وقت کئی زبانوں سے خوب واقف تھے۔ لیکن ان سب میں سے اپنی زبان پختو کو برتر خیال فرماتے تھے۔ اور بے شک اگر میرے شیخ حضور بادشاہ جانؒ کو اپنی زبان۔ پختو۔ سے اس قدر والہانہ محبت نہ ہوتی۔ تو آج میں اس تذکرہ کو پختو میں نہیں بلکہ اردو یا کسی اور زبان میں تحریر کرتا۔ حالانکہ میری شاعری کی ابتداء اردو زبان سے ہوئی تھی۔ مگر ایک روز حضور بادشاہ جانؒ نے مجھے مخاطب کر کے ارشاد فرمایا۔

"ہوسکتا ہے کہ اردو میں تم بہترین اشعار کہہ ڈالو گے لیکن یاد رکھو اہل زبان شعراء کے مقابلے میں تمہاری اردو شاعری ہرگز پروان نہ چڑھ سکے گی۔ ظاہر ہے کہ جب تم پرائی زبان میں لکھا کرو گے تو لامحالہ یہ اپنی زبان سے ظلم کے مترادف ہوگا۔ دوسری جانب جب تم اپنی تمام تر استعداد کسی غیر

زبان کی پرورش اور سنوارنے کے لئے صرف کروگے۔ تو قطع نظر اس بات کے کہ ایسا کرنے سے تم نہ صرف قانون فطرت کے مجرم ہو جاؤ گے۔ بلکہ اپنی قوم کے بھی مجرم ٹھہرا لئے جاؤ گے۔ بنا بریں میں تم کو یہی مشورہ دوں گا۔ کہ اپنی زبان میں لکھو'۔

دوزخ کی زبان:۔

فی الحقیقت یہ باتیں بڑی مؤثر اور وزن دار تھیں۔ کیونکہ اس سے قبل تو میں یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ گویا میں اپنی زبان میں بھی کچھ لکھ سکوں گا۔ اگرچہ اس کی بھی ایک معقول وجہ موجود تھی۔ وہ یہ کہ ہمارا نصاب تعلیم بحیثیت کلی اردو زبان میں تھا۔ ان دنوں کے تعلیمی نصاب میں پشتو زبان کا کچھ حصہ بھی نہ تھا۔ (جیسا آج تک لازمی شکل میں نہیں ہے) ہمارے ذہنوں پر اردو کا بھرپور تسلط تھا۔ اور اس کے مقابلے میں ہم اپنی زبان پختو کو عام طور پر ادبی سرمائے سے خالی سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں اپنی مادری زبان سے غیر شعوری طور پر بے گانہ رکھنے کے لئے غیر ملکی انگریزوں نے پختو کے خلاف جس قسم کا زہریلا پروپیگنڈہ کیا تھا وہ اس پر مستزاد تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ عوام میں یہ بات مشہور کرا دی گئی کہ پختو اہل دوزخ کی زبان ہے۔ اور میرا یہ شعر اسی بات کے جواب میں تھا۔

وائی اغیار چہ د دوزخ ژبہ دہ
زہ بہ جنت تہ د پختو سرہ زم

(اغیار کہتے ہیں۔ کہ پختو اہل جہنم کی زبان ہے۔ مگر میری زبان یہی پختو ہوگی۔ اور جنت جاؤں گا)

سالک باخبر کا خیال:۔

بہر حال مرشد کا حکم بجالانا میرے اولین فرائض میں سے تھا۔ اور یہ 1933ء کا واقعہ ہے۔ کہ میں نے پختو میں غزل لکھنا شروع کیا۔ یہ وہ دور تھا۔ جبکہ میں انتہائی 'خوف' کی منزل میں سے گذر رہا تھا۔ بہر حال مرشد دل آگاہ حضور بادشاہ جان رضی اللہ تعالیٰ عنہ
کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ وہ ایسے کہ عوام نے میری پختو شاعری کو بیحد پسند کیا۔ اس سے میرا حوصلہ او بڑھ گیا۔ ان حالات کے پیش نظر میں نے بھی دوچند کوشش شروع کر دی۔

مروجہ کتب سے فراغت اور تربوروں کی ستم شعاریاں:۔

بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ عرض یہ کرنا تھا کہ حضور بادشاہ جان تعلیم حاصل کرنے کے لئے گاؤں میں استاد کے سپرد کر دیئے گئے۔ ناظرہ قرآن مجید ختم کرنے کے بعد ترجمہ

سے پڑھنا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ فقہ اور فارسی کی مروجہ کتابوں کو بھی پڑھ لیا۔ اور یہ حضور بادشاہ جانؒ کی حیات مقدس کا وہ دور تھا۔ جبکہ ان کے عالم شباب کی آمد آمد تھی۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی اور ایک چھوٹی ہمشیرہ بھی تھی۔ خویش و اقارب (تربور) ان کو کمزور تصور کرتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے حضور بادشاہ جانؒ کے گھرانے پر تشدد کرنا شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ بہت کم لوگوں کو کسی کے اچھے دن بھاتے ہیں۔ اور ہمارے پختون خواہ میں تو یہ دستور ہے۔ کہ کام کے آدمی کو شاز ہی زندہ رہنے دیا جاتا ہے۔ بہر کیف خویشوں (تربوروں) کی طرف سے حضور بادشاہ جانؒ کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر وقت اسلحہ سے لیس ہوا کرتے تھے۔ بایں ہمہ ان کے والد محترم ہمیشہ ان کو تجاوز نہ کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ دراصل ان کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ حضور بادشاہ جانؒ کے ہاتھوں خویشوں پر زیادتی ہو جائے۔ اور اس قسم کی صورت حال نے حضور بادشاہ جاںؒ کا جینا دوبھر کر دیا۔

عزم ہندوستان:۔

انہی ایام میں ہمارے علاقے کے طول و عرض میں یہ دستور تھا کہ جونہی کوئی لڑکا جوان ہوتا تو اس کے دل میں یہ امنگ پیدا ہوتی کہ قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان کا رخ کرے۔ قبل ازیں خود حضور بادشاہ جانؒ کے دو یا تین ماموں زاد بھائی بھی ہندوستان میں مقیم تھے۔ لہذا اٹھارہ برس کی عمر میں حضور بادشاہ جانؒ نے عازم ہندوستان ہونے کا مصمم ارادہ فرمالیا۔ اور ایک روز صبح پو پھٹتے ہی گھر سے نکل کر سب سے پہلے پشاور کی راہ لی۔

عزیز مصر برعم برادران غیور
زقعرِ چاہ برآمد بہ اوجِ ماہ رسید

طریقت

طریقت کی تعریف:۔

منزل چاہے دنیا کی ہو چاہے دین کی بہر حال اس سلسلے میں گھر گھرانے کو ترک کرنا لازمی ہوتا ہے۔ دنیا کا مسافر اپنے وطن میں مٹی گھارے کے گھر گھروندے کو چھوڑ کر ترقی حاصل کرنے کے لئے کسی دوسرے وطن کی مٹی کو اپنا لیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس حقیقت کے مسافر کی منتہائے نظریہ ہوتی ہے۔ کہ روحانی دنیا کے بام عروج تک پہنچنے کے لئے اپنے جسد ناسوتی کو کلیتاً ترک کردے۔ عام مشاہدہ ہے کہ اس دنیا میں جتنی بھی بلند پایہ شخصیتیں گذری ہیں۔ ان سب نے ہر دو قسم کے گھروندوں کی خیر باد کہہ دیا ہے۔ اور اکثر و بیشتر سفر میں رہے ہیں اس مقام پر یہ بھی مخفی نہ رہے کہ اپنے گھر سے نکل کر کسی مطلوب کی جانب منزل طے کرنے کو طریقت کہتے ہیں۔ اسی ضمن میں حضور بادشاہ جانؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

مغز مسئلہ:۔

''شریعت ایک باغ ہے۔ اس باغ میں اقسام وانواع کے میوے بھی ہیں اور مختلف قسم کے درخت اور پودے بھی۔ یہاں خوشنوا پرندے اور نظر نواز نہریں بھی ہیں۔ سو لازمی ہے کہ سب سے پہلے ان اشیاء کی معرفت حاصل ہو جائے۔ تو جس وقت کوئی شخص اس باغ کو دیکھ لے اور پھر اسی باغ سے ذرا مانوس ہو جائے۔ تو اسی شخص کے دل میں اس خیال کا جاگزین ہونا ایک قدرتی امر ہے کہ اس باغ کا مالک بے انداز حسین ہوگا۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ اس کی معرفت بھی حاصل ہو جائے۔ یہاں تک کہ یہ خیال اس کے دل میں پختہ ارادے کے ساتھ پتھر کی لکیر بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اسی سلسلے میں اسی شخص کو ایک ایسے رہبر کی ضرورت پیش آجاتی ہے کہ طالب کو باغ کے مالک کا اتہ پتہ بتادے۔ اسی رہبر کو مرشد یا پیر کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد طالب اپنے رہبر کی ہدایات کے بموجب مالک کی جستجو میں باغ سے نکل جاتا ہے۔ اور مرشد کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ مرشد نے بھی طالب کو اس راستے کے اتار چڑھاؤ سے بخوبی آگاہ کیا ہوتا ہے۔ اور اس راستے کو طریقت کہتے ہیں۔ اس راستے میں بھوک، پیاس، چور و رہزن اور سانپوں اور بچھوؤں سے لے کر فرحت ناک مقامات اور دل لبھادینے والے نظارے وغیرہ بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ لیکن صاحب ہمت طالب اور قابل ترین سالک حوادثات اور واردات کی پرواہ کئے بغیر مرشد کی ہدایت کے مطابق راستہ طے کرتا ہے۔ اگر کسی موقع پر ٹھوکر کھا کر گر جائے تو دوبارہ

سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔اور دوبارہ اپنی راہ لیتا ہے۔دل پسند تماشوں اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والے نظاروں کا طالب صادق کے قلب پر پرکاہ کے برابر اثر نہیں ہوتا۔وجہ یہ ہوتی ہے۔کہ طالب کو اس کے مرشد نے پہلے ہی سے بتا دیا ہوتا ہے۔کہ خبردار! اگر ان نظاروں میں محو ہو گئے۔تو منزل سے رہ جاؤ گے۔کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوا ہے۔کہ سالک راہ ان دلفریب مناظر میں کھو کر محو ہو گیا ہے اور عمرِ عزیز لا حاصل گنوا کر منزلِ مقصود سے رہ گیا ہے۔بالآخر طالب صادق صبر آزما مصیبتوں اور قہر آفرین آفتوں کو مردانہ وار برداشت کر لینے کے بعد باغ کے مالک کے شہر تک پہنچ جاتا ہے۔اس مقام کو تصوف کی اصطلاح میں حقیقت کہتے ہیں۔اب طالب کسی قدر مطمئن ہو جاتا ہے۔کیونکہ ظاہر ہے۔اب وہ باغ کے مالک کے شہر میں ہوتا ہے۔لیکن جب تک وہ باغ کے مالک کو اچھی طرح سے دیکھ نہ لے اور شوق دید کی تشنگی کو پوری طرح بجھا نہ دے تو اس کی مکمل تسکین نہیں ہوتی۔آخر کار اس مرحلے کو بھی طے کرنے کے لئے طالب صادق وسیلے سے کام لیکر باغ کے مالک حقیقی کے روبرو ہو جاتا ہے۔اور یہی مقام معرفت کہلاتا ہے۔اسی مقام پر تیقن کی تکمیل ہو جاتی ہے۔کہ گویا باغ کا مالک بعینہ یہی ہے۔تب یہی سالک باغ کے مالک کے حضور میں خدمت بجالانے کے لئے کمر بستہ ہو جاتا ہے۔کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد طالب صادق کے ساتھ مالک کی بھی الفت ہو جاتی ہے۔اور اس کو اپنے قرب میں بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرما دیتا ہے۔جس کو اصطلاح میں مقام قرب یا باقی باللہ سے موسوم کیا جاتا ہے.اس کے بعد باغ کا مالک اپنے طالب کو کسی خاص علاقے کی حکومت بخش کر واپس بھیج دیتا ہے۔اس مقام کو ولایت کہتے ہیں۔اور ایسے شخص کو اصطلاحاً مجذوب سالک کہا جاتا ہے۔اس قسم کا سالک ارشاد کے لئے بیحد موزون ہوتا ہے۔اور اسی نوعیت کے افراد حقیقت میں انبیاء اللہ علیہ السلام کے وارث ہوتے ہیں۔اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے پاک سینوں میں وہ تمام رازہائے سربستہ پنہان ہوتے ہیں۔جو معرفت کے لئے لابدی ہوتے ہیں۔"

مجذوب سالک:۔

فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے "چونکہ مجذوب سالک اس راستے کے اتار چڑھاؤ سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔اسی بناء پر وہ رہرووں کو اس راستے کی مشکلات ومصائب اور دشت وصحرا کے متعلق سب کچھ بطریقہ احسن بتا سکتا ہے۔اور ان کو صراط مستقیم پر بھی گامزن کرا سکتا ہے۔"

مقبول:۔

بعض لوگوں کے قول کے مطابق اس قسم کے سالک کو مقبول بھی کہا جاتا ہے۔ اور اس زمرے میں حضرت خواجہ خواجگان معین الدین حسن سنجری ؒ خواجہ قطب الدین بختیار اوشی۔ خواجہ فرید الدین گنج شکر۔ نظام المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء. غوث الثقلین حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی۔ حضرت شیخ الشیوخ خواجہ شہاب الدین سہروردی. حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ وغیرہ کے نامہائے نامی واسمائے گرامی شامل ہیں۔ اسی طرح میرے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ بھی مجذوب سالک تھے۔ اور سلوک وفتوحات میں محبوب الٰہی ثانی تھے۔ اللّٰھم نور قبرہ.

سالک مجذوب:۔

سالکین کی دوسری قسم کو سالک مجذوب کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ ابتدائی طور پر تو باقاعدہ پابند شریعت ہوتے ہیں۔ لیکن جس وقت ان پر جذبہ حق غالب آجاتا ہے۔ تو ان کے فہم میں فرق آجاتا ہے۔ اور مجذوب ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے تکلیفات شرعی میں کوتاہی ہو جایا کرتی ہے۔ مگر جونہی ان کی منزل ختم ہو جاتی ہے۔ تو پھر ان کا جذب حق یعنی سکر اور صحو اس انداز سے گھل مل جاتے ہیں۔ کہ کسی کو یہ تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ کہ آیا یہ کامل مجذوب ہے۔ یا کامل سالک ہے؟ ایسے افراد کی حرکات وسکنات عوام الناس کی نگاہوں میں باقاعدہ نہیں ہوتی ہیں۔ تاہم اوسط درجے کے جاننے والے سمجھتے ہیں۔ کہ ان لوگوں کی اس قسم کی حرکات وسکنات بے قاعدہ نہیں۔ البتہ اعلیٰ سوجھ بوجھ رکھنے والے حضرات ایسے مجاذیب کو بیک نظر پہچان لیتے ہیں۔

ایک ضروری وضاحت:۔

مندرجہ بالا سطور میں دو باتیں ایسی عرض کی گئی ہیں۔ جن کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پہلی بات یہ کہ ''سکر وصحو ہر دو آپس میں ایسے گھلے ملے ہوتے ہیں. جن کو تمیز کرنا دشوار ہوتا ہے''۔ اور دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ ''ایسے لوگوں کی حرکات وسکنات عام لوگوں کی نظروں میں باقاعدہ نہیں ہوتی ہیں۔'' ان دونوں باتوں میں تضاد کا کوئی شائبہ موجود نہیں ہے۔ مطلب صرف اسی قدر ہے۔ کہ اگر ایک طرف عوام کو ایسے مجذوب کی حرکات میں عام لوگوں کی نسبت کچھ فرق یا تبدیلی نظر آتی ہو تو بلاشبہ دوسری طرف عوام کو یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص نرا مجنون یا قطعی طور پر حواس باختہ نہیں ہے۔ دراصل یہ ایک نازک نفسیاتی حقیقت ہے اور اس معاملے میں ذرا فکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے فقراء میں بھی

کاملین ہوتے ہیں. اور ایسے سالکوں میں بھی انتہائی بلند مقام افراد پیدا ہوتے ہیں. مثال کے طور پر حضرت مولانا شمس الدین تبریزی قدس سرہٗ کو لے لیجئے۔ جنہوں نے حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ جیسے سالک مجذوب کو روشناس کرایا. یا حضرت خواجہ علاؤ الدین صابر کلیری قدس سرہٗ جن کا سلسلہ تا زمانہ حال آفتاب و مہتاب کی طرح روشن ہے۔ اور متاخرین میں ہمارے حضور بادشاہ جانؒ کے مرشد حضرت خواجہ شیخ محمد عظیم چشتیؒ جنکا مزار اقدس نڑان نامی گاؤں میں ہے۔ اور یہ گاؤں آزاد کشمیر کی تحصیل مظفر آباد میں واقع ہے۔ آپؒ عام طور پر سائیں صاحب کے نام سے مشہور ہیں. اور یہی وہ شیخ محمد عظیمؒ ہیں. جنہوں نے حضرت خواجہ سید عبد الستار شاہ بادشاہ جانؒ فخر العلماء الاولیاءؒ جیسے عظیم القدر مجذوب سالک کو پیدا کیا۔ حضرت خواجہ سائیں محمد عظیم رضی اللہ تعالی عنہ جس طرح ظاہری جسامت کے لحاظ سے مضبوط اور پہلوان تھے۔ اسی طرح اولیاء اللہ رحہم اللہ کی صف میں شہ زور اور شاہِ صوفیہ نامزد ہوئے۔

حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کا ایک واقعہ:۔

میرے مرشد پاکؒ نے حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کی زبانی ایک واقعہ یوں ارشاد فرمایا ہے کہ:۔ ''ایک زمانہ تھا۔ کہ مجھے ایک پل پر گزرنے والوں سے پیسہ وصول کرنے کے فرائض سونپے گئے تھے۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ کوئی ضعیف و نحیف آدمی چلا آرہا ہے۔ اس شخص کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ سر پر رعشہ طاری تھا. اور اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ میں عصا تھا. میں نے آگے بڑھ کر اس سے پیسہ مانگ لیا۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا. چنانچہ میں نے دوبارہ پیسہ کا مطالبہ کر دیا مگر وہ ملتفت نہ ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ میں نے بوڑھے کو بازو سے پکڑ لیا مگر وہ کچھ کہے بغیر آگے جا رہا تھا. وہ بالکل نہیں رکا۔ میں نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ باوجود ڈگمگاتے ہوئے قدموں اور ضعف و رعشہ سے ہلتے ہوئے سر کے مجھے اپنے پیچھے اسی طرح گھسیٹ کر لے گیا. جیسے کسی معمولی خس و خاشاک کو تند و تیز ہوا اڑا کر لے جائے۔ یا للعجب۔۔ اور میں ہکا بکا رہ کر دم بخود کھڑا ہو گیا۔ اب مجھے اپنے دل سے کہنا پڑا. کہ ''محمد عظیمؒ! تم تو اپنی پہلوانی کے گھمنڈ میں تھے لیکن دیکھ لیا اس تماشے کو۔۔؟ کیونکہ ایک اور طاقت بھی ایسی موجود ہے جس کے سامنے تیری شہہ زوری ہیچ کے برابر ہے۔''

بس! اس واقعہ سے دنیا اور دنیا کے باقی دھندوں سے میرا جی بھر گیا. اور مرشد کامل کی تلاش شروع کر دی۔ بالآخر ایک پیر صاحب سے طریقۂ نقشبندیہ میں بیعت کر لی. اور شب و روز مجاہدہ، و ریاضت میں مشغول ہو گیا حتی کہ چند برسوں کے بعد میرے لئے ساری دنیا کے حالات سے پردہ اٹھ گیا۔ اب ساری دنیا بلا حجاب میرے سامنے تھی اور میرے مکاشفے کا یہ عالم تھا کہ جس چیز کے

لئے جس طرف بھی توجہ کرتا وہی چیز من وعن سامنے ہو کر آ جاتی تھی۔ اس کیف وسرور سے مست ہو کر ایک بار میں کسی جنگل سے گذر رہا تھا۔ کہ اسی اثناء میں کسی کہنے والے کی صدا سنائی دی۔ محمد عظیمؒ! جس چیز پر تم اترا رہے ہو حقیقی فقر سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔" اس آواز کے سنتے ہی میری ساری مستی کافور ہوگئی۔ میں لڑکھڑانے لگا۔ مضطرب ہو کر میرے امنگوں بھرے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے اور پریشان ہو کر اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ میں سوچنے لگا۔ کہ اگر فقر یہ نہیں ہے تو آخر وہ کونسی چیز ہے؟ اندریں اثناء وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ کہ۔۔۔ "مولوی کے حوالے"۔

فقر و درویشی کی نشاط ثانیہ:۔

اس حال میں جبکہ حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کی ساری مستی سرد پڑ چکی تھی۔ اور دوسری طرف کافی عرصہ سے اپنے بال بچوں سے بھی جدا رہے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر ان کو اس کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نظر نہ آیا۔ کہ اپنے گھر تشریف لے جائیں۔ اور یہی ہوا۔ وہ اپنے گھر تشریف لے گئے اور جلد ہی اپنے علاقے کے ایک خان کے اہلکاروں میں شامل ہو گئے۔ تاہم اس صدائے غیبی کی تصدیق اور تلاش بھی جاری رکھی۔ ایک موقعہ پر خان نے منجملہ دیگر اہلکاروں کے حضرت سائیں صاحبؒ کو بھی دہقانوں سے مالیہ وصول کرنے کے لئے مضافات کی طرف روانہ کر دیا۔ اسی سلسلے میں وہ "سوم" نامی گاؤں جوڑا دڑ (ضلع ہزارہ) سے ایک میل جنوب کی طرف ہے تشریف لے گئے۔ مالیہ وصول کرنے کے بعد کسی شخص نے کہہ دیا۔ کہ یہاں پر ایک پر تاثیر مزار بھی موجود ہے۔ تب حضرت سائیں صاحبؒ نے استفسار فرمایا۔ کہ یہ مزار کس کا ہے؟ اور لوگوں نے حضرت خواجہ مولوی عبیداللہ کا نام لے لیا "مولوی" کا لفظ سنتے ہی حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کو غیبی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ اور بلا پس و پیش فوراً مزار اقدس کی طرف روانہ ہو گئے۔ دو تین ساتھی بھی ان کے ہمراہ تھے مزار کے اندر داخل ہوئے۔ تو سب سے پہلے فاتحہ پڑھا۔ مگر فاتحہ کے دوران ہی حضور سائیں صاحبؒ پر مکمل محویت طاری ہوگئی اور جب کافی وقت گذرنے کے بعد ہمراہیوں نے چونکا کر یاد دلایا کہ "صاحب! ابھی کافی تعداد میں مالیہ وصول کرنا باقی ہے۔ لہذا اب یہاں سے چل دینا چاہئے۔" مگر حضور سائیں صاحبؒ بدستور محو رہے۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ ہمراہیوں نے دوبارہ اپنی بات دوہرائی۔ اب کی مرتبہ حضور سائیںؒ نے صرف اسی قدر ارشاد فرمایا۔ کہ "تم لوگ جا سکتے ہو۔ کیونکہ اب میں یہاں محبوس ہو گیا ہوں" ساتھیوں کو حیرت تو ضرور ہوئی مگر چلے گئے۔ اور حضور سائیں صاحبؒ وہاں رہ گئے۔ انہوں نے حضرت خواجہ مولوی عبیداللہ کے مزار پر انوار میں پورے چالیس دن گزار دیئے۔ اس عرصہ میں حضرت خواجہ مولوی عبید اللہ نے ان پر چشتی، نظامی، نیازی رنگ چڑھا دیا۔ ساتھ ہی موضع نڑاں (آزاد کشمیر) جانے کی بھی

ہدایت فرما دی گئی۔ میرے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ حضور سائیں صاحبؒ نے فرمایا کہ۔

''اس حکم کے ملتے ہی میں موضع نڑاں آ گیا۔اوراسی مقام میں بود و باش شروع کی۔ یہاں نہ تو میں کسی کو جانتا تھا اور نہ ہی مجھے کوئی جانتا تھا۔ کسی سے کوئی شناسائی نہ تھی۔ بعد میں اسی گاؤں کے ایک سفید پوش راجہ فیروز خانؒ کی مجھ سے عقیدت ہوگئی۔ اور وہی مجھے کھانا کھلاتا۔وہ اکثر مجھ سے میرا اہل وعیال کی بابت بھی دریافت کرتا مگر میں عمداً کچھ نہ بتاتا۔لیکن اس کے بیحد اصرار پر آخر کار میں نے اپنے اہل وعیال کی جائے سکونت کے بارے میں بتادیا۔ چنانچہ بعدازیں اس نے میرے بال بچوں کو یہاں لانے کا بندوبست کرلیا۔اوران کے لئے ایک علیحدہ گھر بھی تعمیر کیا۔''

فقرو ریاضت کی انتہا:۔

حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

''حضور سائیں صاحبؒ ایام سرما میں گاؤں سے پرے ایک چشمہ کے اندر تشریف رکھتے۔اور گرمیوں میں کبھی کبھار اپنے اردگرد لکڑیاں جلاتے۔ان کی زبردست ریاضت کے نتیجہ میں ان کے بدن کا چمڑا گوشت سے اور گوشت ہڈیوں سے جدا ہو گیا تھا۔اور حق یہ ہے کہ اس زمانہ میں فقر و ریاضت حضرت خواجہ سائیں محمد عظیمؒ پر ختم تھی۔''

بیادگار حضرت مولوی عبید اللہؒ:۔

برسبیل تذکرہ یہاں حضرت مولوی عبید اللہؒ کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ تحریر کرنا قارئین کرام کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔حضرت مولوی صاحبؒ علوم متداولہ اور جوز لایجوز کے عالم متبحر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ''مولوی صاحب'' کے نام سے مشہور ہیں۔آپ علوم ظاہری سے فراغت پاکر اپنے وطن تشریف لا رہے تھے۔کتابوں کی ضخیم جلدیں ایک اونٹ پر بار کی تھیں اور راستہ طے فرمارہے تھے۔حویلیاں پہنچے تو ایک طرف دیکھا کہ چند شوریدہ سر فقیر جنگل میں بیٹھے ہیں۔(اسی مقام پر ان دنوں گھنے جنگلات تھے) بھلا ایک مولوی کا فقیروں سے کیا غرض؟ چنانچہ حضرت مولوی عبید اللہؒ نے کوئی التفات نہ کیا۔مگر ان میں سے ایک فقیر نے آواز دی۔کہ'' ارے مولوی صاحب! ذرا درشن دے کر جانا۔! بارے حضرت مولوی عبید اللہؒ رک گئے۔اور اونٹ کو بٹھا کر ان کی محفل میں جا شامل ہوئے۔ باتوں باتوں میں حضرت مولوی عبید اللہؒ نے حصول علم کی داستان سنادی۔اور اونٹ پر لدی ہوئی کتابوں کا بھی تذکرہ کر دیا۔کچھ دیر کے بعد ایک فقیر نے حضرت مولوی عبید اللہؒ سے دریافت کیا۔کہ ''مولوی صاحب! آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں

؟ حضرت مولوی عبید اللہؒ نے بتایا کہ ''میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ اور اب وہاں سے علوم کی نشرو اشاعت کا ارادہ رکھتا ہوں'' یہ سن کر فقیر نے کہہ دیا کہ ارادہ نیک ہے۔ اور آدمی تم خوب ہو۔ اس لئے ہمارا ایک فقیر بھی تمہارا شریک سفر ہوگا. کیونکہ راستہ طویل ہے اور تم اکیلے. اسلئے بہتر ہوگا کہ ہمراہی تمہارے ساتھ ہو۔ البتہ تمہیں گاؤں تک پہنچانے کے بعد ہمارا فقیر واپس آ جائے گا.''

دو گام چلیں منزل کی طرف:۔

چنانچہ ان میں سے ایک فقیر حضرت مولوی عبید اللہؒ کے ہمراہ ہوگیا. چند قدم چل کر فقیر نے حضرت مولوی صاحبؒ! سے پوچھا کہ مولوی صاحب تمہارا گاؤں کس جانب ہے؟ اور مولوی صاحبؒ نے بتادیا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے چند موڑ قطع کرنے کے بعد یکا یک فقیر نے انگلی اٹھائی اور کہنے لگا. کہ ''مولوی صاحب! وہ رہا تمہارا گاؤں'' مولوی صاحبؒ نے دیکھا تو واقعی ان کا گاؤں سامنے تھا.

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم:۔

یہ تماشا دیکھ کر مولوی عبید اللہ کو بڑی حیرت ہوئی اور واقعی تعجب کی بات تھی بھی اس لئے کہ کئی میلوں کا دشوار گزار پہاڑی راستہ چند لمحوں کے اندر اندر کیسے طے ہوگیا؟ ذرا سنبھلے اور نگاہ اٹھائی تو فقیر غائب تھا اب تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بہرحال گھر تشریف لے گئے۔ مگر حالت وہ نہ تھی۔ جو اکتسابی علوم حاصل کرنے کے بعد اور فقیروں کے گروہ سے ملاقی ہونے سے قبل تھی۔ علوم ظاہری پر تو ان کو مکمل عبور حاصل تھا. مگر جو نادر الوجود واقعہ راستے میں پیش آیا۔ کتابوں کے اوراق اس اسرار سے خالی تھے اور اسی واقعہ نے حضرت مولوی عبید اللہؒ کو سوچنے پر مجبور کردیا. کہ یقیناً ایک ایسا علم بھی ضرور موجود ہے۔ جو ان شوریدہ سر فقیروں کو حاصل تھا۔ وہی اصل علم ہے اور وہی علم لدنی ہے۔ بہرحال یہی واقعہ حضرت مولوی عبید اللہؒ کی زندگی میں انقلاب لے آیا. ان کے سوچنے کا انداز بدل گیا. اور ہر وقت فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کے قلب کی گہرائیوں سے ایک اور صدا آنے لگی. وہ اکثر بے چین رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک روز علوم متداولہ کی بھاری جلدوں اور اپنے گھربار کو چھوڑ کر وطن کو خدا حافظ کہہ دیا۔

بحضور حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ:۔

سینۂ اقدس میں تلاش حق کا بھرپور جذبہ لئے ہوئے حضرت مولوی عبید اللہ قریہ قریہ اور شہر شہر میں گھومے پھرے۔ بالآخر قسمت نے یاوری کی اور حضرت خواجہ شاہ نیاز احمد بے نیازؒ کی

خدمت اقدس میں بریلی شریف پہنچ گئے۔ حضرت شاہ نیاز بے نیازؒ کے سامنے ہوئے تو وہ مہربانی سے پیش آئے۔ نگاہ کرم سے نواز گئے۔ بعد ازاں ایک غار کو وہ میں بٹھا دیئے گئے۔

ہدف شان بے نیازی:۔

غار کے اندر مجاہدہ بڑا سخت تھا. چند ہی دنوں میں حضرت مولوی عبید اللہؒ ضعف ونقہت سے سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ اور اسی طرح کئی سالوں تک اسی غار کے اندر نیم مردہ حالات میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا. کہ گویا غار کے اندر بھی کوئی زندہ جان موجود ہو سکتی ہے۔ کسی کو یاد ہی نہ رہے۔ مگر اسی دوران میں حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ کے حرم پاک میں عصمت مآب بیبیوں کو کسی ذریعے سے آگاہی ہوئی. تمام بیبیوں کو اور خصوصی طور پر حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ کی اہلیہ محترمہ ومعظمہ کو حضرت مولوی عبید اللہؒ کی حالت زار پر بڑا ترس آیا۔ اور طے پایا کہ حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ کی خدمت اقدس میں گزارش کی جائے۔

کیونکر گزارش کی جائے:۔

مگر سب سے مشکل سوال یہ درپیش تھا کہ حضرت شاہ نیاز بے نیازؒ کی خدمت اقدس میں کیسے اور کیونکہ گزارش کرنے کی جرات کی جائے. اور کس طرح سے ان کو حضرت مولوی عبید اللہ یاد دلائے جائیں؟ حسن اتفاق سے ان دنوں حضرت شاہ نیاز بے نیازؒ کو اپنے ایک فرزند سے بڑا انس تھا۔ جو ابھی بچہ تھا۔ اسی صاحب زادے سے حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر طعام تناول فرماتے اور بفرض محال اگر نیک اختر بچہ دستر خوان پر موجود نہ ہوتا۔ تو حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ قطعاً طعام نہ تناول فرماتے۔ چنانچہ طے پایا کہ اگر حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ طعام کے لئے تشریف لائیں۔ تو خلاف معمول بچے کو ان کے قریب نہ آنے دیا جائے گا. اس موقع پر حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیاز یقیناً استفسار فرمائیں گے اور جب وہ دریافت فرمائیں گے تو اس وقت کچھ نہ کچھ عرض کر دیا جائے گا۔ کھانے کا وقت آیا تو بچے کو دستر خوان کے قریب نہ آنے دیا گیا. لہذا حضرت شاہ نیاز بے نیازؒ ارشاد فرمایا۔ کہ بچے کو حاضر کیا جائے۔ پہلے تو حضرت سیدہ ومعظمہ خاموش رہیں۔ مگر بالآخر عرض کر دیا کہ "حضور! اسی طرح اور لوگوں کو بھی اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔ عرصہ ہوا کہ ایک مولوی کو آپ نے ایک غار میں بٹھا دیا ہے۔ مگر آج کل اس کی حالت بڑی نازک ہے۔ اس کی حالت پر رحم فرمایا جائے۔ کیونکہ آخر وہ بھی کسی کا بیٹا اور کسی کا عزیز ہوگا" یہ ساعت فرمانا تھا کہ حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ کی شان نیاز جلال میں آ گئی اور اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''ارے۔۔۔مولوی صاحب کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔اچھا ہوا جو یاد دلایا''۔
چنانچہ حضرت مولوی عبیداللہؒ حضرت شاہ نیاز بے نیاز کی خدمت اقدس میں حاضر کئے گئے۔واقعی وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو رہے تھے۔ریش مبارک لمبی ہو گئی تھی۔اور مونچھوں نے بھی لب ہائے مبارک کو چھپا دیا تھا۔حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیاز عالمؒ نے حجامت درست کرانے اور غسل کرنے اور صاف لباس پہننے کا حکم صادر فرمایا۔جس کو حضرت مولوی عبیداللہؒ بجالائے۔

اذن وخلافت:۔

بموجب حکم حضرت مولوی عبیداللہؒ دوبارہ حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔تو انہوں نے کرم فرما کر چشتیہ، نظامیہ، نیازیہ سلسلے میں خلافت عطا فرمائی۔اور واپس اپنے وطن جانے کا اذن بھی دے دیا۔

مراجعت وطن اور خرق عادت کاظہور:۔

وطن آ کر حضرت مولوی عبیداللہؒ کھیتی باڑی میں مشغول ہو گئے۔خود ہل چلاتے اور ایک رباب پاس ہوتا تھا۔اسی طرح لوگوں کی نظر سے چھپے رہے۔مگر ایک روز ہل چلا رہے تھے۔ بیلوں کی جوڑی کو روک کر نسوار کی ڈبیہ نکالی۔ایک ہاتھ میں نسوار کی ڈبیہ تھی اور دوسرے سے چٹکی لیکر دہن مبارک میں ڈالنے والے تھے کہ یکایک محویت کا عالم طاری ہو گیا۔اور اسی ہیئت میں کھڑے رہے۔پڑوس میں ایک اور کسان نے دیکھا تو اسے بڑا تعجب ہوا کچھ اس کی سمجھ میں تو نہ آیا مگر بات حیرت انگیز تھی اس لئے کسان حضرت خواجہ مولوی عبیداللہؒ کے قریب آ گیا۔ظہر اور عصر کے درمیانی وقفہ میں جونہی حضرت مولوی عبیداللہؒ محویت سے واپس ہوئے تو نسوار کی چٹکی جو پہلے سے ہاتھ میں لی تھی فوراً دہن مبارک میں رکھ لی۔قریب ہی پڑوسی کسان کو بھی کھڑا پایا۔وہ بدستور حیران تھا۔اس لئے حضرت مولوی عبیداللہؒ سے ماجرا دریافت کیا۔پہلے تو حضرت مولوی عبیداللہؒ چھپاتے رہے مگر کسان نے بتایا کہ''حضرت۔بہت دیر سے آپ کو اس ہیئت میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔چھپانے سے کچھ نہ بنے گا''لہذا حضرت مولوی عبیداللہ نے ارشاد فرمایا۔''درحقیقت آج میرے مرشد غریب نواز حضرت خواجہ شاہ نیاز بے نیازؒ پردہ فرما گئے تھے۔مجھے معلوم ہوا تو بریلی شریف چلا گیا۔اور حضرت نیاز العالمؒ کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے کے بعد ابھی ابھی واپس آ گیا''۔

حضرت سائیں محمد عظیم کی مزید تعلیم:۔

حضرت مولوی عبیداللہؒ کے مزار اقدس سے روحانی فیض حاصل کرنے کے علاوہ

حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کو مزید تعلیم حضرت خضر علیہ السلام نے دی تھی۔ ویسے مندرجہ بالا واقعات بھی یہاں ضمناً ذکر کیئے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کا آستانہ مبارک میرے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کی تسلی اور اطمینان کا آخری مقام تھا (اور حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کو حضرت مولوی عبیداللہؒ کی مطہر روح سے فیض ملا تھا)۔ حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کے پاس حاضر ہونے کے بعد حضور بے نواؒ کی تلاش کی آنکھیں سیراب ہوگئیں اور ان کے مضطرب دل کو یہاں آکر سکون حاصل ہوا۔

سالکین کی تیسری قسم مجذوب محض:۔

سالکین کی تیسری قسم کو مجذوب محض کہتے ہیں۔ یہ صاحب ابتدائے حال سے لیکر موت تک جذب کی حالت میں رہتا ہے۔ اس قسم کا سالک عمر بھر میں ایک یا دو افراد کی تربیت کر کے ہو بہو اپنی طرح مجذوب محض بنا سکتا ہے۔ مگر عوام کی تربیت کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ اور ایسے کئی مجاذیب فقرا سے میری صاحب سلامیت رہی ہے اور ان سے فیض بھی حاصل کیا ہے۔ منجملہ ایک تو ہمارے لنڈی کوتل کے قاصد بابا تھے۔ جو کافی شہرت رکھتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مجھے یوں لگتے جیسے مجذوب سالک ہوں۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ مجذوب محض تھے۔ کیونکہ انہوں نے عمر بھر میں صرف دو آدمی بنائے۔ جن کا ذکر اپنے موقعہ پر کیا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ واقعات بھی حضور بادشاہ جانؒ کے تذکرہ مبارک سے متعلق ہیں۔ بہر حال قاصد باباؒ نے کئی بار اپنے کام کی مجھے پیش کش کی تھی۔ مگر مجھے کوئی خواہش نہ تھی اس لئے انکار ہی کرتا رہا۔

قاصد باباؒ کے خوارق اور بہت سے کرامات میں نے چشم خود دیکھے ہیں۔ آنے والی تکلیف سے قبل آگاہی دینے کے لئے وہ خود میرے پاس تشریف لاتے۔ علاوہ ازیں بالفرض اگر میرے خیالات دنیائی دھندوں کی طرف منتقل ہو جاتے تو جناب قاصد باباؒ فوراً پہنچتے۔ اور کچھ ایسی نگاہ فرماتے کہ دنیائی خیالات سرد آہوں کی طرح میرے اندرون قلب سے نکل جاتے۔ قاصد باباؒ کے مکمل حالات قلمبند کرنے کے لئے ایک الگ دفتر کی ضرورت ہے وہ میرے بھانجے غلام محمد کے ساتھ بے حد محبت کرتے تھے۔ میرے اسی بھانجے نے جناب قاصد باباؒ کا پختہ مزار تعمیر کیا ہے۔ قبر کا کتبہ میں نے تحریر کیا تھا۔ تاریخ وصال اسی مصرعہ سے نکلتی ہے۔

لواڑ گے چول وو قاصدؒ پہ کبل باغ شو

(بے برگ و بار لنڈی کوتل قاصدؒ بابا کے طفیل گلستان ہوگیا)

ایک مجذوب محض:۔

ڈبگری دروازہ سے باہر ملحقہ قبرستان میں ایک اور مجذوب محض ہوا کرتے تھے۔ان کا
تعلق ناگپور کے بابا تاج الدین قدس سرہ سے تھا۔ہاتھ میں ہتھوڑا لئے دن بھر پتھروں کی پٹائی ان
کا شغل ہوتا تھا.اور چھوٹی سی آری ہاتھ میں لیکر یوں چلاتے جیسے کوئی چیز چیر رہے ہوں۔1937ء
میں جن دونوں مجھ پر خوف نے غلبہ پا کر قریب المرگ کر دیا تھا.تو میرے مرشد پاک حضور بادشاہ
جانؒ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ اب تمہیں کسی مجذوب کی توجہ کی ضرورت ہے۔'' میں نے گزارش کی
کہ ''خود حضورؒ کی موجودگی میں کسی اور کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟'' میری اس گزارش کے
جواب میں حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی یہ تھا.کہ ''نہیں۔۔بعض امور مجذوب محض کے توسل کی
رہین منت ہوتے ہیں.اس بنا پر کہ مجذوب محض کی توجہ میں ذاتی اثرات ہوتے ہیں.لیکن مجذوب
سالک کی توجہ میں یہ بات نہیں ہوتی۔اور وہ اس لئے کہ مجذوب سالک کی توجہ مخلوط ہوتی ہے۔یعنی
اس کی توجہ ذاتی اثرات کے ساتھ ساتھ صفاتی اثرات کی بھی حامل ہوتی ہے میں نے دوبارہ عرض
کیا۔کہ ''میرے لئے مجذوب محض کی پہچان بڑا کٹھن مرحلہ ہوگا.اس لئے حضورؒ خود ہی اپنی
صوابدید پر کسی کامل مجذوب کی نشان دہی فرما دیں۔چنانچہ حضور بادشاہؒ نے ارشاد فرمایا کہ''
''ڈبگری دروازہ سے باہر والے قبرستان میں جو مجذوبؒ رہتا ہے تم اس کے پاس چلے جاؤ۔وہ بابا
تاج الدینؒ کا آدمی ہے اور صاحب تصرف بھی ہے۔''

قبضۂ مخالفانہ:۔

لہذا حسب الارشاد میں ان کے پاس چلا گیا.وہ عام طور پر باباؒ کے نام سے مشہور تھے۔
اور آنکھوں سے اندھے اور کانوں سے بہرے تھے۔بہرحال میں نے پہنچتے ہی سلام علیک کہا.فی
الفور انہوں نے پتھر پیٹنے کا دھندا بند کر دیا.اور شستہ اردو زبان میں مجھ سے مخاطب ہوئے:''کل صبح
سویرے آجاؤ'' مجبوراً واپس ہونا پڑا.مگر دوسرے روز صبح سویرے حاضری دی۔اس وقت باباؒ کے
ہاتھ میں آری تھی۔اور اسی آدمی سے اس تخت کو پیٹ رہے تھے۔جس پر بیٹھے تھے۔جونہی میں ان
کے قریب پہنچا تو باباؒ نے آری ایک طرف رکھ دی۔مسکرائے اور تخت کو ہاتھوں سے تھپتھپا کر مجھے
خطاب کیا۔۔۔
''حمزہ بیٹھو!'' میرے لئے یہ بات حیران کن تھی۔کہ باباؒ کو میرا نام کیسے معلوم ہو گیا.بعد ازیں
انہوں نے اردو زبان میں یہ بات چیت کی۔''حمزہ! پختون ہو کر تم موت سے کیوں ڈرتے ہو''؟
ظاہر ہے کہ مجھے پہلے سے اس بات کا علم تھا کہ باباؒ کانوں سے بہرے ہیں اور میری بات کیا سنیں

گے. چنانچہ میں نے دل ہی دل میں کہہ دیا کہ چاہے آدمی پختون ہی کیوں نہ ہو لیکن جب اس کا دل کمزور ہو جائے تو خوفزدہ ہوا کرتا ہے۔اس خیال کا آنا تھا کہ باباؒ دوبارہ مسکرائے اور کہنے لگے" خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ۔۔ مرو گے نہیں"۔ تمہارے پیر نے تمہاری بتی روشن کی ہے۔کام پورا ہونے میں پندرہ برس کا عرصہ لگے گا تمہیں دو آدمیوں سے فیض ملے گا.اور تمہاری عمر پچھتر برس ہوگی تھوڑے وقفہ کے بعد پھر بولے کہ" کبھی کبھی ہمارے پاس آیا کرو" چنانچہ گاہے گاہے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا.اور کوئی شک نہیں کہ آہستہ آہستہ میرے خوف میں کمی آتی رہی۔ بلکہ قریباً قریباً ختم ہو گیا مگر ایک نقصان یہ ہو گیا.کہ اب مجھ پر باباؒ کی نسبت غالب آ گئی.اور حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ اب میں بھی جہاں کہیں بیٹھتا تو غیر شعوری طور پر پتھروں کو آپس میں ٹکراتا. مزید برآں اپنے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت میں کم حاضر ہوتا اور زیادہ تر باباؒ کے پاس رہتا حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی.کہ اگر کوئی حاجت مند دلی مراد لے کر باباؒ کے پاس حاضر ہوتا۔تو باباؒ ان سے کہتے کہ" پٹھان سے کہو.ان سنگین حالات کے پیش نظر میرے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کو بجا اور برحق طور پر یہ خدشہ لاحق ہو گیا.کہ حمزہ ناسمجھ ہے اور ایسا نہ ہو کہ مجذوب ہو جائے۔

طاقت کا استعمال:۔

حقیقت یہ ہے کہ میں ان حالات سے قطعی لاعلم تھا.نہ ہی مجھے اس کا احساس تھا مگر ایک روز جب میں اپنے گاؤں سے پشاور آیا تو ڈبگری دروازہ کے پاس بس سے اتر کر پیشتر اس کے کہ اپنے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا میں براہ راست باباؒ کے پاس چلا گیا.ان کی جگہ تک پہنچا تو ملنگوں (جو کافی تعداد میں وہاں ہوا کرتے تھے) نے مجھے بتایا.کہ دیکھو خبردار! باباؒ کے قریب مت جانا کیونکہ آج وہ سخت برہم ہیں اور لوگوں کو مارتے ہیں۔مگر میں نے ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔اور آگے بڑھ کر سیدھا باباؒ کے پاس چلا گیا۔اس وقت وہ تخت سے نیچے اتر آئے تھے۔ایک بھاری بھر کم آرہ ہاتھ میں لئے زمین کو پیٹ رہے تھے۔ساتھ ہی مغلظات سنا رہے تھے) ویسے بھی وہ دن بھر گالیاں دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مولانا عبد المجید افغانی اور ارباب تاج محمد خان خلیل سیشن جج کو بھی غلیظ گالیوں سے نوازا کرتے تھے) خیر میرے سائے کا ان پر پڑنا تھا کہ یک لخت زمین کو پیٹنے سے ہاتھ روک لئے اور میری طرف رخ کر کے کہنے لگے۔دیکھتے ہو۔تیرا گرز میرے ساتھ کیا کر رہا ہے؟اس جملے کے سنتے ہی میرے پیروں تلے زمین نکل گئی.میں خوفزدہ ہو گیا.اور اسی دوران باباؒ نے مجھے گالیاں دے کر کہا.کہ" تم کیوں ڈرنے لگے تمہارا تو بال بھی بیکا نہ ہو گا"۔

شیر یزدان:۔

اسی سراسیمگی کی حالت میں مزید ایک لحظہ ضائع کئے بغیر میں نے پوری تیزی سے ڈبگری کا رخ کیا. اس وقت حضور بادشاہ جانؒ سلطان سرائے کی ڈیوڑھی میں جلوہ افروز تھے۔ (حضور مرشد پاکؒ کا معمول تھا. کہ صبح اور بعد از دو پہر دونوں وقت چائے اسی جگہ نوش فرمایا کرتے تھے اور عصر کی نماز تک یہاں نشست جاری رہتی) کوئی دوسرا آدمی پاس نہ تھا ایک تکیئے سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ اور شیر کی مانند ان کے بال کھڑے تھے۔ قریب ہی رفیع الدین اپنی دکان میں چائے بنانے کے لئے چائے دانی صاف کر رہے تھے (شیخ رفیع الدین حضور بادشاہ جانؒ کے مخلص مریدوں میں سے تھے) میں نے آگے بڑھ کر حضور بادشاہ جانؒ کی دست بوسی کی۔ اور عین ان کے سامنے کھڑا ہو گیا. حضور بادشاہ جانؒ نے کرسی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے بیٹھ جانے کا حکم دیا. تو میں بیٹھ گیا. تھوڑے سے وقفے کے لئے مکمل سکوت رہا. اس کے بعد حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا.

(''چھین لینے کے لئے تو اس (مجذوب باباؒ) کے پاس تہہ بھی موجود نہیں (کہ ہم اس کو سلب کرالیں) کیونکہ مجذوب محض کا تعلق خاص طور پر ذات سے ہوتا ہے اس وجہ سے وہ تو قطع نہ ہوگا. البتہ میں نے تمہارا تعلق اس سے ختم کرا دیا۔''

اس واقعہ کے بعد جب کبھی میں اسی باباؒ کے پاس چلا جاتا۔ تو گالیاں دے کر سخت لہجے میں کہہ دیتے کہ جاؤ. اپنے گرو کے پاس۔

بازگشت:۔

یہ مجذوب باباؒ 1949ء میں پردہ کر گئے۔ ان کا مزار اسی جگہ پر ہے جہاں وہ اپنی زندگی میں عموماً بیٹھا کرتے تھے۔ قبر کا تعویذ پختہ بنایا گیا ہے۔ باباؒ کے ایک بالکے نے (جو مستری تھا) مزار پر گنبد بھی تعمیر کی ہے۔ سرراہے جو ایک روز میں وہاں چلا گیا. تو مستری صاحب نے مجھے نہ پہچانا چنانچہ اس نے مجھے توجہ دینی شروع کر دی تاڑتے ہوئے میں نے مزاحاً ایک دھکا دے کر کہا کہ واہ مستری جی! ہم سے بھی انٹ شنٹ؟ بے چارے پہچان گئے اور بے تحاشہ بغلگیر ہوئے۔ اب باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے اس سے حال احوال پوچھا تو کہنے لگے۔ کہ بھئی! ہم تو کچھ بھی نہ بن سکے اور تو اور ابھی تک شہوت کے لاؤ لشکر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے ان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ مستری صاحب مجذوب محض بننا آپ کے بس کا روگ نہ تھا۔ لاحاصل عمر گزار دی۔ آپ کے لئے خوب تر یہ ہوتا کہ کسی مجذوب سالک کی خدمت کرتے. بولے کہ صاحب اب پانی

سر سے اوپر ہو چکا ہے۔ خداوند سبحانہ مغفرت نصیب فرمائے اب مستری صاحب بھی وفات پا چکے ہیں۔

تصرفات کے بارے میں حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد:۔

مذکورہ بالا مجذوب باباؒ کی وفات کے بعد تا حال ان کے مزار سے کسی قسم کے تصرف کا ظہور دیکھنے میں نہیں آیا۔ اگرچہ بلا شبہ اپنی حیات میں صاحب تصرف تھے۔ اسی سلسلے میں ایک بار میں نے حضور بادشاہ جانؒ سے دریافت کیا تھا۔ میں نے التجا کی تھی کہ حضور! مجھے ان فقرا کی حقیقت سمجھا دیں۔ جو دوران زندگی میں تو بے انداز تصرفات۔ خوارق اور فتوحات کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن بعداز وفات ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ آخر اس کا کیا سبب ہے۔؟

عاملوں کا تصرف:۔

میری گزارش کے جواب میں حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی یہ تھا کہ:۔ ''اس ضمن میں ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے۔ جن کو عامل کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ فقراء کے روپ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ حالانکہ فقر سے ان کا دور سے بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ لوگ نرے عامل ہوتے ہیں۔ اور محض خواہشات نفس کو پورا کرنے کے لئے عملیات کا دھندا چلاتے ہیں۔ یہ لوگ روحانیت کے ابجد سے بھی نابلد ہوتے ہیں۔ اور عشق الٰہی سے تو ان کا کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ البتہ مسلسل عمل اور متواتر مجاہدے نے ان لوگوں کے اندر ایک طاقت پیدا کی ہوتی ہے اور اسی طاقت سے یہ لوگ کام لیتے ہیں۔ یہ لوگ فقط اپنی ظاہری عزت، وقار اور دبدبے کے طالب ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کا شمار اخوان الشیاطین میں ہوتا ہے۔ کیونکہ فی الحقیقت ان لوگوں کے قلوب میں شیطان کا بسیرا ہوتا ہے۔ یہ شیطانی طائفہ بڑا سنگدل اور بے رحم ہوتا ہے۔ یہ فرقہ اپنی قوت ارادی اور عمل کی طاقت سے عوام کو اپنے گرد جمع کرا کے ان سے دنیائی فائدے حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس گروہ کا خود بھی آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اور دوسروں کو بھی صراط مستقیم سے روگردان کرانے میں بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کا مرنے کے بعد کسی صورت میں تصرف باقی نہیں رہ سکتا۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کیونکہ ان کی برزخی زندگی ایک مجرم اور قیدی کی سی ہوتی ہے۔ اور ان کی روح مکمل طور پر لامنتہا ہی ظلمات میں سرگشتہ ہوتی ہے''

فقراء کا تصرف:۔

بعد ازیں کامل فقراء کے تصرف کے متعلق حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی یہ تھا۔

"عاملوں کے علاوہ ایک جماعت ایسی بھی ہے۔ جو حقیقت میں کامل فقیر اور اہل اللہؒ ہوتے ہیں۔ بفرض محال اگر ان لوگوں میں سے بھی کسی کی وفات کے بعد تصرف کا ظہور نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کو باری آنے پر تصرف کا موقع مل جاتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ وفات پاتے ہی تصرف کا ظہور ہو۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کامل فقیر کو اس کی وفات کے دو یا تین صدیوں کے بعد تصرف ملا ہے اور کئی ایک ایسے کامل اولیاء اب بھی زیر زمین مدفون ہیں جن کے نام و نشان کا بھی کسی کو علم نہیں۔ اکثر اوقات یوں بھی ہوا ہے کہ اچانک ہی کسی نامعلوم قبر سے تصرف کا ظہور ہوا ہے۔"

چشم دید واقعہ:۔

میرے مرشد پاکؒ کا یہ خیال بالکل صحیح اور درست ہے. اس لئے کہ 1941ء میں جبکہ لنڈی کوتل میں بسلسلۂ ڈیفنس مورچے اور شاہراہیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ تو درہ آش خیل کے ایک شخص نے رات کو کسی خوبصورت ہستی کو خواب میں دیکھا. جس نے اس شخص کو تاکید، ارشاد فرمایا کہ "جس سمت تم سڑک بنا رہے ہو آگے مت بڑھنا. اس لئے کہ وہاں میں پڑا ہوں" صبح اٹھ کر اس شخص نے اس مقام کا پورا جائزہ لیا. اور بغور دیکھا مگر وہاں کسی قبر کے آثار نظر نہ آئے۔ اس مقام پر کسی قبر کا ہونا اس لئے بھی ناممکنات میں سے تھا. کہ یہ ایک سنگلاخ پہاڑی سلسلہ تھا. اور ایک عظیم الشان پہاڑ کے دامن میں سڑک تعمیر ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ لنڈی کوتل کے سفید ریش بزرگوں نے بھی کبھی اس جگہ کسی قبر یا قبرستان کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ لامحالہ خواب دیکھنے والے شخص نے اپنے خواب کو کوئی اہمیت نہ دی. اور اسے خوابِ پریشان سے تعمیر کر کے کام جاری رکھا. اس شخص نے دوبارہ اسی قسم کا خواب دیکھا مگر ظاہر ہے کہ کھدائی نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ چنانچہ کام بدستور جاری رہا۔ حتی کہ ایک روز جونہی ایک مزدور نے کدال چلائی تو پہاڑ کے اندر سے ایک غار دکھائی دیا. اور اس نے چلا کر دوسرے مزدور کو پکارا. کہ "ارے بدبختو! دیکھو یہ کیا ہے؟" لہذا سب مزدور اکٹھے ہو گئے۔ غار کے دہانے کو مزید کھولا گیا. اور دوسرے لمحے میں سب کو ایک لاش نظر آئی۔ یک دم تازہ۔۔ کھچڑی داڑھی۔ ایک خوبرو اور پاکیزہ صورت کفن میں محو خواب تھی۔ اس لاش کی تازگی کا یہ عالم تھا کہ جیسے کل ہی فوت ہو گیا ہو۔ بہر حال افسران بالا کو آگاہ کیا گیا. اور چونکہ یہ ٹھیکہ مراد خان شنواری کا تھا. تو اس کے ایماء اور صلاح و مشورہ سے افسران مجاز اس بات پر راضی ہو گئے کہ اس سمت سے موڑ کر سڑک دوسری جانب گزار دی جائے۔ اور اسی فیصلہ پر عملدرآمد بھی ہو گیا. چنانچہ بعد ازیں یہ قبر زیارتگاہ بن گئی. اور اب لوگ وہاں جوق در جوق آتے جاتے ہیں. ایک مرتبہ میں بھی اپنے بھانجے ناظر شنواری کے ساتھ وہاں گیا تھا. فاتحہ پڑھنے کے بعد ہم دونوں قبر کے سامنے

کھڑے تھے۔ کہ اسی اثناء میں شیر کی خوفناک دھاڑ سنائی دی۔ جو تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد بھی دو تین بار متواتر سنی گئی۔ میں نے جائزہ لینے کے لئے پہاڑ کی طرف دیکھا مگر آس پاس چرنے والے جانوروں پر شیر کے خوف کا کوئی ردعمل نہ پایا. چونکہ وہ پوری دلجمعی اور بے فکری سے چرنے میں مصروف تھے۔ سو میں نے ناظر کو مخاطب کر کے اس سے دریافت کیا کہ ''آیا اس نے بھی شیر کی دھاڑیں سنی ہیں یا نہیں؟'' ناظر نے اثبات میں جواب دے کر کہا ''کہ ہاں! جیسے شیر دھاڑ رہا ہو'' بہر حال اس کے علاوہ کچھ اور واقعہ ہمارے دیکھنے یا سننے میں نہ آیا۔ اور ہم واپس اپنے گاؤں چلے آئے۔ مدعا یہ کہ اس واقعہ سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ اولیاءاللہ قدس اسرارہم کے تصرف کے خاص اوقات مقرر ہوتے ہیں اور جب وہ وقت آجاتا ہے۔ تو خود بخود تصرف کا ظہور ہو جاتا ہے۔

محمد شاہ اور ایک سید مجذوب:۔

میرا تعلق ایک اور مجذوب سے بھی رہا ہے۔ جو کسی زمانے میں فوج میں ملازم تھے۔ مگر بعد میں ملازمت ترک کر دی۔ جب کبھی وہ مجھے دیکھتے تو ''حمزہ۔۔ اوحمزہ۔۔!'' کہتے سر ہو جاتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مجھ سے ایسا زوردار معانقہ کرتے کہ شدت دباؤ سے میری پسلیوں میں درد ہو جاتا۔ اور یہ 1946ء کے آخری دنوں کا ذکر ہے۔ کہ ایک مرتبہ ڈبگری بازار میں ہمارا آمنا سامنا ہو گیا. دیکھتے ہی مجھ سے مصافحہ کیا. ان دنوں ان کے ہاتھوں میں رعشہ اور زبان میں لکنت پیدا ہو گئی تھی۔ مجھ سے بولے کہ ''باباجی! آؤ آج تم کو تخت پر بٹھا دیں''. حیرت ہے۔ کہ کجا وہ محمد شاہ جو کسی زمانہ میں مجھے ''بچہ'' کہکر مخاطب کرتے تھے اور کجا یہ دن کہ اب وہ مجھے ''باباجی'' سے خطاب کرتے ہیں؟ بہر نوع وہ مجھے چائے کی ایک دکان پر لے گئے۔ اپنی چادر بچھائی اور مجھے بٹھا دیا. روٹی کے چند روکھے سوکھے ٹکڑے نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے اور بولے۔ کہ ''باباجان! یہ رہی آپ کی دعوت!'' میں نے روٹی کے ایک سوکھے ہوئے ٹکڑے (جو بیس پچیس دنوں کا ہوگا) سے ایک نوالہ توڑ کر منہ میں ڈال دیا. اس کے بعد انہوں نے مجھے دو عدد ٹوپیاں دیدیں. جن میں سے ایک تو فوراً واپس لے لی اور جو ٹوپی میرے ہاتھ میں رہ گئی ہیں اس پر بالکل اسی طرح چاند ستارے کا نشان بنا ہوا تھا جو پاکستانی جھنڈے پر ہوتا ہے۔ اس چاند ستارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا. کہ ''بابا! اس چیز کا بہت خیال رکھنا'' پھر اٹھے اور اٹھ کر بولے کہ ''میرے پیچھے پیچھے آؤ'' اب وہ آگے اور میں ان کے پیچھے ہولیا. یہاں تک کہ مجھے میرے اپنے مرشد حضور بادشاہ جانؒ کی مجلس مبارک میں پہنچا دیا فخر العلماء اولیاء حسب معمول سلطان سرائے کی ڈیوڑھی میں رونق افروز تھے۔ میں مرشد پاکؒ کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا. (جہاں میں عموماً بیٹھا کرتا تھا)

اور محمد شاہ باہر زمین پر بیٹھ گیا۔ اور چپ سادھ لی۔ اتنے میں حضور بادشاہ جانؒ نے ان سے دریافت فرمایا۔ کہ کہو محمد شاہ کیسے آنا ہوا۔؟ سر جھکائے ہوئے محمد شاہ نے عرض کیا۔ کہ" باباجی! یہ لڑکا آپ کو سپرد کرنے کی خاطر لایا تھا" میرے مرشد پاکؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"تمہارے سپرد کرنے کی کوئی خاص ضرورت اس لئے نہیں کہ اس "لڑکے" کو میں خود بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں"۔

یہ سنکر محمد شاہ اٹھے اور باہر چلے گئے. سڑک تک پہنچ کر مجھے بھی اشارے سے اپنے پاس بلایا. میں اس کے پاس چلا گیا. اب وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر وہاں سے بھی چلدیا. اور ڈیگری دروازے کے اندر ایک بالاخانے پر لے گیا. جہاں کافی عرصہ سے ایک سید مجذوب مقیم تھا. اور مجھے ان کے بھی سپرد کر دیا. اس واقعہ کے بعد آج تک میں نے اس مجذوب کو نہیں دیکھا. خدا معلوم وہ کہاں چلا گیا؟

مجذوب سالک کا مقام:۔

یاد رہے کہ مجذوب محض حیوانیت اور انسانیت کے مقامات سے گزر کر مقام ملکیت میں ہوتا ہے۔ وہ بہر طور ذات الٰہی عز اسمہ میں محو ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود براہ راست انوار ذاتیہ کا برزخ ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مجذوب محض کو انسانی اور حیوانی اثرات سے واسطہ ہی نہیں پڑتا. وہ تو ہوتا ہے مگر مدعا یہ ہے کہ جب کبھی مجذوب محض کے دورۂ ملکیت میں کمی آ جاتی ہے۔ اور صفت انسانیت غالب آ جاتی ہے تو ایسے لمحات میں وہ علم وحکمت کے بے بہا موتی پر دتا ہے۔ لیکن اگر حیوانیت کے دورے کا ورود ہو تو بے حد غلیظ اور مکروہ قسم کی گالیاں دیتا ہے۔ اور لوگوں کو پتھروں سے مارتا ہے۔ البتہ یہ بات الگ ہے کہ پختہ مجذوب کم تر جذبہ حیوانیت سے مغلوب ہوتا ہے۔

مجذوب محض کی صحبت:۔

مجذوب محض کی صحبت کسی مبتدی سالک کے لئے مفید نہیں ہوتی. البتہ اگر سالک کو کچھ نہ کچھ روحانی شد بد حاصل ہو تو اسے ضرور فائدہ مل سکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے سالک میں مجذوب محض کے پرتو سہارنے کی قوت موجود ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مجھے جناب قاصد باباؒ کی صحبت سے فائدہ ہوتا تھا. جناب قاصد باباؒ میرے مرشد پاکؒ کی بڑی قدر کرتے تھے اور جب کبھی حضور بادشاہ جانؒ لنڈی کوتل تشریف لاتے تو اسی روز جناب قاصد باباؒ طوعاً وکرہاً استقبال کے لئے حاضر ہوتے۔ وہ عموماً کیمپ یا سرائے کے قرب وجوار میں کھڑے ہوتے. عجب یہ کہ میرے مرشد پاکؒ کو محمد اسلم کے نام سے یاد کرتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور بادشاہ جانؒ کا روحانی اسم گرامی

محمد اسلم تھا.

سالکین کی چوتھی قسم یعنی سالک محض:۔

سالکین کی قسم رابع سالک محض ہے۔اوراس کی تعریف یہ ہے کہ اس پرابتدائے سلوک سے لیکرانتہا تک جذب حق کا اثر دکھائی نہ دے۔اس قسم کے سالک بھی منزل تک پہنچ جایا کرتے ہیں۔لیکن مشیخیت کے اہل نہیں ہوتے۔ایسے افراد کی منزل ومقام کا بھی کسی کو علم نہیں ہوتا۔البتہ استقامت سے ضرور ہمکنار ہوتے ہیں.اور راہ سلوک کو ترک نہیں کرتے۔اور فی الحقیقت یہی استقامت ہی ولایت کی اساسِ نشانی ہوتی ہے۔

مسافر روح اور ناسوتی کالبد:۔

میرے شیخ حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

”جس وقت میں نے ہندوستان کے نیرنگی ماحول میں قدم رکھا.تو میری مثال بالکل ایسی تھی جیسے کوئی مسافر روح ناسوتی کالبد میں داخل ہوگئی ہو.اور جسم ناسوتی بمنزلہ رہبر کے ہو“۔

یہ حضور بادشاہ جانؒ کی بیدار مغزی اور چٹان جیسا مضبوط ارادہ تھا.کہ انہوں نے بہت قلیل عرصہ میں وہاں کے معاملات کے معراج سے آگاہی حاصل فرمائی.

حضور بادشاہ جانؒ کا ایک خواب:۔

حضور بادشاہ جانؒ ہاتھوں کی مزدوری کیا کرتے تھے۔آپ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

انہی ایام میں، میں نے حضرت سید الشہداء امام حسینؑ کو خواب میں دیکھا.حضرت امامؑ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں کربلا بلاؤنگا۔“

حضور بادشاہ جان کی مشقت وہمت اور سرمایہ:۔

یہی وجہ تھی کہ حضور بادشاہ جانؒ اپنے ہاتھوں کی سخت مشقت سے کمائے ہوئے سرمایہ کو بڑی احتیاط سے محفوظ رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔اگرچہ ان دنوں کسی عام مزدور کے دن بھر کی مزدوری صرف چھ پیسے مقرر تھے۔لیکن حضور بادشاہ جانؒ کی مزدوری دس پیسے ہوا کرتے تھے۔وجہ یہ تھی کہ آپؒ پتک چلایا کرتے تھے۔لیکن پھر بھی ان کا فولادی جسم دن بھر کی تھکا دینے والی محنت سے گھبرانے کا نام نہ لیتا تھا یہ واقعات 4-1903ء سے متعلق ہیں۔عصر کے وقت جب مشقت

سے چھٹی ملتی تو مرشد پاکؒ اپنے ڈیرے تشریف لاتے روز اپنے اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ان دنوں حضور بادشاہ جانؒ کثیر التعداد وظائف پڑھتے تھے آپؒ کے ساتھی آپ کی طاقت وہمت کو دیکھ کر حیران ہوتے تھے مختصر یہ کہ حضور بادشاہ جانؒ نے سخت محنت و مشقت کے عوض پاؤنڈوں کی صورت میں اتنی رقم جمع فرمائی تھی۔ جوان کے لئے کربلائے معلیٰ کی زیارت کے سلسلے میں آمد ورفت وغیرہ کے لئے کافی ہو سکتی تھی (بعد میں مجھ سے ارشاد فرمایا تھا۔ کہ یہ کل بیس پونڈ تھے پہلے حاجی غلام کے پاس بطور امانت رکھے گئے تھے۔ اور پردہ فرمانے سے ایک برس قبل یہ ارشاد ہوا تھا۔ کہ اب وہ رقم رفیق کے پاس ہے) بہر حال بعدازیں حضور بادشاہ جانؒ نے خود بھی ٹھیکیداری کا کام شروع فرمایا تھا۔ لیکن اس مد سے کمائی ہوئی دولت پر کربلائے معلیٰ کی زیارت کرنے کو نا مناسب سمجھتے تھے۔

عبدالغفور بادشاہؒ سے ملاقات:۔

حضور بادشاہ جانؒ کا اشاد گرامی ہے۔ کہ:۔

”جن ایام میں میں نے دہلی کے آس پاس ایک ٹھیکہ لیا تھا۔ تو انہی دنوں میرے پاس ایک بڑا ہی دل پسند اور دلکش آدمی آ گیا۔ اس کی عمر چالیس برس سے کچھ متجاوز ہو گی۔ اس نے مزدوری کی درخواست کی اور چونکہ اس شخص کے چہرے میں کشش کے آثار صاف طور پر جھلک رہے تھے۔ میں نے بیلداری کے کام پر لگا لیا لیکن ساتھ ہی اپنے جمعدار کو تاکیداً کہلایا کہ اس شخص سے کام نہ لے۔ بلکہ ڈیرے میں پورے آرام سے رکھے۔ اس نو وارد کا نام عبدالغفور تھا تھوڑے دنوں کے اندر ہی مجھے اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا کہ یہ نو وارد اور لوگوں کی نسبت غیر معمولی نوعیت کا آدمی ہے۔ وہ یقیناً شب خیز تھا مگر..... چھپ چھپ کر کسی آہٹ کے بغیر رات کو اٹھتا۔ بارے ایک شب کو ہم دونوں کا راز اس طرح سے فاش ہو گیا۔ کہ جب میں رات کے اندھیرے میں قریبی نہر کے کنارے وضو کرنے چلا گیا تو تاڑ گیا کہ مجھ سے پہلے ہی ایک آدمی وضوء کرنے میں مشغول ہے۔ میری آہٹ پاتے ہی اس نے مجھے آواز دی۔ ”ستار شاہ۔۔! تم ہو“ خلاف معمول اس کی آواز میں غضب کا اثر تھا۔ اور اس پُر جلال آواز کو سنکر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ کسی انسان کی آواز نہ ہو۔ بلکہ پرے دنیائے ملکوت سے مدھ بھرا آہنگ سنائی دیا ہو۔ میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا ”ہاں صاحب! یہ میں ہوں“ حق یہ ہے کہ اس وقت میری حالت کچھ ایسی تھی۔ جیسے کوئی محکوم کسی حاکم کے سامنے کھڑا ہو۔ اسی اثناء میں اس نے کہا۔ کہ ”بہتر ہے تو آؤ بیٹھ کر مطلب کی دو باتیں کر لیں“ کشاں کشاں میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے باتوں کا سلسلہ شروع کیا اور کہا کہ:۔ ”میرا نام عبدالغفورؒ بادشاہ ہے۔ کابل کا رہنے والا ہوں۔ اس ولایت کے اولیاء نے مجھے سرزمین افغانستان سے ملک بدر کر دیا ہے“ اتنا

مالک تھا۔ کبھی تو بے نقط سنکر خاموش رہتا اور کبھی معمولی سی بات پر آدمی کو تہ تیغ کر ڈالتا تھا۔ امیر نے سیدہ بی بی سے دریافت کیا کہ ''اے عورت! تو کیا مانگتی ہو؟'' سیدہ نے عرض کیا کہ ''میرے فرزند عبدالغفور بادشاہؒ کے لئے آنکھیں نکلوانے کی جو سزا آپ نے تجویز کی ہے۔ یہ بڑی سنگین سزا ہے۔ حالانکہ میرا بیٹا بے گناہ ہے۔ التجا یہ ہے کہ پہلے تو اس کو معاف کیا جائے۔ لیکن اگر آپ اس کو ہر حالت میں سزا دینے پر مصر ہوں تو اس کی ایک صورت جرمانہ ادا کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ میں اپنے فرزند کو چاندی سے تول دونگی اور وہی چاندی بیت المال میں داخل کردوں گی۔ اور بے شک میرا بیٹا جلاوطن بھی کیا جائے'' امیر عبدالرحمٰن نے یہ سزا دی کہ عبدالغفور بادشاہؒ کو افغانستان سے جلاوطن کر دیا۔

کشمیر میں ایک مجذوب سے مڈھ بھیڑ:۔

میرے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

''جب ہم دونوں دہلی پہنچے۔ تو چندے قیام کرنے کے بعد عبدالغفور شاہؒ نے فرمایا کہ ''کشمیر کی سیر ضروری طور پر کی جائے'' ویسے بھی اجمیر شریف سے واپسی پر ان کے طور واطوار عجیب وغریب ہو گئے تھے۔ ان سے طرح طرح کے خوارق دیکھنے میں آنے لگے تھے۔ ان حالات میں جب انہوں نے کشمیر جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو میں نے ٹھیکیداری کا سارا کاروبار اپنے جمعدار کے سپرد کر دیا اور خود ہم دونوں کشمیر روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر ایک جگہ قیام کیا۔ ایک روز ہم کھانا کھانے کے لئے ہوٹل گئے۔ اسی ہوٹل کے عین سامنے ایک جامع مسجد تھی۔ جمعتہ المبارک کا دن تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں میں ایک مجذوب پڑا تھا مخلوق خدا اس کے گرد جمع تھی۔ کوئی کھانے کی چیز لئے آ رہا تھا۔ کوئی چائے کی پیش کش کر رہا تھا۔ اور کوئی نقد روپے نذر کر رہا تھا۔ اس وقت اچانک عبدالغفور بادشاہؒ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ''جوان! (یہ ان کا تکیہ کلام تھا جو بعد میں میرے مرشد پاک کی زبان پر بھی چڑھ گیا تھا) بتاؤ تمہاری کیا صلاح ہے۔ کیا یہ سب لوگ ہمارے پاس آ جائیں؟'' مجھے یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی اور کہہ دیا۔ کہ'' ہاں صاحب! بہتر ہوگا۔ بلکہ لطف آ جائے گا؟ متصل عبدالغفور بادشاہؒ نے سر جھکا کر توجہ دینی شروع کی۔ اور بمشکل پانچ منٹ نہ گزرے ہوں گے۔ کہ ہجوم نے مجذوب کو چھوڑ کر ہمارے گرد حلقہ بنالیا۔ روپے کھانے پینے کی چیزیں الغرض جو کچھ بھی کسی کے ہاتھ میں تھا۔ آ کر ہمیں پیش کیا۔ یہ دیکھ کر عبدالغفور بادشاہؒ نے مجھ سے فرمایا۔ ''جوان! اب جس جس چیز کی ضرورت ہو تو اٹھا لو'' میں نے عرض کیا کہ'' صاحب! آپ کی دعا چاہئے سب کچھ وافر مقدار میں موجود ہے'' بہر حال انہوں نے وہ سب چیزیں حاضرین میں تقسیم کرادیں۔ دریں اثناء مجذوب نے بھی ہمیں معنی خیز نظروں سے دیکھا عبدالغفور بادشاہؒ مجذوب کے ارادوں کو

تاڑ گئے۔اور فرمانے لگے کہ "نوجوان! جنات کی عداوت سے پالا پڑ گیا.خدا خیر کرے۔اس کے بعد ہم نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے مسجد کی طرف چل دیئے۔اس وقت عبدالغفور بادشاہؒ آگے اور میں ان کے پیچھے تھا.جونہی ہم مجذوب کے قریب سے گزرے۔اور ابھی چند ہی قدم لئے ہونگے کہ اتنے میں عبدالغفور بادشاہؒ نے مجھے پکارا کہ "نوجوان! سنبھالو۔ مجھے لے اڑا.. اس ہنگامی وقت میں مجھ سے اور تو کچھ نہ بن پڑا البتہ اپنا ہاتھ ان کے سر پر رکھ دیا.اندریں اثناء ان کا مبارک سر شدید حدت اور بے پناہ طپش سے آگ ہو رہا تھا.وہ کچھ ایسی برقی رو کی لپٹ میں آگئے تھے کہ ہاتھ لگاتے ہی میرے تن بدن میں بھی گرمی کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی.خود ان کا رنگ پیلا زرد پڑ گیا تھا.انہوں نے بیٹھ کر نماز ادا کی۔اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ "میرے پیچھے بیٹھ کر سورۂ مزمل شریف کی تلاوت شروع کر دو"

میں نے تلاوت شروع کی اور وہ خود بھی تلاوت فرما رہے تھے۔تین مرتبہ ختم کرنے کے بعد۔چوتھی بار جب ہم اس آیت مبارک تک پہنچ گئے (**رب المشرق والمغرب لا اله الاهو فاتخذه وكيلا**) تو انہوں نے ایک ضرب لگا دی اور معافرمایا۔کہ "مجذوب کا خاتمہ ہو گیا" اب ہم مسجد سے نکلے۔باہر آئے تو دیکھا کہ مجذوب کے منہ سے خون جاری ہے۔بہر حال دو گھنٹوں کے اندر اندر ہی وہ فوت ہو گیا"۔

تصرف کا استعمال:۔

حضور بادشاہ جانؒ کی زبانی یہ قصہ سنکر میں نے عرض کیا۔کہ حضور! یہ واقعہ تو ہو بہو کسی کو عمداً قتل کرنے کے مترادف ہے۔اور اگر کسی شخص سے ایسے واقعات کا ظہور ہو جائے تو کیا وہ ولی اللہ کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے؟ میری گزارش سماعت فرمانیکے بعد حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ "عموماً اس قسم کے لوگ عامل ہوا کرتے ہیں.اور بالفرض اگر کسی فقیر سے ایک ایسے امر کا صدور ہو جائے تو وہ قانون کے مطابق ہوگا.اور اس کی دو صورتیں ہوں گی. اولاً جیسے حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں خواجہ خضر علیہ السلام کے ہاتھوں ایک بچہ قتل ہوا تھا.ثانیاً حضرت احمد بوتراب حضرویہ قدس سرہٗ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا تھا.کہ وہ بایزید قدس سرہٗ کے حضور میں ہدیہ سلام پیش کرنے کے لئے حاضر ہو.لیکن مرید نے کہا تھا کہ میں روزانہ بایزیدؒ کے خدا کو دیکھتا ہوں. چہ جائیکہ اس کے بندے بایزیدؒ کو دیکھوں؟ لہذا مجھے ضرورت نہیں احمد بوتراب حضرویہ قدس سرہٗ نے فرمایا.کہ تم خداوند تعالیٰ عزاسمہ کو بحسب اپنی استعداد اور طاقت کے دیکھتے ہو اور حضرت بایزید قدس سرہٗ حق سبحانہ وتعالیٰ کو اپنی استعداد اور طاقت کیمطابق ملاحظہ فرماتے ہیں.اس لئے ان کے پاس تمہارا جانا بہر حال ضروری اور فائدہ بخش

ہے۔ بہر کیف مرید اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق حضرت بایزید قدس سرہٗ کے ہاں حاضر ہو گیا
۔خانقاہ پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ بایزید قدس سرہٗ موجود نہیں ہیں۔ دریافت کرنے پر اسے بتایا گیا۔ کہ وہ
سامنے والے کنوئیں سے پانی لانے تشریف لے گئے ہیں۔ چنانچہ مرید اسی طرف روانہ ہو گیا۔
تھوڑی دور جا کر دیکھا ایک ضعیف العمر اور سفید ریش آدمی ہاتھ میں کوزہ لئے خانقاہ کی طرف آ رہا
ہے۔ نخفت وضعف سے اس کا سر ہل رہا ہے۔ جونہی مرید مذکورہ ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے
بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ ہی لیا۔ آنکھوں کا چار ہونا تھا۔ کہ احمد بوتراب خضرویہ قدس سرہٗ کا
مرید اللہ کا نعرہ لگا کر زمین پر گر پڑا۔ اور گرتے ہی دم توڑ دیا۔ یہ دیکھ کر حضرت بایزید بسطامی قدس
سرہٗ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ کہ ”خوب! تم تو دن میں ستر بار بایزید کے خدا کو دیکھتے تھے
۔مگر اب اس کے بندے بایزید کو بھی دیکھنے کی تاب نہ لا سکے“ غرض یہ کہ اس قسم کی موت شہادت
عظمیٰ کا درجہ رکھتی ہے۔ اور مذکورہ واقعہ میں یہ موت اس شخص کے لئے بدرجہا مفید تھی۔ کیونکہ ایسے
نادر الوقوع لمحات میں کسی ولی کی ہر صفت حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفت ہوتی ہے۔ اور حدیث قدسی
میں اسی طرف اشارہ ہے۔ (**کنت لہ سمعا و بصرا ...... الخہ**) یعنی حق سبحانہ و
تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ... میں کان بن جاتا ہوں تو مجھی سے سنتا ہے۔ میں آنکھ بن جاتا ہوں تو مجھی
سے بولتا ہے۔ اور ہاتھ بن جاتا ہوں تو مجھی سے چیزیں اٹھاتا ہے.....“ گویا اس حالت میں کسی
ولی اللہ کا ہر فعل، فعل خداوندی عزوجل بن جاتا ہے۔ اور وہ (ولی) خود درمیان میں نہیں ہوتا
۔چنانچہ جنگ بدر کے موقع پر حق سبحانہ وتعالیٰ رسول کریم ﷺ سے ارشاد فرماتا ہے۔ (**وما
رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ**) اور اے پیغمبر ﷺ جب تم نے میدان جنگ
میں مٹھی بھر خاک پھینکی تو حقیقت یہ ہے کہ تم نے نہیں پھینکی تھی۔ (بلکہ) خدا نے پھینکی تھی) یہ ایک
حالت ہے۔ جو کبھی کبھی اولیاء اللہ قدس سرہٗ اسرارہم پر وارد ہوتی ہے۔ اور اسی حالت کی طرف
مولانائے روم قدس سرہٗ نے بھی اشارہ کر کے فرمایا تھا۔

**”اولیا را ہست قدرت از الٰہ
تیر جستہ بار گرداند زراہ**

اور نیز

**”گفتۂ و گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود“**

تحقیق وتشریح:۔

اس سلسلے میں میری اپنی تحقیق یہ ہے۔ کہ حال کی کیفیت اولیاء اللہ قدس سرہٗ اسرارہم کو رسول کریم ﷺ سے صدری سنت کے طور پر حاصل ہوا کرتی ہے۔ اور یہ حالت اس حال کا پرتو ہوتی ہے۔ جس کی تصریح اس حدیث مبارک میں کی گئی ہے۔ (**لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ نبی مرسل ولا ملك مقرب**) یعنی میرے لئے حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ ایک وقت مقرر ہے جس میں نہ تو کسی نبی ومرسل کے آنے کی گنجائش ہے اور نہ ہی ملائک مقربین کے۔ بہرنوع ہر کامل ولی اللہ کی روحانیت رسول ﷺ کی روحانیت اقدس کا پرتو ہوتی ہے۔ جب تک کوئی ولی اللہ رسول کریم ﷺ کی ذات اقدس میں فنا نہ ہو جائے۔ یعنی فنافی الرسل کے اعلیٰ مرتبہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس وقت تک کسی صورت میں حقیقت کی بو تک نہیں سونگھ سکتا. اور نہ ہی فنافی اللہ کی مبارک صفت سے متصف ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بلاشبہ رسول کریم ﷺ کا وسیلہ برزخ کبریٰ ہے۔ اور اس کے بغیر بھی توحید تو حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس قسم کی توحید کی نوعیت براہ راست شیطانی اثرات کی زد میں ہوتی ہے۔ اور شریعت غرّا میں کوئی مقام اور کوئی اصلیت نہیں رکھتی. اس قسم کی توحید کا سالک مدامی طور پر استدراج کے ظلماتی پنجے کی سخت ترین گرفت میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن رسول ﷺ کے برزخ میں شیطان کسی قسم کی شرارت نہیں کر سکتا. ورنہ اگر دیکھا جائے۔ تو ہندوؤں، عیسائیوں اور دیگر غیر مسلموں میں بھی توحید موجود ہے۔ اور خصوصاً اگر کسی نے ہندوؤں کی توحید کا مطالعہ کیا ہو تو یقیناً اسے حیرت ہوگی کیونکہ ان کے ہاں بلند پایہ توحید کا ذکر ہے۔ وہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے ہاتھوں، آنکھوں، زبان اور علم بلکہ ہر صفت کی نفی کے باوصف ذات الٰہی عزوجل کے قائل ہیں. صفات الٰہی عزوجل کو وہ اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ یہ ایک طرح سے ذرائع کا درجہ رکھتے ہیں اور حق سبحانہ وتعالیٰ کسی قسم کے ذریعے کے محتاج نہیں. مگر یاد رہے۔ کہ ہندوؤں کی توحید کلیتاً تنزیہی توحید ہے۔ جو بالآخر نفی ذات پر ختم ہوتی ہے مطلب یہ کہ جب تک اس (تنزیہی توحید) کے ساتھ تشبیہی توحید شامل نہ ہو تو شک نہیں کہ ایسی توحید ناقص کہلائی جائے گی.

اولیاء اللہ کا ماحول:۔

جس طرح خالص موتی گندی اور بھدی قسم کی سیپی میں ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اکثر اوقات اولیاء اللہ قدس اسرارہم بھی گندے ماحول میں ہوا کرتے ہیں. یہاں تک کہ ان کے متعلقین میں بھی بعض ایسے افراد موجود ہوتے ہیں. جو نفس وشیطان کا کام انجام دیتے ہیں. اس لئے

کہ اولیاء اللہ قدس اسرارہم ہمیشہ امتحان میں مبتلا ہوتے ہیں. میرے مرشد پاک رضی اللہ تعالیٰ نہ کا بھی یہی حال تھا. لیکن اس کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا. البتہ صرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں.

طریقہ نقشبندیہ میں خلافت اور عبدالغفور بادشاہؒ کا حال:۔

حضور بادشاہ جانؒ نے جناب عبدالغفور بادشاہؒ کے ہمراہ دور دراز تک سفر کیا. اور اسی سفر کے دوران نقشبندی مسلک کے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا. عبدالغفور شاہؒ نے حضور بادشاہ جانؒ کو اسی سلسلہ میں خلافت سے بھی نوازا. یہاں تک کہ ہر دو حضراتؒ ملاکنڈ ایجنسی کے بٹ خیلہ نامی گاؤں پہنچ گئے۔ اسی گاؤں میں عبدالغفور بادشاہؒ علیل ہو گئے۔ اور چند ایام صاحب فراش رہ کر پردہ فرما گئے. اور اسی مقام پر ہی ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا گیا.

مراجعت دہلی. ٹھیکیداری اور تلاش مرشد کامل:۔

میرے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔ ''چالیس روز تک میں عبد الغفور بادشاہؒ کے مزار پر حاضر رہا. اور اس دوران میں ختم قرآن مجید کرتا رہا. اس کے بعد دہلی روانہ ہو گیا. اس وقت تک مجھے تسکین قلب اور مکمل اطمینان حاصل نہ ہوا تھا. اور ابھی شوق طلب روز افزوں تھا. میری کوشش اور خواہش یہ تھی۔ کہ بہرصورت کسی کامل مرشد کے آستانے تک پہنچ جاؤں اور اسی طلب میں ہندوستان کا چپہ چپہ چھان مارا. جہاں بھی جاتا ٹھیکیداری کا کام میسر آتا رہا یہ دفع الوقتی کی ایک بڑی اچھی صورت تھی۔ روپے ایک ہاتھ آتے اور دوسرے ہاتھ میں لٹا دیتا. چنانچہ گوالیار میں ایک حکیم صاحب سے کاروباری شرکت کی تھی۔ ویسے تو حکیم صاحب بڑے مزے کے آدمی تھے. لیکن پرلے درجے کے وہمی تھے۔ جب ان کے ہاں ایک لڑکے نے جنم لیا تو اس کے بعد اپنی منکوحہ کے قریب نہ پھٹکتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ''صاحب جب ایک انسان سے اتنا بڑا سارا انسان پیدا ہو جائے۔ تو بھلا اس میں حیات کیسے باقی رہ سکتی ہے؟'' الغرض روپوں کا حساب کتاب، چیک بک وغیرہ بھی کچھ میرے حوالے تھا. ایک روز مقام ٹھیکہ سے تیس ہزار روپوں کو لیکر میں گوالیار روانہ ہو گیا. سوء اتفاق سے گاڑی میں نیند نے غلبہ کیا. اور میں سو گیا. صبح جاگا تو معلوم ہوا کہ گوالیار سے بہت دور کافی آگے نکل آیا ہوں. روپوں کی تھیلی بھی میرے سر کے نیچے سے سرک گئی تھی. حسن اتفاق سے کسی مسافر نے کوئی تعرض نہ کیا تھا. اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ تیس ہزار روپے بڑی چیز ہے جس کے طفیل وطن میں پوری خانی کا دبدبہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر اسی رقم کو لیکر وطن چلا جاؤں تو کیا حرج ہو گا؟ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے نفس کی

شدید طور پر سرزنش کی۔ اور کہا کہ قبل ازیں کتنی بڑی بڑی رقمیں ہاتھ آئی ہیں۔ لیکن اس قدر کا خیال کبھی نہ آیا۔ مقام حیرت ہے کہ آج تمہیں یہ کیا ہو گیا؟ خیر اگلے اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر حکیم صاحب کو بذریعہ تار حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ ادھر حکیم صاحب کو شک گزرا تھا کہ گویا میں رقم لے کر فرار ہو گیا ہوں۔ اگرچہ بعد میں انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تم پر مجھے یہ شبہ ہرگز نہیں ہو سکتا لیکن اس کا کیا علاج کہ شک کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے"۔

نفس وشیطان کے آلاتِ حرب:۔

میں کہتا ہوں۔ کہ نفس انسانی کبھی نہیں مرتا۔ اور یہی نفس ہے کہ جو ہمیشہ شیاطین کے تابڑ توڑ حملوں کے لئے قلعے کا کام دیتا ہے۔ جس قدر بھی سالک ارفع اور اعلیٰ مقامات میں داخل ہوتا ہے۔ اس قدر نفس بھی مکروفریب سے کام لیکر بہکانے میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ پھر ایسے سالک کا نفس تو انتہائی باغی ہوتا ہے۔ جس کی سرشت میں عشق ومعرفت کی اعلیٰ ترین استعداد بہ درجہ اولیٰ موجود ہو۔ یہاں تک کہ اگر مطمئنہ تک بھی رسائی حاصل کرلے تو بھی بغاوت کا خطرہ موجود ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب دشمن کی فوج کسی قلعہ کو فتح کرنے کے سلسلے میں جس قدر بھی قلعے کی نزدیک تر ہوتی جاتی ہے۔ اسی قدر قلعے کے محافظ دستے بھی مدافعت میں سر دھڑ کی بازی لگانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ یہاں پر ہم نفس کے قلعہ کو یوں فرض کریں گے۔ مثلاً ایک قلعہ کے اندر دوسرا قلعہ اور اسی طرح قلعہ اندر قلعہ سمجھ لیں گے۔ یہاں تک کہ سات عدد قلعوں تک شمار کرلیں گے۔ اب پہلے قلعے کو ہم نفس امارہ کے نام سے موسوم کرینگے۔ جسے فتح کرنے کے لئے سر توڑ کوشش اور سخت ترین محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز اس قلعہ کو فتح کرنے کے لئے کم تدبیر اور بیشتر قوت اور مجاہدہ درکار ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ابتدائیہ قلعے طاقت کے ذریعے سے فتح اور بعد میں حکمت کے ذریعے سے زیر ہوا کرتے ہیں۔ نفس امارہ کے مغلوب ہو جانے کے بعد نفس اور شیطان مکروفریب کے اسلحہ خانے کی طرف رخ کرلیتے ہیں۔ اور انہی حیلوں سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ امر واقعہ یہ ہوتا ہے کہ نفس امارہ ہزیمت اٹھانے کے بعد درحقیقت پسپا تو ہو جاتا ہے۔ لیکن آگے چل کر نفس لوامہ میں نیا روپ دھار لیتا ہے۔ اور اس محل میں اس کے مکروفریب کی نوعیت نفس امارہ کی سی نہیں ہوتی۔ بلکہ اب وہ نفس لوامہ کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ اسی طرح جوں جوں سالک لوامہ سے ملہمہ اور ملہمہ سے نفس راضیہ اور آخرکار نفس راضیہ سے بھی گزر کر مرضیہ تک پہنچتا ہے۔ تو ہر حال میں شیطان کی برابر یہ کوشش ہوتی ہے کہ سالک کو اپنے دام فریب میں مبتلا کردے۔ اور خدانخواستہ اگر ایک مرتبہ بھی اس دام میں آکر دھوکہ کھا گیا تو فوراً نفس امارہ کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس حال میں اگر سالک مجاہدہ ترک کردے۔ تو ظاہر ہے۔ کہ منزل مقصود سے رہ جاتا

ہے۔ یہی وہ خطرناک مقام ہے۔ جہاں اکثر سالکین قاطع ہو کر فساد الحاد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔(اعاذنا الله وایا کم عن هذه المراتب)۔

بنارس کی ایک طوائف:۔

حضور بادشاہ جان کا ارشاد عالی ہے کہ:۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جبکہ میں نے بنارس میں ایک چھوٹا سا ٹھیکہ لے لیا تھا۔انہی ایام میں بنارس ہی کی ایک مسلمان طوائف سے سابقہ پڑا اس کا سن چالیس برس سے متجاوز ہوگا۔ مجھے دیکھا تو بے حد خلوص ومحبت سے پیش آنے لگی۔ پھر تو اس نے میرے ہاں آنا جانا بھی شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر اکثر لوگوں کو گمان ہوا کہ بادشاہ صاحب ایک حسین وجمیل نوجوان ہے۔ اور طوائف دل وجان سے اس پر فدا! ایسا نہ ہو کہ طوائف کے دام حسن میں گرفتار ہو جائے۔ کسی حد تک مجھے خود بھی یہ خطرہ لاحق تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد طوائف نے ہمیں دعوت پر بلایا۔ مجبوراً اپنے چند احباب کو ہمراہ لیکر میں اس کے ہاں چلا گیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد طوائف نے مجھ سے کہا کہ:۔

''میری ایک نوجوان کنواری بیٹی ہے۔اس کی آرزو ہے کہ آپ سے دعائے خیر طلب کرے۔ لہذا آپ کے ہمراہی یہاں آرام فرمائیں۔ اور آپ میرے ساتھ ذرا پردے میں تشریف لانے کی زحمت گوارا کریں'' دریں اثناء میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ انہی میں سے لنڈی کوتل کا باشندہ پاری نامی ایک شنواری بھی تھا۔ جو انتہائی منہ پھٹ اور بے لگام تھا۔ اس نے طوائف کو مخاطب کر کے کہا کہ'' کیوں بی! طوائفوں میں شرم۔ اور پردہ کرنے کا رواج کب سے آ گیا ہے؟ جا! اور اپنی بیٹی کو یہاں لے آ! طوائف نے نہایت متانت سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ کہ'' خان صاحب! آپ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کی تمام تر پرورش میں پردہ کرانے کا خاص خیال رکھا ہے۔ اور اسی ماحول میں اس کو قرآن وحدیث پڑھایا گیا ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کو طوائفانہ رکھ رکھاؤ اور پیشہ ورانہ رسومات سے مطلق ناآشنا رکھا ہے۔ اور میری بیٹی کو صرف وہ شخص دیکھ سکے گا جس کے نکاح شرعی میں وہ آئے گی''۔ چنانچہ پاری نے کہہ دیا کہ'' خوب! اگر ایسی بات ہو۔ تو ہم لوگ باہر نکل جائیں گے۔ اور تم اپنی صاحبزادی کو یہاں لے آؤ'' یہ کہہ کر وہ لوگ تو باہر نکل گئے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ دوشیزہ آ گئی۔ میں کچھ بتا نہیں سکتا کہ وہ نوخیز دوشیزہ کیا تھی؟ بس چمکیلی، بھڑکیلی برق درخشندہ ہو گی۔ اور یا وہ شوخ دشنگ کرن جو آنکھوں سے قلب کی گہرائیوں میں اترتی ہو۔ من موہنی پورے آب وتاب سے آئی اور سیدھی آ کر میرے قدموں میں گر گئی۔ پھر نہایت ادب اور سلیقے سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ کچھ تو پاس حیاداری کی وجہ سے اور کچھ کسی نامعلوم جذبے کے زیر اثر میں دوبارہ اس مست شباب دوشیزہ کی طرف سے دیکھ

سکا. جو کچھ بھی تھا۔ تھوڑی دیر گزرنے کے بعد اپنی ماں کا اشارہ پا کر وہ غارت گر ایمان کلی اندر چلی گئی۔ اور معاً اس کی ماں مجھ سے یوں مخاطب ہوئی. کہ ''شاہ صاحب اس بھرے جہان میں میری یہی اکلوتی لڑکی ہے علاوہ ازیں یہ اتنی طویل وعریض حویلی اور ایک لاکھ روپے نقد...... کی مالیت بھی رکھتی ہوں. خدا لگتی بات یہ ہے کہ سوائے آپ کے جی نہیں چاہتا کہ کسی اور کے نصیب ہو۔ چنانچہ اگر آپ میری لڑکی کو اپنی کنیز بنانے پر راضی ہو جائیں. تو مجھے انتہائی خوشی حاصل ہوگی. اور میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا. میں اپنی تمام جائیداد آپ کے نام منتقل کرادوں گی. اور خود کنارہ ہو کر اللہ اللہ کروں گی. اس دوران میں میرے نفس نے بھی مجھے ایسے قوی اور مضبوط دلائل پیش کئے جن کو صحیح اور حق جاننے میں مجھے کوئی شبہ نہیں نہ رہا. یہ تو میرے نفس آمارہ کا حال تھا. اور جہاں تک لوامہ کا تعلق ہے۔ تو وہ اس مرحلہ میں کچھ دب سا گیا تھا. تاہم اس کی جانب سے ایک نحیف وکمزور سی صدا ضرور سنائی دیتی تھی۔ کہ ''خبردار۔۔ ہوشیار'' لیکن یہ کمزور صدا نفسانی جذبات کے طنبور خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوتی۔ بہر حال طوائف سے میں نے کہا کہ اپنے ارادے سے کل آگاہ کرونگا. اس جملے کا سننا تھا. کہ ایک لخت اس نے اپنا سر میرے قدموں میں رکھ دیا. اور بصد منت التجا کی۔ کہ ''شاہ جی! ابھی۔ اور اسی وقت ہاں کہہ دیجئے گا'' میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا تمہارا کہنا بجا ہے۔ اور ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ لیکن کم از کم مجھے اتنی مہلت تو ضرور چاہئے کہ اپنے خویش و اقارب سے مشورہ لے سکوں بہر حال اسے یقین آ گیا۔ کہ گویا شاہ صاحب ''راضی ہیں. اور رخصت دے دی. اسی رات مجھے نیند نہ آئی۔ بارے آہستہ آہستہ نفس امارہ کے طوفان خیز حملے پست ہونا شروع ہو گئے اور نفس لوامہ نے ابھر کر اپنا کام شروع کر دیا. اس کی تلقین یہ تھی۔ کہ ''ستار شاہؒ ایسا کرنے میں حقیقتاً ممانعت تو کوئی نہیں اور نیز شرعی طور پر بھی جائز ہے ۔لیکن ذرا سوچ لو! کہ کل کلاں اگر اس لڑکی کے بطن سے اولاد پیدا ہوئی اور کسی نے طعنہ دے کر یہ کہہ دیا کہ جا بے! کنجری کے پوت! تو تم بتا سکتے ہو کہ پھر کیا ہوگا؟ اس خیال کے آتے ہی نفس امارہ کے سارے ہوائی قلعے مسمار ہو گئے۔ اور نفس لوآمہ مکمل طور پر غالب آ گیا اور میں پورے سکون سے سو گیا. اگلے دن صبح نیند سے بیدار ہوا تو محسوس کیا. کہ پچھلا سارا ذوق وشوق اندرون قلب سے ایک قلم محو ہو گیا تھا ان حالات کے پیش نظر بنارس میں مزید ایک لحظہ رہائش بھی مناسب نہ تھا. کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ اگر طوائف آ گئی تو مارے حیا کے آنکھیں بھی چار نہ کرسکوں گا. اور حرف انکار بھی زبان پر نہ آئیگا. وجہ یہ تھی کہ میرے انکاری ہونے سے اس کے دل کو کس قدر ٹھیس لگتی؟ اس لئے فوراً دہلی روانہ ہو گیا''

نفس وشیطان کی حیلہ سازیاں:۔

اس ضمن میں، میں یہ عرض کروں گا کہ جب نفس امارہ کا طمطراق اور بہکانے کی تمام قوتیں مضمحل ہوکر نابود ہو جاتی ہیں۔تو پھر مکر وفریب کے کارخانے سے حیلہ جوئی کا مؤثر ترین اسلحہ سنبھال لیتا ہے۔مذکورہ بالا واقعہ میں نفس امارہ نے یہی قاعدہ کلیہ آزمایا.کہ حضور مرشد پاکؒ کو شریعت کے آئینے میں طوائف کی لڑکی کا نکاح ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت کرادیا.کیونکہ شرعی طور پر ایسا کرنے میں کیا حرج ہوسکتا تھا؟لیکن دراصل یہ نفس وشیطان کی ایک بہت بڑی سازش تھی۔ اس وجہ سے کہ ہنوز حضور بادشاہ جانؒ کو مکمل اطمینان قلب اور پوری استقامت نصیب نہ ہوئی تھی.اوراس نکاح کالازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ حضور بادشاہ جانؒ ظاہری حسن و جمال کی پرکیف رنگینیوں میں کھوکر اپنے روشن مستقبل کی ضوفشاں روحانی نعمت سے محروم رہ جاتے۔۔ظاہر ہے کہ طوائف کے خویش واقارب اور دیگر متعلقین بھی یقیناً حضور بادشاہ جانؒ کے ہاں آمدورفت رکھتے اوراس کے باوصف اپنادھندا بھی چلاتے۔مزید برآں جس نوعیت کے ماحول میں ان کی پرورش ہوئی ہو گی اس ماحول کے خوفناک جراثیم اوراس کے اثرات لامحالہ ان کے اندر موجود ہوتے۔تواس لئے اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ آہستہ آہستہ ان ہلاکت خیز اثرات کا پرتو براہ راست حضور بادشاہ جانؒ کی روحانیت پر پڑتا.اورخدانخواستہ اگر یہ حالت تھوڑے عرصہ کے لئے جاری رہتی تو چپکے چپکےاوراندر ہی اندر سے نفس امارہ میں نئی قوت کی لہر دوڑ جاتی۔اورخوب اچھی طرح سے تازہ دم ہو کرحضور بادشاہ جانؒ کے سنبھلنے اورتاڑ لینے سے قبل ہی ایسی کاری ضرب لگاتا کہ مرشد پاکؒ کلی طور پر نفس امارہ کی انتہائی سخت گرفت میں آجاتے جس سے نکلنا دشوار ہوتا.جن سالکوں کواس قسم کے واقعات سے دوچار ہونا پڑا ہے وہ بخوبی اندازہ لگاسکتے ہیں.کہ اگرحضور بادشاہ جانؒ کے نفس امارہ کو یہ یقین آجاتا.کہ اب اس کی گرفت پوری طرح مضبوط اورمکمل طور پر محکم ہوگئی ہے۔تو ان حالات میں ایک ایسی بلاخیز اوراندوہناک چوٹ لگاتا کہ حضور بادشاہ جانؒ کے گذشتہ تمام مجاہدات اوران کے تمام مفیداثرات بیک جنبش فنا کردیتا.اوران کو یہ بہ امر مجبوری راہ سلوک کی ازسرنو ابتداء کرنی پڑتی۔اس قسم کی ابتداء بھی اس حال میں ممکن ہوتی جبکہ ان کے نفس لوامہ میں رمق بھر جان باقی رہتی ورنہ قصہ تمام ہوتا۔العیاذ اباللہ۔

متابعت نفس کے خطرناک نتائج:۔

دراصل یہ ایک انتہائی نازک مرحلہ ہےاورخدانخواستہ اگراس میں سالک کسی معمولی سی بات میں بھی متابعت نفس اختیار کرلے۔تو پھر اپنے اوپر قابو پانا محال ہوجاتا۔اورظاہر ہے کہ جب

معاملہ اپنے اختیار سے نکل جائے تو مجاہدہ کرنا بھی اس قسم کے سالک کے بس کا روگ نہیں رہا. کیونکہ نفس امارہ ہر طرف سے اس پر اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔ حضور بادشاہ جانؒ کے معاملہ میں خصوصی طور پر تائید ایزدی شامل حال تھی۔ کہ ان کو اس قسم کے نکاح سے محفوظ رکھا گیا. اور نفس لوامہ کی باز گشت سے ان کو آگاہی بخشی گئی۔ ان ہنگامی حالات میں ان کے نسبی نفسیات کو جھنجھوڑا گیا۔ اور ہاشمی غیرت کے ستھرے جذبے کو عین اس وقت بیدار کیا گیا۔ جس کی ضرورت اشد اور اہمیت بے پناہ تھی.

اختلاط نسل اور سادات :۔

اب یہاں پر ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے۔ کہ وہ سادات کرام جو اپنے خون کو غیر سادات کے خون کی آمیزش سے محفوظ رکھتے ہیں. وہ سدا طور پر پاکیزہ طبیعتوں کے مالک اور انتہائی غیرتی ہوتے ہیں. البتہ آج کل کے وہ سادات جن کی دینداری کا سارا جذبہ چرس کے دھوئیں کی نذر ہو گیا ہے۔ اور ان کی مثالی عصمت وعفت بازاری عورتوں کے ظاہری بناء سنگھار میں لٹک کر رہ گئی ہے۔ یا ان کی جدی غیرت وحمیت کے اصلی جوہر کو بھیک مانگنے یا کاسۂ گدائی پھرانے کے مذموم روزگار نے بے نور کر دیا ہے۔ تو ان تمام مکروہ اثرات کی اصل وجہ صرف یہی ہے کہ یہ حضرات اپنی نسل کو خلط ملط سے محفوظ رکھنے کے روادار نہیں رہے ہیں ان کی نسل مخلوط ہو گئی ہے۔ اور نتیجے کے طور پر آج ہم کو ہاشمی نوجوانوں میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی بے مثل قربانی کی کوئی نشانی نظر نہیں آتی. نہ ہی ان میں حضرت امام حسن علیہ السلام کی سطوت وسخاوت یا حضرت مولائے کائنات مشکل کشا علی علیہ السلام کی شجاعت وحیا کی کوئی جھلک موجود ہے۔ فی الحقیقت اس کی بنیادی وجہ محض یہی ہے کہ یہ حضرات اپنی اصل ونسل کا خیال رکھتے۔

ستم بالائے ستم جن علمائے کرام نے سادات عظام کو صدقہ قبول کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور اسے جائز ثابت کیا ہے انہوں نے اہل سادات سے کوئی دوستی نہیں کی ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے آل رسول ﷺ کو اس عقیدے کا پابند بنا دیا ہے کہ سب مسلمان بلا تفریق ایک جیسے ہیں. اور صرف عمل کی ضرورت ہے۔ نیز ہر مسلمان عورت سے نکاح بھی جائز ہے تو انہوں نے بھی اہل سادات پر کم ظلم نہیں کیا.

میرے نزدیک یہ کلیہ صرف اہل سادات تک محدود نہیں کہ گویا صرف سادات ہی اپنی نسل کو خالص رکھنے کا اہتمام کریں. بلکہ ہر ایک قوم کا یہ فطری وظیفہ ہے کہ بہ ہر قیمت اپنی نسل کو خلط ملط سے محفوظ رکھے۔ میرے اس عندیئے کا ثبوت بھی اسی آیت میں موجود ہے:۔ (**انا جعلنکم شعوبا وقبائل للتعارفوا ان اکرمکم عند الله اتقکم**) ''یعنی کیا ہم نے تم کو کنبے کنبے

اور قبیلے قبیلے کہ ایک دوسرے کو پہچانو (برائے معرفت) اور تم میں سے اللہ کے نزدیک عزت والا وہ ہے جو متقی ہو''۔

ایت ''ان اکرمکم'' کی تشریح:۔

اس آیت مبارکہ میں دو امور قابل غور ہیں۔ اولاً یہ کہ واضح طور پر منشائے الٰہی عزوجل یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو مختلف اقوام وقبائل میں منقسم فرمادیا۔ ثانیاً یہ کہ نسل انسانی میں سب سے زیادہ معزز شخص وہ ہے جو متقی ہو۔ اب یہاں پر اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب تک دنیا آباد رہے گی تو لامحالہ مختلف اقوام وملل بھی موجود ہوں گی۔ اور عین منشائے ایزدتعالیٰ وتبارک کے مطابق ہوگا۔ اس لئے کہ مختلف اقوام وملل کو پیدا فرمانے اور ان کی تخصیص فرمانے میں جو منشاء اور علت غائی کارفرما ہے وہ بلاشبہ معرفت (پہچان) ہے اور اقوام وملل کی آپس میں معرفت (پہچان) اس وقت ممکن ہوگی۔ جبکہ ہر قوم وملت اپنا مخصوص رنگ اور انفرادی خصوصیت رکھتی ہو۔ بالفاظ دیگر سید۔۔ سید ہوگا۔۔ پختون۔۔ پختون ہوگا۔ اور ترک۔ بہر حال ترک ہوگا۔

معرفت (پہچان):۔

اب جہاں تک ''معرفت'' کا تعلق ہے تو یہ ایک ایسا لفظ ہے۔ جس کی تعبیر ہم کئی طرح سے کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کی اصل اور حقیقی تعبیر یقیناً ارتقاء ہے۔ کیونکہ تہذیب وتمدن کی ترقی کا ضامن اقوام وملل کا اختلاف نسل اور رنگارنگی ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری کوئی چیز ایسی نہیں جو ارتقاء کے لئے اس سے بڑھ کر ضروری اور کارآمد ہو۔ غور فرمائیے۔ کہ اگر حق سبحانہ وتعالیٰ صرف ایک ہی ملت پیدا فرماتا اور ساتھ ہی اس ملت کے تمام افراد کے خیالات وعقائد، روایات و نفسیات وغیرہ بھی کچھ ایک جیسے ہوتے تو شبہ نہیں رہتا کہ علمی وذہنی، معاشرتی وتمدنی امور کی ترقی کسی شکل میں بھی ممکن نہ ہوتی۔ اس لئے کہ زندگی منفی ومثبت طاقتوں کی آمیزش کی وجہ سے قائم ہے۔ دیکھئے۔ اگر تخم کا دانہ فنائیت قبول نہ کرتا تو اس کے دوبارہ اگنے کا سرے سے سوال ہی پیدا ہی نہ ہوتا۔ ظاہر ہے ایک منفی طاقت دانے کو فنا کرنے کے سلسلے میں برسرپیکار ہوتی ہے۔ لیکن دوسری جانب ایک مثبت طاقت بھی دانے کی بقا کے لئے باقاعدہ طور پر جدوجہد کرتی ہے ان دونوں طاقتوں کی ٹکراؤ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ صرف ایک ہی دانے سے کئی گنا زیادہ دانے پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن مخفی نہ رہے کہ قانون فطرت کے تقاضے کے مطابق ہر انفرادی نوعیت کا تخم اپنی مخصوص نوعیت کے دانے پیدا کرے گا۔ گندم کے دانے سے گندم اور جو کے دانے سے جو پیدا ہوگا۔ اور یہی سران کی زیادت پیداوار میں پنہاں ہے۔

بعینہٖ اسی طرح دنیا میں مختلف اقوام کا ایک دوسرے سے تعلقات استوار کرنا نئے نئے تقاضوں کو جنم دیتا ہے۔ جن میں آئے دن ترقی ہوتی رہتی ہے۔ البتہ یہ بات الگ ہے کہ وہ ترقی دین و مذہب کے خلاف ہو یا بصورت دیگر عین اس کے مطابق ہو۔ لیکن ترقی بہر حال جاری رہتی ہے۔ ہاں اگر یہ ترقی دین و مذہب کے مطابق ہو رہی ہو تو امن و امان اور پورے اطمینان سے ہو سکتی ہے۔

متقی اور معزز:۔

اب اس آیت مبارکہ کے دوسرے حصے کو لیجئے۔ یعنی سب سے بڑا معزز شخص وہ ہے جو متقی ہو۔ تو اس کا ایک مطلب تو بالکل واضح ہے کہ اصطلاحاً ہر وہ شخص متقی ہو گا۔ جس کے اعمال اچھے ہوں گے۔ خواہ وہ کسی نسل یا کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ مطلب یہ کہ ایک پختون محض اس بنا پر معزز کہلانے کا مستحق نہیں کہ وہ پختون ہے بلکہ نیک اور پسندیدہ اعمال و خصائل کی وجہ سے اپنے آپ کو نیک سمجھ سکتا ہے۔ اور معزز کہلایا جا سکتا ہے۔ بہر کیف اس موقع پر آیت مبارک کا اصلی مطلب کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ یہ تو ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔ اور ہر شخص اس بات کو بخوبی جان سکتا ہے۔ کہ ہر وہ شخص جس کے اعمال اچھے ہوں گے تو نیک کہلایا جائے گا۔ مگر یاد رہے کہ یہاں پر بات یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں مختلف اقوام و عمل کے معرض وجود میں لانے اور تخلیق فرمانے کا تذکرہ ہے۔ اور مندرجہ بالا سطور میں ہم نے صراحت کے ساتھ واضح کر دیا ہے۔ کہ اس اختلاف میں کونسی حکمت بالغہ کارفرما تھی؟ ان حقائق کی روشنی میں لازمی ہے۔ کہ لفظ متقی کے لغوی معنے ''ڈرنے والا'' اور ''جان بچانے والا'' کر لئے جائیں تو مفہوم یہ ہو جائے گا۔ کہ زیادہ معزز وہ ہے جو اپنی نسل کو مخلوط کرانے سے محفوظ رکھتا ہو۔ اور اس سے ڈرتا بھی ہو۔ اس لئے کہ ایسا کرنا منشائے ایزدی عزوجل کے خلاف ہو گا۔ لہذا بڑی بزرگی والا اور زیادہ معزز شخص۔ قوم یا ملت وہ ہے جو اپنی روایات تو نفسیات، عادات و اطوار اور خون و رشتہ کسی دوسری قوم میں فنا نہ کر دے۔ اس وجہ سے کہ جیسے مندرجہ بالا سطور میں وضاحت کی گئی۔ کہ مختلف اقوام کا وجود (یا تخلیق) عین منشائے ایزد تعالیٰ و تبارک کے مطابق ہے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ منشائے الٰہی کے مطابق عمل کرنے کا دوسرا نام تقویٰ ہے۔ اور جو کوئی اس کے خلاف کرے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ منشائے ایزد تعالیٰ و تبارک کے خلاف ہو گا۔ اور صاف طور پر مجرم ہو گا۔ اس لئے کہ حیات انسانی کی ترقی کے لئے اقوام مختلفہ کا وجود لازمی اور لابدی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ تو مذہب ترقی کر سکتا ہے اور نہ ہی تمدن پروان چڑھ سکتا ہے۔ اسی بنا پر حقیقی معزز وہ ہو گا۔ جو حق سبحانہ و تعالیٰ کے اس بنیادی قانون کی رعایت اور حفاظت کرتا ہو۔ اور اپنے آپ کو غیر اقوام کے اختلاط سے محفوظ رکھے۔

اس مقام پر یہ مغالطہ نہ رہے کہ ایسا کرنے سے بین الاقوامی تعصب کے جنم لینے کا کوئی احتمال ہو سکتا ہے۔ قطعی نہیں! اس لئے کہ بنی نوع انسان کے اندر جو یک جہتی اور جذبہ انسانیت موجود ہے وہ اس کے آڑے نہیں آتا. اسی طرح کسی دین نے بھی قومی محبت اور نسلی امتیاز کے جذبات کو نابود کرنے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ جذبات انسانی فطرت، رگ وریشہ اور خون میں شامل چلے آ رہے ہیں.

اب جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ تو بحمد اللہ یہ دین فطرت ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ فطری دین فطرت انسانی کے تقاضوں کو ختم نہیں کرتا البتہ ان کو اعتدال کے ساتھ زندہ رکھتا ہے. اور افراط وتفریط میں جانے سے روکتا ہے۔ غور فرمائیے کہ اگر اسلام فطری تقاضوں کو مکمل کرتا تو دین فطرت کا اعزاز کیسے پا سکتا تھا؟ مختصر یہ کہ یہ وہ فطری صفات جو حق سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو ودیعت فرمائے ہیں. ان کو نیست ونابود کرنے کے احکام کیونکر صادر فرما سکتا ہے؟ اسی لئے تو اسلام اپنی قوم سے محبت، اسکی حفاظت کرنے اور ترتیب دینے کو دین ہی کے معنوں میں لیتا ہے.

(**قل لا اسئلکم علیه اجراً الا المودة فی القربیٰ**. ''تو کہدے کہ میں نہیں مانگتا اس پر کچھ بدلہ۔ مگر دوستی قرابت میں'')

چنانچہ اپنی قوم میں زکوٰۃ کی تقسیم کا مسئلہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ البتہ ملحوظ خاطر رہے کہ اجتماعی زندگی میں قومیت کو یہ اجازت نہیں دی گئی ہے کہ وہ اجتماعی اصولوں سے متصادم ہو یا ان سے کسی قسم کے اختلاف کا اظہار کرے۔ غرض یہ کہ جہاں کہیں بھی قومی اصول یا روایات اسلامی تقاضوں کے خلاف ہوں ان کا ترک کرنا لازمی ہوگا. اور جہاں اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں تو عین دین کا جزو سمجھا جائے گا.

بیجا نسلی اختلاط کے مضر اثرات:۔

میرے شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طوائف کی لڑکی سے نکاح نہ کرنا. نہ صرف ان کی روحانی زندگی کے لئے ضروری تھا بلکہ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی نسل مخلوط ہو جاتی۔ اور آگے چل کر یہی اختلاط ان کی اولاد کی روحانی اور اخلاقی قدروں پر بھی اثر انداز ہوتا اور نیز کم مائیگی کی بھی شکار ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح والدین کے اکثر امراض مشترک خون کی وجہ سے موروثی طور پر اولاد کو منتقل ہوتے ہیں. اسی طرح ان کے عادات واطوار بھی اولاد کو ورثے کے طور پر ملا کرتے ہیں.

(باب ۲)

تسکین قلب کی طلب

عزم کوئٹہ:۔

عبدالغفور بادشاہؒ کی وفات کے بعد حضور بادشاہ جانؒ معنوی طور پر روحانیت و معرفت کے لئے کافی حد تک تیار ہو چکے تھے۔ اب اس دیئے کو صرف روشن کرانے کی دیر تھی۔ اور یہ وہ مرحلہ تھا کہ جبکہ ان کے سینۂ اقدس میں طلب حق کا جذبہ اور عشق الٰہی کی خلش پوری طرح موجزن تھی۔ انہی مراحل میں ایک ایسا سرور انگیز جلوہ ان کے دامن اقدس کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ جس کی ضیا پاشی کو ہمارے حضور بادشاہ جانؒ خود بھی محسوس نہیں کر سکتے تھے۔ انہی ایام میں پیر عبدالسلام صاحبؒ گیلانی کی شہرت بڑی عام تھی۔ وہ کوئٹہ میں قیام رکھتے تھے۔ پیر عبدالسلام صاحبؒ پیر سید حسن عرف نقیب صاحبؒ (چار باغ افغانستان) کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور ان کی کرامتیں اور خوارق زبان زد خاص و عام تھیں۔ چنانچہ ان سے ملنے کے لئے حضور بادشاہ جانؒ نے لعل شاہ نامی ایک بالکا ہمراہ لیکر پشاور سے کوئٹہ کی طرف پیدل روانہ ہوئے۔ ٹانک وزیرستان میں پیر صابر شاہ صاحبؒ کے ہاں چند دن قیام فرمایا۔ پیر صابر شاہ صاحبؒ چار باغ کے نقیب صاحب کے خلیفہ تھے۔ اور کثیر فتوحات کے مالک مجذوب سالک تھے۔ ان کے ہاں آس پاس کے علاقے سے آئے ہوئے عقیدتمندوں کا ہجوم ہوتا۔ جن میں اکثریت فوجیوں کی ہوتی تھی۔ اور یہ لوگ پیر صاحبؒ کے انتہائی عقیدتمند تھے۔

پیر صابر شاہ صاحبؒ کی کرامتیں:۔

انہی سپاہیوں میں سے ایک عقیدتمند نے خلوص نیت سے پیر صابر شاہ صاحبؒ کی خدمت کی تھی۔ اور بعد میں پیر صاحبؒ نے سپاہی سے پوچھا تھا۔ کہ بتا تو کیا مانگتا ہے؟ سپاہی نے دست بستہ عرض کیا کہ ’’پیر صاحب! میری دلی آرزو یہ ہے کہ صوبیداری کے عہدے پر تعینات ہو جاؤں‘‘. پیر صاحب نے برجستہ فرمایا کہ ’’چلو! تم کو صوبیدار بنادیا اور چند روز نہ گزرنے پائے تھے کہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ واقعی اس سپاہی نے صوبیداری کے عہدے تک ترقی کر لی۔
دوسری بات اس سے بھی حیرت کن ہے۔ پیر صابر شاہؒ ایک شہتوت کے درخت کے نیچے تشریف فرما ہوتے تھے۔ ایک روز درخت سے شہتوتوں کے چند دانے ان کے کپڑوں پر گر پڑے۔ اس شہتوت کا پھل کالا تھا۔ چنانچہ ان کے کپڑوں پر داغ لگ گئے۔ محفل میں بیٹھے ہوئے کسی شخص نے کہا

دیا کہ پیر صاحب! آپ کے کپڑوں پر داغ لگ گئے. انہوں نے دیکھا تو واقعی کالے شہتوتوں نے کپڑوں کو خاصا داغدار بنایا تھا. پیر صاحب نے جلال میں آ کر درخت کی طرف تیز نظروں سے دیکھا اور فرمایا کہ ''درخت کا آدھا حصہ بے ثمر ہو! خدا کی قدرت تھی کہ ایسا ہو کر رہا. اور بعد از اں درخت کے آدھے حصے نے پھل نہ دیا.

پیر عبدالسلام صاحب سے ملاقات:۔

خیر! حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

''کوئٹہ کی طرف منزل طے کرنے میں فاقے بھی آئے۔ اور پیاس برداشت کرنے کی بھی نوبت آئی. پیر صابر شاہ صاحبؒ سے رخصت لیتے وقت وہ کافی دور تک ہمارے ساتھ پیدل آئے اور رخصت دیتے وقت ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں.

پشاور سے کوئٹہ تک ساری منزل چودہ پندرہ سومیل طویل تھی۔ کئی بار لعل شاہ ہمت ہار کر بیچ راستے میں بیٹھ گیا تھا. مگر پھر بھی ہمراہی خوب تھا. ہم دونوں تیس چالیس میل روز کے حساب سے سفر کرتے مختصر یہ کہ ہم کوئٹہ پہنچ گئے. اور براہ راست پیر عبدالسلام صاحبؒ کے ڈیرے چلے گئے. اندر جا کر دیکھا تو ساری جگہ پیر صاحب کے عقیدت مندوں کی کثرت تھی۔ اب یہ مشکل درپیش تھی کہ ان سے خلوت میں بات کرنا قطعی طور پر ممکن نہ تھا۔ بہر حال سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا. مگر میری دلی خواہش رہ رہ کر مجھے ستا رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کاش! پیر صاحب تنہا ملتے تو کیا خوب ہوتا. میرے اس خیال کے دوران ہی انہوں نے میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور پھر اپنا سر سینۂ مبارک کی طرف جھکا دیا. ان کی اس توجہ کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑی دیر میں عقیدت مندوں کا سارا مجمع دربار سے نکل گیا. اور صرف ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ اس لمحہ جب میں نے پیر صاحبؒ کی طرف دیکھا تو ان کا جسم مبارک انتہائی درجے تک لطیف ہو گیا تھا. اس وقت میرے حواس بجا تھے اور میں کامل یقین سے کہتا ہوں کہ ان کا سینۂ مبارک اس حد تک لطیف و شفاف ہو گیا تھا. کہ اس کے آر پار مجھے سامنے والی دیوار صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت انہوں نے میری طرف دیکھا. اور مسکرائے۔ پھر فرمایا کہ ''کہو جوان! تم کیا کہتے ہو''؟ میں نے عرض کیا'' کچھ نہیں پیر صاحب! یوں ہی سلام عرض کرنے کی خاطر حاضر ہوا تھا'' اس کے بعد وہ بھی خاموش اور میں بھی چپ! خاموشی کے اس مختصر وقفے کے بعد یکایک مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوئے ''جوان! اگر تمہاری کوئی دلی مراد ہو تو کہہ سکتے ہو'' اس مرتبہ بھی میں نے وہی جواب دیا۔ تب انہوں نے فرمایا. کہ ''بہتر ہے اب جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ'' میرا اپنی جگہ پر بیٹھنا تھا کہ ساری خلقت دوبارہ اندر آ گئی. اور دربار میں بھیڑ بھاڑ نظر آنے لگی''.

گویا اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ پیر عبد السلام صاحبؒ کے پاس حضور بادشاہ جانؒ کا کوئی حصہ نہ تھا. چنانچہ وہ کوئٹہ کی سیر کرنے میں مصروف ہو گئے. گھومے پھرے اور چند دنوں کے بعد پشاور تشریف لے گئے.

سید حسن نقیب صاحب (افغانستان) کے ہاں حاضری:۔

حضور بادشاہ جانؒ کے قلب مبارک میں طلب کا جذبہ انتہائی عروج پر تھا. اور طلب کے اسی بے پناہ جذبے نے اضطراب کی شکل اختیار کی۔ بیقراری کے انہی ایام میں انہوں نے پیر عبد السلامؒ کے برادر بزرگ اور مرشد جناب سید حسن نقیب صاحبؒ سے ملاقات کرنے کے لئے چار باغ (افغانستان) جانے کا ارادہ فرمالیا. اور اس سلسلے میں افغانستان روانہ ہو گئے. میرے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ۔ ''لنڈی کوتل پہنچ کر تھوڑا سا دم لیا. اور پھر آگے روانہ ہو گیا. طورخم سے نکل کر کچھ ہی فاصلے پر افغان حکومت کی ایک چوکی تھی۔ جس کو'' سات کنوں والی چوکی'' کہا کرتے تھے (اب یہ تھانہ موجود نہیں) یہاں پر افغانستان کے خاصہ داروں نے روک کر چوکی روانہ کر دیا. اندر لے جا کر ان کے حوالدار نے مجھ سے کہا کہ'' تم کہاں جاؤ گے؟ میں نے کہا کہ'' پیر سید حسن نقیب صاحبؒ کے ہاں افغانستان جا رہا ہوں'' حوالدار نے مجھے تلے اوپر دیکھا. اور مسکراتے ہوئے دریافت کیا کہ'' تم سید ہو؟'' اور میں نے اثبات میں جواب دے دیا تھوڑی دیر فکر کرنے کے بعد وہ پھر بولا کہ خیر! کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم آگے جانے کی اجازت دے دینگے. لیکن ایک شرط پر! اور وہ یہ کہ دوسرے لوگوں سے تو ہم'' سر کی سلامتی'' کی فیس طلب کرتے ہیں اور تم ٹھہرے سید! تو خوب تر یہ ہوگا کہ تم سے صرف'' تبرک'' وصول کرنے پر اکتفا کر لیں. اب میری باری تھی۔ تو میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ'' حوالدار صاحب! تب تو یہ بڑی آسان بات ہے اور میرے خیال میں اس کی معقول ترین صورت یہ ہے کہ'' لاؤ تم کچھ رقم ہمیں پیش کر دو. ہم انتہائی خوشی کے ساتھ اس رقم کو اپنے دست ہائے مبارک سے مس فرمالیں گے۔ تبرک تیار ہو جائے گا. اس کے بعد کچھ رقم ہمارے حوالے کی جائے۔ مابقایا'' تبرک'' کو آپ لوگ'' بحسب مراتب'' آپس میں تقسیم کر لیں. یہ سنتے ہی حوالدار کھلکھلا کر ہنس پڑا. اور بولا کہ'' نہیں شاہ صاحب! یہ تو ان ہونی بات ہوئی. ایسا کب ہو سکتا ہے؟'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا. کہ'' اگر تمہاری طرف سے ایسا نہیں ہو سکتا تو اس جانب سے بھی مجبوری ہے۔ یہ سن کر حوالدار نے نہایت شفقت سے مشورہ دیا۔ کہ'' بادشاہ صاحب! تکلیف تو تمہیں ضرور ہوگی. مگر لنڈی کوتل زیادہ دور بھی نہیں. واپس چلے جاؤ. اور انشاء اللہ بخیر و عافیت جلد پہنچ جاؤ گے. میں نے کہا۔ کہ'' میں پختہ ارادے کے ساتھ کابل جانے کے لئے نکل آیا ہوں۔ سڑک کے ذریعے نہ سہی پہاڑی راستوں کو قطع کر کے چلا جاؤں گا.

مگر کابل پہنچ کر ہی دم لوں گا۔ یہ کہہ کر واپس مڑ گیا۔ اور دربند کے راستے شنواریوں کے علاقے میں داخل ہو گیا ادھر جلال آباد میں کئی لوگ میرے منتظر تھے۔ بات یہ تھی کہ وہ حوالدار جس نے مجھے روک کر واپس لوٹا دیا تھا۔ ان کی چوکی سے میرے چلے جانے کا ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا ہوگا۔ کہ حوالدار اپنی چوکی کے قریب رائفل کی نالی پر ٹھوڑی رکھ کر کھڑا تھا۔ یکا یک ایک دھماکے کے ساتھ بندوق چل گئی۔ اور حوالدار کی کھوپڑی پرزے پرزے ہو کر بکھر گئی۔ تعجب کی بات تو یہ تھی۔ کہ حوالدار کو قطعی طور پر یہ علم ہی نہ تھا۔ کہ رائفل کے اندر گولی موجود ہے۔ یہ احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔ کہ کسی دوسرے شخص نے ٹریگر دبایا ہو۔ اس لئے کہ اس وقت کوئی دوسرا آدمی اس کے قریب موجود نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ بات کرامت کے زمرے میں آ گئی۔ اور دو دنوں کے اندر ہی اس کی شہرت سارے علاقہ ننگرہار میں پھیل گئی۔ وہاں کے لوگوں نے مجھے ''فائیر والا بادشاہ'' کے نام سے مشہور کر دیا۔ مگر جونہی میں جلال آباد پہنچا تو لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کہ ''واہ! فائر والا بادشاہ یہ ہوتا ہے؟ حیرت ہے کہ یہ کیسا بادشاہ ہے۔ کیونکہ نہ تو طویل و عریض جبہ و قبا زیب تن ہے۔ نہ ہی بھاری بھرکم عمامہ و دستار رکھتا ہے۔ ریش مبارک بھی لحیم و شحیم نہیں اور ذرا ملاحظہ ہو رخ انور بھی نہیں رکھتا۔ واہ صاحب! ہم تو کچھ سمجھتے تھے اور یہ کچھ اور نکلے۔ بس! یہ تو عام مزدور پیشہ لوگوں کی طرح ایک سیدھا سادہ سا آدمی ہے۔ اور کچھ نہیں'' چنانچہ لوگوں کی ساری عقیدتمندی اور ساری دلچسپی عنقا ہو گئی۔ اور چونکہ میں نے چار باغ جانا تھا۔ اس لئے جلال آباد سے نکل کر اسی طرف روانہ ہو گیا۔ بارے چار باغ پہنچ گیا۔ اور جناب نقیب صاحبؒ کے ہاں حاضری بھی دی۔ لیکن وہاں پر بیعت لینے کا یہ دستور تھا کہ نقیب صاحبؒ کے خلیفہ لوگوں کو باری باری ان کی خدمت میں پیش کرتے۔ میں نے بھی خلیفہ سے کہہ دیا کہ ''صاحب! میری درخواست بھی نقیب صاحب تک پہنچا دو۔ مگر وہ آج اور کل میں بات کو طول دے رہا تھا۔ اس ٹال مٹول میں چھ سات دن گزر گئے۔ ظاہر ہے کہ مجھے کوفت بھی ہو رہی تھی۔ اور خلیفہ کے امروز و فردا پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ لہٰذا خلیفہ کو درمیان میں لائے بغیر میں نے یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ دیکھو میں کیسے نقیب صاحبؒ سے ملتا ہوں۔ چنانچہ جس باغ میں نقیب صاحب صبح سویرے تشریف فرما ہوتے تھے کسی سے اجازت لئے بغیر میں اسی باغ کی طرف چل دیا۔ خلیفہ کی نظر پڑی تو دور سے چلایا کہ ''خبردار! رک جاؤ۔ کیا مجال اگر ایک قدم بھی اجازت آگے بڑھایا'' میں نے خلیفہ کو کچھ برا بھلا کہا۔ اور اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ ادھر باغ کے اندر نقیب صاحبؒ نے میری سخت باتیں سماعت فرمائی تھیں۔ چنانچہ وہ بھی ہماری طرف روانہ ہو گئے۔ اور راستہ میں مجھ سے مل گئے۔ فرمایا کہ ''جوان بخیر! نیت درست کرلو یہ کیا ماجرا تھا؟'' میں نے عرض کیا کہ ''حضور! کتے کی قسم کا یہ کیسا خلیفہ مقرر فرمایا ہے یہاں آئے ہوئے مجھے ایک ہفتہ ہو گیا۔ مگر آپ کے روبرو پیش کرنے میں حیل و حجت سے کام لے رہا ہے'' خیر نقیب صاحبؒ مجھے ساتھ لے گئے۔ اور

ایک تخت پر تشریف رکھتے ہوئے مجھے بھی بیٹھ جانے کا ارشاد فرمایا. اس کے بعد میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر فرمایا۔ کہ "جوان! میرے پاس یہ غوث الاعظم (قدس سرہٗ) کا ہاتھ ہے۔ میری طرف سے تم قادری سلسلہ میں خلیفہ ہو۔ یہ لو ہمارے تمام اشغال واذکار اور انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ. مابقایا ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں. کیونکہ ہم ایک ہی جد بزرگوار کی اولاد ہیں. اب تم رخصت ہو۔ بس اچھے اعمال کا اہتمام کرو. اور برے افعال سے پرہیز رکھو. حق تعالیٰ تمہیں استقامت نصیب فرمائے۔ اب جاسکتے ہو بامانِ خدا".

دوبارہ ورود افغانستان:۔

جناب نقیب صاحبؒ (چار باغ) سے رخصت ہو کر حضور بادشاہ جان صاحبؒ ہندوستان کی طرف تشریف لے گئے. اور ٹھیکیداری کا کام شروع فرمایا. اسی دوران میں نقیب صاحبؒ کے عنایت کردہ اسباق میں بھی ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اور تھوڑے عرصہ کے اندر جملہ اسباق کو ختم کر دیا مگر پوری تسلی اور مکمل اطمینان قلب نصیب نہ ہوا. اسی لئے دوبارہ افغانستان جانے کا ارادہ فرمالیا. کابل پہنچے تو یہاں اچانک ہی ہیضے کی وباء پھیل گئی اور لوگ سراسیمگی کی حالت میں شہر سے جوق در جوق نکل کر ادہر ادھر بھاگ رہے تھے".

تلون وساوس کا دور:۔

حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ۔

"خود میری اپنی حالت یہ تھی کہ ہیضے کی ہیبت سے سخت خوفزدہ تھا. ویسے بھی ان دنوں میں تلون اور وساوس کے ہولناک دور سے گزر رہا تھا. اسی بناء پر میں نے کابل سے نکل کر دوسری طرف کا رخ کر لیا. زیریں علاقہ میں جگ دلک پہنچا تو خاصی رات ہو گئی تھی۔ چنانچہ ایک مسجد میں جا کر سو گیا. صبح اٹھا تو لوگ ہیضے کی باتیں کر رہے تھے۔ اور میں نے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ فلاں شخص ہیضے سے فوت ہو گیا. اس بات کے سنتے ہی مجھ پر دہشت چھا گئی۔ اور سخت خوفزدہ ہو گیا. اور نماز فجر ادا کرتے ہی جگ دلک سے بھی بھاگا. غرض یہ کہ ہزار تاؤ تک جاتے ہوئے جس مقام پر رات گزارنے کے لئے رکا ہوں گا. تو متواتر ہیضے سے جان تلفی کے واقعات سنے ہیں اور ساتھ ہی میرے خوف میں بھی اضافہ ہوا ہے".

واہمہ کی زود حسی:۔

میں کہتا ہوں کہ ان دنوں حضور بادشاہ جانؒ اس دور سے گزر رہے تھے۔ جبکہ سالک کا برزخ بن رہا ہوتا ہے۔ اور لحہ بہ لمحہ اس کی روح لطافت کی طرف مائل ہوتی رہتی ہے۔ جس قدر روح لطافت کی طرف مائل ہو رہی ہو۔ اسی قدر مادی کثافتوں سے چھٹکارا حاصل ہوتا رہتا ہے۔ اس مرحلہ میں واہمہ کی زود حسی بھی درجہ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ابتدائی طور پر حیوانیت (مادیت) انسانیت اور ملکیت (روحانیت) پر غالب ہوتی ہے۔ لیکن جس وقت حیوانیت مجاہدہ کے شکنجہ میں گھیرالی جاتی۔ تو اس کی قوت مدافعت بھی حد درجہ تیز ہو جاتی ہے۔ اور اسی مدافعت کا ردعمل ہی خوف اور وہم جیسی بلاؤں کو جنم دیتی ہے۔ اسی حالت میں اکثر اوقات بعض سالک جذب سے مغلوب ہو کر مجذوب ہو جاتے ہیں۔ ان کی حرکات وسکنات میں باقاعدگی نہیں رہتی۔ اور گفتگو میں بھی ربط اور معنوی تسلسل نہیں رہتا۔ لیکن اگر سالک قوی دماغ۔ جوان حوصلہ اور بلند افکار رکھتا ہو۔ اور اس پر مستزاد صاحب توجہ اور کامل مرشد بھی رکھتا ہو۔ تو یہی کامل مرشد اپنے مرید کو مجذوب ہونے نہیں دیتا۔ مزید برآں ایک حقیقی سالک اور صحیح طالب حق کی سب سے بڑی نشانی یہی ہے کہ اسے اپنی منزل میں طوعاً کرھاً ایسے ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جن میں خوف اور وہم کا غلبہ ہوگا۔ (الا ماشاءاللہ) گویا دوسرے الفاظ میں طالب حق اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی طرف سے زیر تربیت ہوتا ہے۔

میرے خوف کی مثال:۔

1933ء میں جبکہ میں خود خوف اور وسواس کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ تو جہاں کہیں بھی میں جاتا تو شدت خوف کی وجہ سے اختلاج قلب کے شدید دورے شروع ہو جاتے۔ اسی دوران میں اگر کہیں سے کوئی جنازہ نظر آتا یا کسی سے کسی دوسرے شخص کے فوت ہونے کا تذکرہ سنتا۔ تو میں اس قدر سہم جاتا کہ یک لخت میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور دل اس زور سے دھڑکنا شروع ہو جاتا کہ مجھے یقین ہو جاتا کہ ابھی چند ہی لمحوں میں حرکت قلب مکمل طور پر بند ہو جائے گی۔ اندریں اثناء میرا بدن ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ انہی دنوں میں اجمیر شریف میں تھا۔ اور دو مہینے گویا عالم نزع کی سی کیفیت میں گزارے تھے۔ سکون خاطر کے لئے میں حضرات خواجہ خواجگان غریب النواز معین الدین حسن چشتی اجمیریؒ کے روضہ اطہر کا رخ کرتا۔ اور اگر اتفاقاً دور سے لوگوں کو جنازہ اٹھائے ہوئے دیکھتا تو فوراً الٹے پاؤں بھاگ کر اپنے ڈیرے میں دم لیتا۔ اجمیر شریف میں یہ قاعدہ ہے کہ اکثر وبیشتر نماز جنازہ درگاہ میں ادا کی جاتی ہے۔ اور شاذ ہی کوئی

واہمہ کی زود حسی:۔

میں کہتا ہوں کہ ان دنوں حضور بادشاہ جانؒ اس دور سے گزر رہے تھے۔ جبکہ سالک کا برزخ بن رہا ہوتا ہے۔ اور لحہ بہ لحہ اس کی روح لطافت کی طرف مائل ہوتی رہتی ہے۔ جس قدر روح لطافت کی طرف مائل ہو رہی ہو. اسی قدر مادی کثافتوں سے چھٹکارا حاصل ہوتا رہتا ہے۔ اس مرحلہ میں واہمہ کی زود حسی بھی درجہ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ابتدائی طور پر حیوانیت (مادیت) انسانیت اور ملکیت (روحانیت) پر غالب ہوتی ہے۔ لیکن جس وقت حیوانیت مجاہدہ کے شکنجہ میں گھیرالی جاتی۔ تو اس کی قوت مدافعت بھی حد درجہ تیز ہو جاتی ہے۔ اور اسی مدافعت کا ردعمل ہی خوف اور وہم جیسی بلاؤں کو جنم دیتی ہے۔ اسی حالت میں اکثر اوقات بعض سالک جذب سے مغلوب ہو کر مجذوب ہو جاتے ہیں. ان کی حرکات وسکنات میں باقاعدگی نہیں رہتی. اور گفتگو میں بھی ربط اور معنوی تسلسل نہیں رہتا. لیکن اگر سالک قوی دماغ. جوان حوصلہ اور بلند افکار رکھتا ہو. اور اس پر مستزاد صاحب توجہ اور کامل مرشد بھی رکھتا ہو تو یہی کامل مرشد اپنے مرید کو مجذوب ہونے نہیں دیتا. مزید برآں ایک حقیقی سالک اور صحیح طالب حق کی سب سے بڑی نشانی یہی ہے کہ اسے اپنی منزل میں طوعاً و کرھاً ایسے ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا. جن میں خوف اور وہم کا غلبہ ہوگا. (الا ماشاء اللہ) گویا دوسرے الفاظ میں طالب حق اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی طرف سے زیر تربیت ہوتا ہے۔

میرے خوف کی مثال:۔

1933ء میں جبکہ میں خود خوف اور وسواس کے مراحل سے گزر رہا تھا تو جہاں کہیں بھی میں جاتا تو شدت خوف کی وجہ سے اختلاج قلب کے شدید دورے شروع ہو جاتے۔ اسی دوران میں اگر کہیں سے کوئی جنازہ نظر آتا یا کسی سے کسی دوسرے شخص کے فوت ہونے کا تذکرہ سنتا تو میں اس قدر سہم جاتا کہ یک لخت میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور دل اس زور سے دھڑکنا شروع ہو جاتا کہ مجھے یقین ہو جاتا کہ ابھی چند ہی لمحوں میں حرکت قلب مکمل طور پر بند ہو جائے گی. اندریں اثناء میرا بدن ٹھنڈے پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ انہی دنوں میں اجمیر شریف میں تھا. اور دو مہینے گویا عالم نزع کی سی کیفیت میں گزارے تھے۔ سکون خاطر کے لئے میں حضرات خواجہ خواجگان غریب النواز معین الدین حسن چشتی اجمیریؒ کے روضۂ اطہر کا رخ کرتا. اور اگر اتفاقاً دور سے لوگوں کو جنازہ اٹھائے ہوئے دیکھتا تو فوراً الٹے پاؤں بھاگ کر اپنے ڈیرے میں دم لیتا. اجمیر شریف میں یہ قاعدہ ہے کہ اکثر و بیشتر نماز جنازہ درگاہ میں ادا کی جاتی ہے۔ اور شاذ ہی کوئی

ایسادن ہوگا جس میں آٹھ یا دس جنازے نہ لائے جاتے ہوں۔

خوف کے علاج کا ایک طریقہ:۔

جہاں تک مذکورہ بالا خوف کا تعلق ہے۔ تو یہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ اولاً یہ سالک کا مرشد اگر بقید حیات ہو. اور بشرطیکہ وہ اپنے صوابدید سے مناسب سمجھے کہ اب سالک کا خوف اور وہم انتہا تک پہنچ گیا ہے. تو بتدریج توجہ دینا شروع کر دیتا ہے اس طرف سالک کے خوف اور وہم میں بھی کمی آتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں رمز یہ ہے کہ توجہ کی وساطت سے طالب حق کے دل میں حق سبحانہ وتعالیٰ یا رسول کریم ﷺ یا اپنے مرشد کامل سے انس ومحبت کی روح پرور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسی محبت کا لازمی اثر یہ ہوتا ہے کہ خوف بحیثیت کلی ختم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ خوف مغلوب اور محبت غالب آ جاتی ہے۔ اسی مقام میں سالک کا برزخ کشفی صورتوں کا ادراک بھی کرنے لگ جاتا ہے۔ تاہم اس کا برزخ ابھی پختہ نہیں ہوتا. البتہ جوں جوں برزخ میں پختگی آتی جاتی ہے توں توں واردات کے انعکاس کو قبول کرنے میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

خوف کے علاج کا دوسرا طریقہ:۔

خوف کے علاج کی دوسری قسم یہ ہیکہ اگر سالک کا مرشد فوت ہو گیا ہو۔ یا زندہ ہو مگر سوء اتفاق سے اتنی طاقتور توجہ کا مالک نہ ہو کہ اپنے طالب کو خوف اور وہم کے انتہائی مقام سے واپس لوٹا سکے۔ تو اس صورت میں اگر سالک کی اپنی ذاتی استعداد روشن اور بلند پایہ ہو تو خوف اور وہم کے غلبے کی حالت میں اس کی اپنی طبیعت اور ارادہ (جن پر قبل ازیں مضمحل اور مردہ ہونے کا اطلاق ہوتا تھا) یکایک کروٹ لیکر از سر نو زندہ ہو جاتے ہیں اور سالک خوف اور وہم کا بھرپور مقابلہ کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس قسم کے خوف اور وہم کی نوعیت بس خیالی ہوتی ہے۔ اور حقیقتاً اس کی بنیادی پشتی یہی طبیعت کی کمزوری ہوتی ہے۔ مگر جونہی طبیعت ارادے کا ساتھ دینا شروع کر دیتی ہے۔ اور مقابلے پر اتر آتی ہے تو خوف اور وہم شکست کھا کر پسپا ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں نفس ناطقہ کچھ ایسی فرحت آمیز اور سرور انگیز خوشی محسوس کرتا ہے۔ جس کی مکمل تشریح اور پوری تفصیل سے زبان قلم لاچار ہے۔

جذب کی حالت میں بھی خوف کا خاتمہ ہو جاتا ہے:۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ سالک کے ارادے اور طبیعت پر خوف اور وہم اس حد تک غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ کہ وہ مجذوب ہو جاتا ہے۔ اس حال میں بھی خوف اور وہم کا خاتمہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ ان دونوں کا غلبہ باقی تمام حواس کو بھی مغلوب کر لیتا ہے۔ اور جذب کی کیفیت سالک کو صرف ایک ہی خیال میں محو کرا دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وحدت خیال کی کیفیت میں نہ تو خوف اور نہ ہی وہم باقی رہ سکتا ہے۔ چنانچہ ایسے لوگوں میں مجذوب محض کی تعداد زیادہ ہوا کرتی ہے۔ جس کا بیان ہم گذشتہ اوراق میں کر آئے ہیں۔

واہمے کے متعلق لوگوں کی غلط فہمی کا ازالہ:۔

لوگوں کی اکثریت واہمے کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ان کے نزدیک وہم ایک مضر مرض اور بدترین چیز ہے۔ لیکن حقیقت حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ جس نوعیت کے وہ میں سالک مبتلا ہوتا ہے۔ اس قسم کے وہم کا اس وہم سے کوئی رشتہ یا علاقہ نہیں ہوتا. جو سوداوی مادے کے غلبے سے بیماری کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ وہم حقیقت میں وہم کی خرابی نہیں ہوتی بلکہ شدت علالت کی حالت میں واہمہ مرض کو دور کرنے اور ہٹا لینے کے لئے طرح طرح کی تجاویز بنا کر عقل کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اور واہمے کا فرض منصبی بھی یہی ہے۔ کہ جس وقت انسان پر کچھ وارد ہو جائے. اور حواس ان واردات کو قبول کر لیں۔ تو وہ ان کو واہمہ کے سپرد کر دیتے ہیں. مگر واہمہ دیگر حواس (سامعہ، شامہ اور ذائقہ کی طرح اشکال نہیں بلکہ تسہیل یا بہ الفاظ دیگر معنی پیش کرتا ہے۔ یعنی حواس کی تمام اشکالات کو معنوی صورت دے کر عقل کے سامنے پیش کرتا ہے۔ پھر یہ کام عقل کا ہوتا ہے۔ کہ ان کو قبولیت بخشے یا انہیں رد کر دے تاہم واہمہ بہر حال مصروف کار رہتا ہے۔ دراصل واہمہ عقل کا غلاف ہے۔ لہذا یہ سمجھ لینا کہ اسکا ہر نظریہ غلط ہوگا کسی صورت میں درست نہیں.
فرض کیجئے۔ اگر عقل واہمہ کا کوئی نظریہ یا تجویز مان لے تو پھر ہم اس کو محض وہمی نظریہ نہیں کہیں گے. گویا ہم وہم اور جنون کو ایک ہی چیز کے دو نام سمجھتے ہیں. حالانکہ ایسا سمجھ لینا غلطی ہے۔ بات یہ ہے کہ واہمہ ہر حال میں حواس کے جزوی ادراکات سے ایک معنوی ڈھانچہ تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح اس کا ہر نظریہ جاسوسی کرنے والے حواس کی لائی ہوئی جزوی چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ واہمہ ان کو عقل کے حضور میں اس پیرائے میں پیش کر دے۔ کہ عقل انہیں قبول نہ کرے. اور ان کی تردید کر دے.

اسی طرح سالکوں کا واہمہ ہوتا ہے۔اور جس قدر بھی کسی سالک کا واہمہ شدید طور پر زیادہ ہوا اسی قدر اس کی منزل بھی بڑی عالیشان اور اہمیت کی حامل ہوگی. اس لئے کہ سالک کی فطرت میں علوم کا گنجینہ پنہاں ہوتا ہے۔اور جب تک لازمی طور پر خوف اور وہم کے عفریت سے پوری طرح گو شمالی نہ کھائے اس وقت تک اس کی فطرت میں پنہاں اسرار اور علوم کے نمایاں طور پر آشکارا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.

عام مشاہدہ ہے کہ اگر کسی مقام میں خواہ کسی بھی مقدار میں خزانہ موجود ہو تو ظاہر ہے کہ اس قدر اس کے لٹ جانے کا بھی خطرہ لاحق رہے گا. اسی طرح سالک کی عقل بھی ہمیشہ کے لئے انہی وہمی نظریات کے ردوکد میں مصروف ہوتی ہے۔اور بالآخر اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے۔کہ اس کی عقلی قوت میں اس حد تک اضافہ ہو جاتا ہے کہ کسی انجان شخص کو صرف ایک نظر دیکھنے سے بھی اس کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکتا ہے. مدعا یہ کہ اس وقت سالک میں کشفی نظر کی قوت آجاتی ہے۔اور دریں اثناء بعض ایسے اسرار سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے جو قبل ازیں اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گے. گویا عقل جو پہلے بمنزلہ استاد تھی یہاں پہنچ کر شاگرد بن گئی. اور یہ ساری منزل فنائی الوجود سے تعلق رکھتی ہے۔

معنوی موت:۔

خوف، وہم اور خواہشات کے دوران سالک عالم ناسوت کے پنجرے سے باہر نکلنے کے لئے کوشش کرتا ہے۔اس جدوجہد میں جسم ناسوتی سے وابستہ تمام تر حواس متواتر مخالفت کرنے پر اتر آتے ہیں. اس لئے کہ ناسوتی قالب (حیوانیت) حقیقت انسانیہ پر غالب ہوتا ہے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ یہ قالب حاکم کا درجہ رکھتا ہے۔لہذا وہ کسی لمحے بھی یہ امر برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا کہ حاکمیت کے مرتبہ سے گر کر محکومیت کے زمرے میں آجائے۔اور راکب سے مرکب بن جائے۔ فی الاصل حیوانیت کی اس قسم کی مدافعت سے خوف اور وہم کے خطرات پیدا ہوتے ہیں۔اور یہی دونوں چیزیں بجا طور پر حیوانیت ہی کا سرمایہ ہوتی ہیں. اس سے آگے جس قدر بھی حیوانیت میں اضمحلال اور کمزوری آتی جاتی ہے۔ اسی قدر انسانیت پوری سعادت مندی اور تکمیل کے قریب تر ہوتی جاتی ہے۔

حیوانیت یا نفس امارہ مکمل طور پر شکست کھاتے وقت شدید طور پر مدافعت کرتی ہے۔اور اس کی مثال ہو بہو بجھتے ہوئے اس چراغ کی مانند ہوتی ہے۔جو گل ہوتے وقت تیز شعاع دکھاتے ہی دم توڑ دیتا ہے۔یہ وہ مرحلہ ہے جس میں سالک ہر لمحہ اور ہر نفس میں موت کے مقابل ہوتا رہتا ہے۔ اور روز و شب اسی خوف سے لرزاں ہوتا ہے۔لیکن حقیقت میں یہ وہ معنوی موت ہوتی ہے. جس کی

طرف خلاصۂ کائنات فخر موجودات رسول کریم ﷺ نے اس حدیث مبارک میں ارشاد فرمایا ہے۔

مُوتوا قبل ان تموتوا (یعنی موت سے قبل مر جاؤ)۔

اسی مقام پر روح انسانی مادی قید کے اندھیروں سے نکلنے کے لئے پر تول رہی ہوتی ہے۔ اور سالک کی حالت قریباً قریباً ایسی ہوتی ہے جیسے عالم نزع میں روح کی جسم خاکی سے پرواز کرتے وقت ہوتی ہے۔ اسی حالت کے دوران اگر سالک اپنے مرشد یا رسول کریم ﷺ کا تصور کر لے یا حق سبحانہ وتعالیٰ کی دنیائے رحیمیت کی طرف فرار اختیار کر لے۔ تو کبھی کبھی انس ومحبت کا ایک دلکش جھونکا آ جاتا ہے۔ تسلی کا پیغام وصول ہو جاتا ہے۔ اندھیرا فنا ہو جاتا ہے۔ اور سالک میں نئی اور تازہ روح پھونک دی جاتی ہے۔ اسی ذیل میں حضرت احمد جام قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا تھا۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زمان از غیب جان دیگر است

الغرض فرحت و شادمانی کا یہ وہ مقام ہے۔ جہاں سالک راہ حق ایسی بیمثال روحانی سرور اور پر لطف کیفیت محسوس کر لیتا ہے۔ جس کا بیان احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

سالک کے برزخ کی تیاری:۔

خوف کی کثرت کی وجہ سے مندرجہ بالا فرحت آگین کیفیت خود بخود بھی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اور اسی طرح خوف ورجا کے تسلسل سے سالک کے یقین میں پختگی آ جاتی ہے۔ لیکن بسا اوقات محبت کی یہ پر کیف شعاع مرشد کامل کی توجہ کے توسط سے وارد ہوتی ہے۔ اس لئے کہ کثرت اوہام اور شدید ترین خوف کے وقت جب طالب صادق اپنے مرشد کا تصور کر لیتا ہے۔ اور بشرطیکہ مرشد کی روحانیت کو بھی اس کا علم ہو جائے تو وہ اپنے طالب کو محبت کی توجہ دیدیتا ہے۔ اور اسی قلیل لمحے کی محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک پہلے سے بھی کئی گنا دلاور، اور چنداں بوجھ سہار لینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کبھی خوف اور کبھی محبت کی کیفیات سالک......کو بالواسطہ خوف ورجا کی شاہراہ پر گامزن کرا دیتی ہیں اور اسی عمل میں سالک کا برزخ قبض وبسط ہر دو انواع کے لئے تیار اور موزون ہو جاتا ہے۔

مولانائے رومؒ کی ایک حکایت:۔

اس ضمن میں حضرت مولانائے روم قدس سرہٗ نے بھی اپنی مثنوی میں ایک حکایت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک پہلوان نے کسی فنکار مصور کے پاس جا کر کہا۔ کہ ''میری پشت پر بھی

کوئی تصویر کاڑھ لو" فنکار نے پوچھا کہ "پہلوان! آخر کچھ تو بتاؤ. کہ تم کس چیز کی تصویر پسند کرو گے؟ پہلوان نے جواب دیا. کہ بھئی! ظاہر ہے کہ میں ایک شہزور پہلوان ہوں. لہذا اسی نسبت سے شیر کی تصویر پسند کروں گا. چنانچہ فنکار نے تصویر کاڑھنے کے لئے سوئیاں اٹھالیں. اور جونہی پہلوان کی پشت میں چھبوئیں تو مارے درد کے پہلوان چلا اٹھا. اور کہا کہ "ہائے فنکار صاحب! کیا میرے قتل کرنے کا ارادہ ہے۔؟ بتاؤ یہ شیر کا کونسا عضوء بنا رہے ہو؟ فنکار نے ہاتھ روک کر کہا کہ" شیر کے سر کی ابتدائی لکیریں کھینچ رہا ہوں" پہلوان نے یہ سن کر کہہ دیا کہ "نہیں بھائی سردست شیر کا سر بنانا چھوڑ دو۔ اور کوئی دوسرا اندام بنانا شروع کردو" اب فنکار نے دوبارہ اپنی سوئیاں سنبھال کر اس کی پیٹھ میں چھبو دیں۔ اور پہلوان دوبارہ بلبلا اٹھا. کہ "ارے فنکار! اب کیا بن رہا ہے؟ فنکار رکا. اور جواب دیتے ہوئے کہا کہ "پہلان جی! اب شیر کی ٹانگیں بنا رہا ہوں. پہلوان نے ہدایت کی کہ فی الحال ٹانگیں نہ بناؤ. کوئی اور چیز بناؤ. فنکار نے ٹانگیں بنانا بھی ترک کر دیں. اور بارِ دگر اپنی سوئیاں پہلوان کی پشت "نازک" میں پیوست کیں۔ اب کی مرتبہ پہلون چیخ اٹھا اور پوچھا کہ" بھائی! اب کیا بنا رہے ہو؟ فنکار نے کہا کہ "پہلوان اب شیر کی دم بنا رہا ہوں۔" حسب معمول پہلوان نے اس مرتبہ بھی وہی بات دہرائی کہ "نہیں صاحب! اس سے بھی بڑا درد ہوتا ہے۔ یہ نہ بناؤ کچھ اور بناؤ شہزور پہلوان کا یہ کلام سن کر مصور نے اکتاتے ہوئے تصویر بنانے کی سوئیاں زمین پر دے ماریں. اور پہلوان کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ "پہلوان جی! ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا. جو بغیر سر۔ بغیر ٹانگوں اور بغیر دم کے ہو۔"

اس کے بعد مولانائے روم قدس سرہٗ پند و نصیحت کے طور پر چند الفاظ میں مطلب بیان فرماتا ہے۔ کہ "جب تک تم اپنے آپ کو شدائد برداشت کرنے کے اہل نہ بناؤ گے. تب تک تمہارا آئینہ صاف نہ ہوگا. اور جب تک تمہارا آئینہ صاف نہ ہوگا. تو کائیناتی پرتو اور عرفانی واردات کو کیسے اور کیونکر محسوس کرسکو گے؟

دراصل اسی کو برزخ کہا جاتا ہے کہ جیسے ہی خارج سے کسی چیز کا نزول ہو تو لازمی ہے کہ اس چیز کے نزول کے ساتھ ہی وہی چیز سالک کے آئینے میں منعکس ہو جائے. اور یہی وہ نعمت ہے جسے سالک بعد میں اپنے شاگردوں کو عطا کرتا ہے یا انہیں سکھاتا ہے۔

میرے خوف کی شدت:۔

بات میرے اپنے خوف کی ہو رہی تھی۔ تو وہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا. کہ کبھی کبھی میرے پاؤں ٹھنڈے ہو کر یخ بستہ ہو جاتے. ٹھنڈا پسینہ ٹپکنے لگتا اور نوبت یہاں تک پہنچتی کہ مجھے پورا یقین ہو جاتا. کہ بس یہی میری زندگی کی آخری گھڑی ہے۔ اور کچھ دیر میں میری روح قفس عنصری سے

پرواز کر جائے گی. جب حالت یہ ہو جاتی ۔تو اسی اثناء میں میں اپنے مرشد پاکؒ کا تصور کر لیتا. بفرضِ محال اگر تکلیف کی شدت سے تصور کرنا مشکل ہوتا تو باقاعدہ طور پر چیخ و پکار شروع کر دیتا.اور آواز کی پوری بلندی سے چلا اٹھتا کہ ''یا مرشد''۔ ''یا حضور''! ''یا بے نواؒ''.

حضور بادشاہ جانؒ کی مسیحائی توجہ:۔

1933ء ہی کا ذکر ہے۔جیسے میں ذکر چکا ہوں. کہ میرا خوف انتہا تک پہنچ گیا تھا.اور میری حالت اس حد تک ابتر ہو گئی تھی ۔کہ اپنے گھر سے باہر نکلنے اور چلنے پھرنے سے قطعی طور پر رہ گیا تھا. مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ عید الفطر کی رات تھی ۔صبح عید تھی اور میری حالت زار نا گفتہ بہہ تھی ۔اسی رات کو مجھے پختہ یقین ہو گیا تھا.کہ اس جہان فانی میں یہ میری سب سے آخری رات ہے۔ تنگئ نفس کی یہ حالت تھی ۔کہ میری سانس رک رک کر کندھوں تک آ پہنچتی ۔میرے ہاتھ پاؤں سُن ہو کر ٹھنڈے ہو گئے تھے ۔رات کا بھی آخری پہر تھا.اور میں موت اور زیست کے کشمکش میں مبتلا تھا. تکلیف کے ان جان لیوا لمحات میں، میں نے حضور مرشد پاکؒ کا تصور کر لیا.تصور ٹھیک جم گیا.حضور بے نواؒ ازراہِ غریب نوازی پوری طرح تصور میں آ گئے ۔اور میں نے پر درد لہجے میں التجا کی ۔کہ حضورؒ اگر آپ کا بس چلے براہ کرم نوازی میری زندگی بچا لیجئے'' اسی لمحہ میں میں نے محسوس کیا کہ جیسے کوئی برقی رو میرے پاؤں کے تلوؤں میں داخل ہو گئی ہو.حضور مرشد پاکؒ کا مسکراتا ہوا چہرہ انور عین میرے رو برو تھا.گرمی کی ایک لہر آئی ۔عشق و محبت کے پاک جذبے نے کروٹ لی.اور الفت کی ایک ایسی ولولہ انگیز کیفیت طاری ہو گئی کہ مارے جوش کے اٹھ بیٹھا.پھر چپلیاں پہن لیں.اور اچھل کر پوری تیزی سے مکان کی دوسری چھت پر چڑھ گیا.یہ حالت دیکھ کر میری اہلیہ کو شک گزرا کہ نہ باید پاگل ہو گیا ہو.چنانچہ اس کے اوسان خطا ہو گئے.اور چلا کر آواز دی کہ آپ کو کیا ہو گیا؟ میں نے کہا ''بس! چپ رہو.مطمئن ہو کر اوسان بجا کر دو۔کیونکہ میں مکمل تندرست ہو گیا ہوں'' مگر اس کی حیرت کب جاتی تھی ۔اور بڑی حد تک وہ حق بجانب بھی تھی ۔اسی لئے اس نے مجھ سے پوچھ لیا کہ ابھی ابھی تو قریب المرگ تھے ۔آنکھ کی جھپک میں کیسے تندرست ہو گئے؟ میں نے سمجھایا کہ ہاں! دیکھ لو! ایسا بھی ہوا کرتا ہے'' خیر جو کچھ بھی تھا۔مگر اس کے بعد مجھ پر اس قسم کی کیفیت پھر کبھی نہ آئی.جس نے چلنے پھرنے سے معذور کر دیا ہو۔اگر چہ دیگر انواع کی تکالیف بڑھ چڑھ کر آئیں.مگر وہ تو کچھ اور ہی چیز تھی۔

حضور بادشاہ جانؒ کا ایک اور کرشمہ:۔

اسی سال جبکہ میں اجمیر شریف میں تھا تو کئی کئی بار مجھ پر نزع کی حالت طاری ہوتی رہی۔اور اس کے ساتھ ہی مرشد پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توجہ بھی موصول ہوتی رہی۔ کبھی کبھی جب ساری تکلیف مجتمع ہو کر دل پر چھا جاتی۔تو سفید رنگ کی کوئی چمکتی ہوئی چیز میرے بدن سے خارج ہو جاتی اور عین میرے بالمقابل کھڑی ہو جاتی۔ یہ کلی طور پر میری دوسری شکل ہوتی۔ بے حد خوبصورت، روشن اور منور، داڑھی مونچھ صاف! اور اس وقت میرا تصور یہ ہوتا۔ کہ یہ میری روح ہے۔ جو مجھ سے نکل گئی ہے اور میں مر گیا ہوں۔لیکن جب میں غائر نظر سے اپنی طرف دیکھتا تو مجھے اچنبھا ہوتا۔ کیونکہ میں بقید حیات ہوتا۔ اور اس کے ساتھ ہی کچھ ایسی پر لطف کیفیت طاری ہو جاتی کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت کے علاوہ باقی کچھ بھی یاد نہ رہتا۔

دوران عرس حضرت خواجہ خواجگان چند ہدایات:۔

عرس مبارک کے بعد جب حضور بادشاہ جانؒ حیدر آباد سندھ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔تو مجھے ارشاد فرمایا کہ! ''تم بھی اپنے گھر چلے جاؤ''۔
میں نے دست بستہ گزارش کی۔کہ ''حضورؒ مر تو ویسے بھی رہا ہوں اس لئے لنڈی کوتل کے قبرستان میں پیوند زمین ہونے سے خواجہ خواجگانؒ کے گور غریباں میں دفن ہونا لاکھ درجہ بہتر سمجھتا ہوں تب حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔ ''اچھا تو چند دن یہاں ٹھہر جاؤ'' اس کے علاوہ حضور بادشاہؒ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:۔
''وہ سید لڑکی (جس کا تذکرہ بعد میں آ جائے گا) جو کبھی کبھی یہاں آتی ہے۔تو جب تک تم یہاں ہو اس کا خیال رکھنا''
یہی ارشاد انہوں نے کوہاٹ بادشاہ (کوہاٹ بادشاہ حضور بادشاہ جانؒ کے خلیفہ ہیں۔ نواب شاہ (سندھ) میں قیام رکھتے ہیں اور بقید حیات ہیں) سے بھی فرمایا تھا۔ علاوہ ازیں حضور بادشاہ جانؒ نے مجھے یہ ہدایت بھی فرما دی تھی کہ:۔ ''درگاہ شریف کے بلند دروازے میں جو سفید ریش مجذوب بیٹھا ہے کبھی کبھی اس کے پاس جایا کرو'' ان ارشادات عالیہ کے بعد حضور بادشاہ جانؒ عازم سندھ ہو گئے۔

قیام اجمیر شریف کے دوران حضور بادشاہ جانؒ کے معمولات :۔

درگاہ شریف میں مرشد پاکؒ کا ایک کمرہ تھا۔اور یہ وہ کمرہ تھا جو کسی زمانے میں متولی سید نثار احمد صاحبؒ نے سید عبدالرشید بادشاہ کو دیا تھا۔عبدالرشید بادشاہ بٹ کوٹ کے اخوند موسیٰؒ کی نسل سے تھے۔اور ایک طویل عرصہ تک اجمیر شریف میں مسکینوں کی زندگی بسر کی تھی۔ بعد میں حضور بادشاہ جانؒ سے بیعت کی اور ان کے حلقۂ ارادت میں آ گئے۔

عرس مبارک کے شروع ہونے سے قبل حضور مبارکؒ مذکورہ بالا کمرے میں قیام پذیر ہوتے۔ دوران عرس میں جب حضور مبارکؒ کے مریدوں کی خاصی تعداد حاضر ہوتی تو پھر اجمیر شریف میں کوئی بڑا سا مکان کرایہ پر لے لیا جاتا۔جس میں حضور بادشاہ جان بھی منتقل ہو جاتے۔معمول مبارک یہ تھا۔کہ شام کی نماز مذکورہ بالا کمرے میں ادا فرماتے۔اس کے بعد دیگر نوافل وعبادت میں مشغول ہو جاتے۔نماز عشاء ادا فرمانے کے بعد اسی کرائے والے گھر میں تشریف لے جاتے۔ اور مریدین ومعتقدین کے ہمراہ کھانا تناول فرماتے۔

بلند دروازے پر علم مبارک بلند کرنیکی رسم کا حکم :۔

غالباً 27،1926ء کا ذکر ہے کہ حضور بادشاہ جانؒ حضرت خواجہ خواجگان غریب النواز معین الدین حسن سنجریؒ کے حکم سے درگاہ اقدس کے بلند دروازے پر علم نصب فرمانے پر مامور ہو گئے۔ یہ نشان سب سے پہلے حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے بلند فرمایا تھا۔مگر ان کے وصال کے بعد یہ رسم بند ہو گئی۔حتیٰ کہ مدت مدید کے بعد حضور بادشاہ جانؒ کو یہ اعزاز مرحمت ہوا۔مگر جب انہوں نے علم نصب فرمانے کا اعلان فرمایا۔تو یہ ہندوستان بھر کے پیروں پر بہت شاق گزرا وہ یہ چاہتے تھے کہ حضرت خواجہ خواجگان غریب النوازؒ ان میں سے کسی کو اس اعزاز سے نواز لیتے۔تو خوب ہوتا۔ان کے جواب میں متولی نثار احمد صاحبؒ یہ فرماتے کہ ”کیا کیا جائے حضور خواجہ خواجگانؒ کا یہی حکم ہے۔کہ سید عبدالستار شاہ چشتی، نظامی، نیازیؒ ہی نشان مبارک کو نصب فرمائے“۔

اولین رسم افتتاح :۔

حضور بادشاہ جانؒ کی اولین رسم علم کشائی کے بارے میں حضور بادشاہ جانؒ نے فرمایا کہ :۔

”جس وقت ہم متولی صاحبؒ کے گھر سے نکلے۔تو پھولوں کے خوبصورت گجرے میرے پاس تھے

راستے ہی میں لالی بابا نامی ایک درویش ہوتے تھے۔ اس کے پاس گزرتے وقت اس نے مجھے ایسی بری طرح تیز نظروں سے دیکھا تھا۔ کہ میں چکرا گیا تھا۔ اور اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے زمین میں دھنس گیا ہوں۔ بہر حال پھولوں کے گجرے حضرت خواجہ خواجگان غریب النوازؒ کے روضئہ اطہر پر ڈالے گئے اس کے بعد بلند دروازے پر نشان مبارک نصب کرنے کی باری تھی۔ اور جونہی علم مبارک نصب کیا گیا تو آناً فاناً نشان مبارک کے بانس کو ایک ایسی شدید ضرب لگی۔ کہ وہ دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور نشان مبارک نیچے آ رہا'' پھر یہ ملاحظہ فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''کوئی ہے جو پندرہ منٹ کے اندر اندر علم مبارک کو دوبارہ نصب کر سکے؟ ۔۔ یاد رکھو ۔۔ اگر اس تھوڑے سے وقفہ میں یہ کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا تو پھر قیامت تک یہ علم بلند نہ ہو سکے گا''

عبد الرشید بادشاہ کا کہنا ہے کہ اس موقع پر میں نے پیشکش کی۔ حق سبحانہ وتعالیٰ کا فضل اور حضور بادشاہ جانؒ کی توجہ تھی کہ میں پندرہ منٹ سے پہلے پہلے علم مبارک لہرانے میں کامیاب ہو گیا۔ بہر حال حضور بادشاہ جانؒ کا معمول مبارک تھا۔ کہ ماہِ رجب کی پہلی تاریخ سے پانچ روز قبل یعنی جمادی الثانی کی پچیسویں تاریخ کو بلند دروازے پر علم مبارک بلند فرمانے کی رسم ادا فرماتے۔ اور جب یہ متبرک رسم ادا ہوتی تو ان کے کمرے کے برآمدہ میں بطور تبرک مٹھائی تقسیم ہوتی۔

جالندھر کی مائی کی گستاخی اور کوہاٹ بادشاہ کی افتتاحی توجہ:۔

1933ء ہی کے عرس مبارک کے ابتدائی دنوں میں جالندھر کی ایک عورت نے بھی حضور بادشاہ جانؒ کے کمرے کے برآمدہ میں ڈیرہ جمالیا۔ یہ ایک درویش عورت تھی۔ اس کا سن چالیس پینتالیس برس کے لگ بھگ ہوگا۔ خدوخال برے نہ تھے۔ قادری مشرب رکھتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک مرید بھی تھا۔ انہی دنوں جب ہمارے حضور بادشاہ جانؒ اپنے کمرے سے باہر نکلتے یا اندر تشریف لے جاتے تو بلاوجہ یہ عورت ان کی طرف گھور گھور کر دیکھتی۔ حتیٰ کہ ایک روز اس عورت نے مجھ سے دریافت کیا کہ ''کمرے میں مقیم یہ آدمی کون ہوتا ہے؟'' اس عورت کے استفسار میں بڑی رعونت اور غیر موزونیت تھی۔ اس کی غیر شائستہ اور بے باکانہ طرز گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ وہ حضور بادشاہ جانؒ کی کسی قسم کی خصوصیت کی قائل نہ تھی۔ تاہم میں نے کہہ دیا کہ ''ہمارے مرشد ہیں'' بے تکا پن اور بالکل غیر معقول طریقے پر اس عورت نے طنزاً یہ فقرہ چست کر دیا۔ کہ ''ہاں! ایسے کئی مرشد یہاں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں'' اتفاقاً کوہاٹ بادشاہ میرے قریب ہی بیٹھے تھے۔ اور جالندھر کی عورت کی گفتگو سن کر اس کی نامعقولیت اور بے لگامی پر طیش میں آ گئے۔ چنانچہ وہ میرے پیچھے پڑ گئے کہ ''بھائی صاحب! مزید وقت ضائع کئے بغیر مجھے توجہ دینے کی

ترکیب سکھا دیجئے ۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ :۔
''ارے کوہاٹ کے شہنشاہ! (میں عموماً ان کو اسی لقب سے خطاب کیا کرتا تھا. اگر چہ ان کا ایک نام عبدالوہاب اور دوسرا ہزارہ گل شاہ ہے .) تعجب ہے کہ جب آپ کو خود خلافت حاصل ہے تو توجہ سیکھنے کی ترکیب کا مجھ سے دریافت کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے ۔؟''
جواب میں کوہاٹ بادشاہ نے کہا کہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس سعادت عظمیٰ سے تا حال محروم ہوں. بہر حال تم ان باتوں کو چھوڑو اور ذرا جلدی سے ترکیب سکھا دو'' میں نے دوبارہ پوچھا کہ ''آخر اس کی آپ کو اس قدر جلدی کیوں ہے؟ اس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ اس پنجابن کو توجہ دینا چاہتا ہوں اور جب تک اس کو مرید نہ کرلوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا'' . یہ جان کر جو کچھ مجھ سے ہوسکتا تھا تو اپنی دانش کے مطابق ان کو بتا دیا۔
یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا. جبکہ حضور بادشاہ جانؒ حیدر آباد میں تھے ۔ خیر ! کوہاٹ بادشاہ حضور مرشد پاکؒ کے کمرے میں داخل ہوگئے اور میں باہر برآمدے میں پنجابن کے پاس بیٹھ گیا. جس کو میں ''مائی'' کہہ کر پکارتا. وہ مجھے توجہ بھی دیتی تھی ۔ خصوصاً جب میری تکلیف بہت بڑھ جاتی ۔ تو اکثر اس کی توجہ سے افاقہ ہوتا. بہر کیف تھوڑا وقفہ نہ گزرا ہوگا ۔ کہ یکا یک پنجابن مائی سرو قد کھڑی ہوگئی. اور دوسرے لمحے میں حضور مرشد پاکؒ کے کمرے کی طرف چل پڑی. اور وہاں جا کر کوہاٹ بادشاہ سے بیعت کرلی. پھر تو کوہاٹ بادشاہ کے وارے نیارے ہوگئے ۔ ''مائی'' نے ان کے سارے خرچ اخراجات کا ذمہ لے لیا. اور حق یہ ہے کہ اس سلسلے میں وہ بڑی دولت لٹاتی تھی۔

''مائی'' کی معیت میں زیارت قبور :۔

یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد ہم سب مل کر خواجہ خواجگانؒ کے چلہ خانے گئے اور وہاں دو راتیں بسر کیں. سارا خرچ ''مائی'' ادا کرتی تھی ۔ وہاں سے ہم میرا سید حسینؒ کے عرس مبارک میں شرکت کرنے کے لئے تاراگڑھ چلے گئے. اس موقع پر وہ سید لڑکی (جس کی نگہداشت کے بارے میں حضور مرشد پاکؒ نے تاکید فرمائی تھی) بھی ہمارے ہمراہ تھی ۔ ہم سر آنکھوں پر اس کا احترام کرتے تھے ۔ اور اس کی تقدیس کا بڑا خیال رکھتے تھے ۔ یہ لڑکی الائی ضلع ہزارہ کی رہنے والی تھی ۔ نیم مجذوب حالت میں تھی ۔ حضور بادشاہ جانؒ کی نظریں بچ گئی تھی ۔ تو جب کبھی ڈیرے میں حاضری دیتی اور حضور بادشاہ جانؒ کو ایک نظر دیکھ لیتی تو بے ساختہ طور پر وجد میں آجاتی تھی ۔ اور عین حضور مبارکؒ کے روبرو بیٹھنے کا اہتمام کرتی ۔

گنج شہیدان میں ایک رات :۔

میرا سید حسینؒ کے عرس کے سلسلہ میں ایک رات ہم نے وہاں بھی گزار دی. صبح سویرے '' کا کا شہداء '' کی زیارت میں حاضری دی۔ یہ ایک گنج شہیدان ہے۔ ان بزرگوں نے میرا سید حسینؒ کی ہمراہی میں جام شہادت نوش فرمادیا تھا. اوراسی مقام پر محو آرام ہیں. اس جگہ نیچے جنگل میں دوپہر تک میلہ لگتا ہے۔ اور پھر لوگ شام سے قبل ہی چلے جاتے ہیں یہاں رات کو رہنا خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ اس کو باغ بھی کہتے ہیں. اس مقام کے متعلق مشہور ہے۔ کہ گنج شہیدان کی روحیں کسی ماں جائے کو یہاں رات بسر کرنے کے لئے نہیں چھوڑتیں جب مجھے اس بات کا علم ہوگیا تو اصرار کرنے لگا. کہ چاہے کچھ بھی پیش آئے میں اسی خطرناک مقام میں رات بسر کروں گا. کوہاٹ بادشاہ، پنجابن '' مائی '' اور ایک دوسرا مست قلندر ملنگ جس نے پیروں میں گونگرو بھی ڈالے تھے۔ یہ سب حضرات میری ہٹ سے پریشان تھے۔ انہوں نے مجھے خوب سمجھایا. کہ دیکھو یہاں پر رات گزارنا کوئی کھیل نہیں کیونکہ ایسا شخص صبح ہونے سے پہلے پہلے راہی ملک عدم ہو جایا کرتا ہے۔ لہذا ضد چھوڑ دو اور بے جا اصرار نہ کرو. مگر میں نے صاف کہہ دیا. کہ '' میں ویسے بھی مر رہا ہوں. اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ گنج شہیداء کی پاک ارواح ہی میرا فیصلہ کرلیں اسی طرح میں بھی شہادت کے مرتبے سے ہمکنار ہو جاؤں گا. مختصر یہ کہ وہ سب یہاں ٹھہرنے پر مجبور ہو گئے۔ اور ایک درخت کے نیچے ڈیرا ڈالا گیا۔ شام کا اندھیرا چھاتے ہی میں تو سو گیا. اور اسی طرح میں اس بھیانک رات کا کوئی واقعہ نہ دیکھ سکا. لیکن کوہاٹ بادشاہ کی روایت کے بموجب وہ ڈراؤنی رات انہوں نے بڑی تکلیف سے گزاری۔ بقول ان کے ایک گھڑ سوار دستے کی آمد کا غلغلہ ہوتا. گھوڑوں کی مسلسل ٹاپ سنائی دیتی۔ اور دوسرے لمحے اتھاہ خاموشی چھا جاتی تھی۔ پھر یک دم تندو تیز ہوا کا طوفان اٹھتا. اور سائیں سائیں کرتا ہوا آگے نکل جاتا. دل کو ہلا دینے والے ان مافوق العادہ مناظر سے دہشت زدہ ہو کر گونگروؤں والا مست قلندر حواس باختہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور ناچتے ہوئے بے تحاشہ '' مست قلندر، مست قلندر، مست قلندر '' کا ورد شروع کیا. تاریک اور سنسان جنگل میں مست قلندر کے گونگروؤں کی چھن چھن چھن رات کے قلب میں ارتعاش پیدا کرتے ہوں گے۔ صبح پو پھٹتے ہی ہم سب اجمیر شریف کی طرف لوٹ آئے۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے عبدالرشید بادشاہ ہم پر ناراض ہو گئے۔ کہ کیوں ہم نے ایسے ہولناک مقام میں رات گزاری؟ اور اس واقعہ کے تیسرے دن حضور بادشاہ جان کا نامۂ مبارک وارد ہوا. جس میں تحریر فرمایا گیا تھا. کہ:۔ '' فلاں رات تم لوگوں نے جس مقام میں گزاری تھی آئندہ کے لئے ہرگز ایسا نہ کیا جائے۔ ''
کس قدر یہ بات طول پکڑ گئی بکر کیا کیا جائے

لذید بود حکایت دراز تر گفتم

امید کی کرن:۔

کہنا یہ تھا کہ حضور بادشاہ جانؒ کو پیر کامل کی تلاش تھی۔ اور اسی سلسلے میں انہیں خوف و دہشت کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بہرحال جب وہ افغانستان سے واپس لوٹے تو ان کے ایک عزیز دوست سید مستان شاہ عرف کشمیر بادشاہ ان کے منتظر تھے۔ بات یہ تھی کہ کشمیر بادشاہ کو بہت عرصہ کے بعد ایک کامل مرشد مل گیا تھا۔ اور ان کی خواہش تھی کہ ان کے دوست (حضور بادشاہ جانؒ) بھی اس ضیافشاں اور قدسی شمع کے عرفانی نور سے اپنا حصہ حاصل کرسکیں۔ قبل ازیں دونوں دوستوں کے درمیان طے پایا تھا کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی کامل مرشد ملا۔ تو دوسرے دوست کو بہر حال یاد رکھے گا۔

کچھ کشمیر بادشاہ کے بارے میں:۔

ظاہر ہے کہ ان کا اسم گرامی سید مستان شاہ تھا۔ آپ قیام پاکستان تک بقید حیات تھے۔ ان کی مستقل رہائش مقبوضہ کشمیر میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بعد میں اپنے مرشد حضرت خواجہ راجہ شیخ محمد عظیم عرف سائیں صاحبؒ کی زیارت کرنا بھی محال ہو گیا تھا۔ حضرت سائیں صاحبؒ کا مزار پر انوار آزاد کشمیر کے موضع نڑاں میں واقع ہے۔ اور موضع نڑاں مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے بالکل قریب ہے۔

کشمیر بادشاہ کے طرز سلوک پر میری برافروختگی:۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ 1927ء میں جبکہ حضرت شیخنا سائیں صاحبؒ کی اہلیہ معظّمہ ومکرمہ پردہ فرما گئی تھیں تو میں بھی مرشد پاکؒ کے ساتھ موضع نڑاں گیا تھا۔ اور اسی موقع پر سید مستان شاہ صاحب (عرف کشمیر بادشاہ اور ننگا باجی) سے میری ملاقات ہوگئی تھی۔ ان کا نام تو بہت سنا تھا۔ مگر جب قریب سے میں نے اس کے طور و اطوار دیکھے۔ تو حق یہ ہے کہ ان سے وابستہ میری ساری عقیدت کافور ہوگئی۔ ہوا یوں کہ ایک روز کشمیر بادشاہ نے حضور بادشاہ جانؒ سے کہا کہ ”ستار شاہ! ذرا باہر جا کر میری نسوار کی ڈبیہ تو لے آنا“ حضور بادشاہ جانؒ تشریف لے گئے۔ اور کشمیر بادشاہ کے سفری تھیلہ سے ڈبیہ لے آئے۔ اس وقت میرے ملال اور غصے کی جو حالت تھی۔ اس کا اندازہ یا تو میں خود لگا سکتا تھا یا میرے مرشد پاکؒ! باوجودیکہ کشمیر بادشاہ کے اپنے مرید محفل میں موجود تھے۔ اور وہ ان میں سے کسی ایک کو ڈبیہ لانے کے لئے کہہ سکتے تھے۔ مگر انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہ کیا۔ اور اسی وجہ سے مجھے بڑا غصہ آرہا تھا۔ اس سے قطع نظر کشمیر بادشاہ اپنے مریدوں کو یہ

بھی جتانا چاہتے تھے۔ کہ کس طرح وہ حضور بادشاہ جانؒ پر حکم چلاتے ہیں. ان کا مطمح نظر یہ بھی تھا کہ اپنے مریدوں پر ظاہر کر دے کہ مستان شاہ (کشمیر بادشاہ) کی روحانیت کی بلند پروازیوں کا کیا عالم ہے؟ حضور بادشاہ جانؒ میرے چین بجبین ہونے کو بیک نگاہ تاڑ گئے۔ اسی لئے انہوں نے نسوار کی ڈبیہ لاتے وقت میری طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جس میں مؤدب اور خاموش رہنے کے علاوہ ضبط وتحمل کی بھی مکمل ہدایت تھی۔ سو میں نے چپ سادھ لی. مگر تھوڑی دیر نہ گزرنے پائی تھی. کہ کشمیر بادشاہ نے باردگر حضور بادشاہ جانؒ کو حکم دیا کہ ''ستار شاہ میرے تھیلے سے بیڑی لے آؤ. کیونکہ میں نے ذرا باہر جانا ہے۔'' اب کی بار تو میرے جذبات پوری طرح مشتعل ہو گئے. میں آپے سے باہر ہو گیا. اور قریب تھا کہ حدود آداب سے نکل کر بے نقط سناتا. مگر اسی اثناء میں میرے مرشد دل آگاہؒ نے جاتے جاتے کچھ اس انداز سے گھور کر مجھ کو دیکھا کہ میرا سارا غصہ رفو چکر اور مشتعل جذبات ٹھنڈے پڑ گئے. تاہم میں نے دل ہی دل میں ٹھان لیا کہ ''نانگا باجی'' کو صراحتاً یا کنایتاً تہذیب وتادیب کا سبق دوں گا. بہر حال حضور بادشاہ جانؒ ''نانگا باجی'' کی بیڑی لے آئے. اور وہ باہر چلے گئے. جب واپس آئے. اور بعد از نماز مغرب کھانے کا دستر خوان بچھ گیا تو ساتھ ہی ادھر ادھر کی گفتگو شروع ہوئی. اس وقت کشمیر بادشاہ جناب لالہ صاحب (محمد اکبر صاحب حرت شیخنا سائیں محمد عظیمؒ کے فرزند ارجمند تھے) کے قریب بیٹھ گئے۔ اور میں ذرا فاصلے پر کچھ پرے بیٹھ گیا فقر و درویشی زیر بحث تھی۔ اور انہی باتوں کی آڑ لے کر موقع پاتے ہی میں نے گفتگو میں حصہ لے لیا. اور کہا کہ ''سچ پوچھیئے! آج کل تو لوگوں نے فقر کا صرف نام ہی سنا ہے۔ ورنہ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ہر طرف دکانداری ہے۔ کوئی چھوٹا دکاندار تو کوئی بڑا، نہ شریعت غرا کے احکام سے لگاؤ. نہ واقفیت اور نہ ہی کسی خورد و بزرگ کی تربیت وادب کا لحاظ۔! بس تہہ باندھ بال پراگندہ کر کے چرس کے حقے سے دھوئیں کے مرغولے چھوڑنے سے کام ہوتا ہے۔ اور کفریات کہنے سے ذرہ برابر نہیں ہچکچاتے. اس پر طرہ یہ کہ انہی کفریات اور اول فول کو فقر کے رموز سے تعبیر کرتے ہیں. اپنے سلسلہ کلام کے دوران عمداً میں حضور بادشاہ جان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا. کیونکہ مجھے اچھی طرح سے علم تھا. کہ اگر ذرا سا بھی ان کی طرف دیکھا تو بالیقین وہ اشارے سے منع فرما دیتے۔ وجہ یہ تھی کہ واضح طور پر میرا ہدف صرف اور صرف کشمیر بادشاہ تھے۔ چنانچہ میں نے دوبارہ بات شروع کی. کہ ''حیرت ہے یہ لوگ ظاہراً تو اپنی طبیعت کی طہارت اور نفاست کو اس ڈھنگ میں پیش کرتے ہیں. کہ اہلِ ہنود کی طرح اگر کوئی شخص ان کے برتنوں کو ہاتھوں سے چھولے یا کسی برتن میں پانی پی لے تو پھر ان برتنوں کا استعمال ہی ترک کر دیتے ہیں (کشمیر بادشاہ کی یہی عادت تھی) اور اگر کوئی شخص ان سے سخت کلامی کرے تو اس کے قتل ہو جانے پر بھی ان کا جی ٹھنڈا نہیں ہوتا. رہے ان کے مرید؟ تو ان کو نرے احمق بلکہ حیوانات کے زمرے میں شمار کرتے

ہیں. اور تقدیراً اگر کسی کے سر میں درد ہو جائے تو یہ حضرات یہ کہتے کہتے ہرگز نہیں تھکتے۔ کہ ہم نے بد دعا دی ہے''. کن آنکھوں سے جب میں نے اپنے مرشد پاکؒ کی طرف دیکھا تو ان کی برہمی ان کی مبارک آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہی تھی. بارے میں اپنے دل کی بھڑاس نکال چکا تھا. اور مزید خاموش رہا. بعد ازاں کھانا کھایا گیا. اور جب ہم نڑاں سے راولپنڈی آ رہے تھے تو کشمیر بادشاہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ دو دن متواتر ایک ساتھ رہنے کے باوجود وہ مجھ سے ہرگز مخاطب نہ ہوئے. نہ ہی میں نے ان سے بات چیت کرنے کی کوئی ضرورت محسوس کی۔ البتہ اس گفتگو کے دوسرے دن صبح حضور بادشاہ جانؒ نے مجھے اپنے پاس بلا کر تہدیداً یہ ارشاد فرمایا کہ:۔ ''بے وقوف! لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں جیسے تم نے کیں؟ تمہیں معلوم ہے کشمیر بادشاہ کتنا زور آور آدمی ہے؟ میں نے عرض کر دیا. کہ حضور! میں معافی کا خواستگار ہوں. اور واقعی اس وقت میں صبر و ضبط سے کام نہ لے سکا.

کشمیر بادشاہ کے مقام اور احسان کا ذکر:۔

بعد ازیں حضور مرشد پاکؒ کا ارشاد گرامی یہ تھا کہ:۔

''کشمیر بادشاہ میرا جگری دوست ہے۔ اور بلا شبہ بہ لحاظ عمر وہ مجھ سے چھوٹا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے معاملات میں اس کا ہر طرح سے احترام ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ جب وہ میرا ہمسفر ہوتا تھا تو سارا کام کاج میں کیا کرتا تھا. ہم ایک ہی چارپائی میں دراز ہوتے. میں نے کسی موقعہ پر اسے تکلیف نہیں دی. اور میری عادت ہے کہ ابتدائی ملاقات میں جس قسم کا سلوک کسی سے شروع کروں تو انتہا تک اس میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا. اور جہاں تک کشمیر بادشاہ کا تعلق ہے۔ تو میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے مجھے حضور سائیں صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا. میں اس کا بڑا ممنون ہوں. اور فی الحقیقت یہ اس کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ اس لئے یاد رکھو۔ کہ آئندہ ایسے لوگوں کے متعلق زبان درازی نہیں کرو گے. اور تمہیں معلوم ہے کہ کشمیر بادشاہ تو آفت خداوندی ہے۔ اس کے بارے حضور سائیں صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ:۔ ''پکا فقیر۔۔ پکا جادوگر۔۔ اور پکا کیمیا گر'' سچ یہ ہے کہ کشمیر بادشاہ بڑا ہی طرار ذو لباز ہے اور ہر عمل سے واقف ہے۔''

کیمیا کی حقیقت اور حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کا ارشاد:۔

ان ارشادات عالیہ کو سننے کے بعد موقعہ پا کر میں نے چپکے سے عرض کر دیا. کہ حضورؒ! کیا حقیقت میں بھی کیمیا نام کی کوئی چیز ہے۔ یا صرف نام ہی نام ہے؟ میری گزارش سماعت فرما

کر مرشد پاکؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ۔

''یقیناً کیمیا حقیقت رکھتی ہے۔ لیکن اس بارے میں ایک موقع پر حضور سائیں صاحبؒ نے ارشاد فرمایا تھا. کہ اسی (80) سال گزر جانے کے بعد (اس قسم کے سونے کا) رنگ اڑ جاتا ہے۔ اور خام مس کے سوا باقی کچھ نہیں رہتا. واقعہ یہ تھا. کہ کسی زمانہ میں ایک بخاری سید نے مجھے اور کشمیر بادشاہ کو کیمیا کا ایک نسخہ بتا دیا تھا. اور ساتھ ہی ایک سیفی کی بھی اجازت دی تھی۔ مگر سید صاحب نے ہم دونوں سے یہ عہد بھی لیا تھا. کہ مذکورہ سیفی مسلمانوں کے خلاف ہرگز ہرگز نہ پڑھی جائے گی. البتہ دشمنان دین کے خلاف پڑھنے کی اجازت ہوگی. اسی طرح کیمیا کے نسخے سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے گا. چنانچہ خدائے وحدہٗ لاشریک گواہ ہے۔ کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ تو میں نے مذکورہ سیفی آج تک کسی مسلمان کے خلاف نہیں پڑھی ہے۔ اور نہ ہی کیمیائے نسخے سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جس وقت کشمیر بادشاہ نے حضور سائیں صاحبؒ کے فرزند ارجمند جناب محمد یعقوب صاحب مرحوم کو کیمیا کے نسخے کے متعلق بتا دیا. تو انہوں نے اپنے والد محترم یعنی حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کو آگاہ کر دیا. حضور سائیں صاحب نے ازراہِ کرم گستری مجھ سے تو کچھ نہ فرمایا لیکن کشمیر بادشاہ کو خوب جھاڑ پلا دی. اور خفہ ہو کر اس کا برا حال بنا دیا''.

کشمیر بادشاہ کی حالت جذب:۔

سلسلۂ کلام جاری فرماتے ہوئے حضور مرشد پاکؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''حضور سائیں صاحبؒ نے سخت الفاظ میں کشمیر بادشاہ کو سرزنش کے طور پر ارشاد فرمایا کہ تمہیں شرم نہیں آتی۔ سید کہلا کر سر تو فقیر کی دہلیز پر رکھا ہے۔ اور بنانے لگے ہو۔ سونا! جو قطعی حرام ہے۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اسی (80) برس کے بعد اس سونے کا رنگ کسی صورت میں بھی بحال نہیں رہ سکتا. دور ہو میری نظروں سے!'' ان قدسی الفاظ کا سننا تھا کہ کشمیر بادشاہ پر جذب طاری ہو گیا. اور وہ مجذوب ہو گیا. تین برس پاگل رہنے کے بعد آخر کار لوگوں نے حضور سائیں صاحبؒ کی خدمت اقدس میں درخواستیں اور التجائیں کیں. تب انہوں نے معافی دی. اور کشمیر بادشاہ نے ستر پوشی کی۔ لیکن اس کے بعد ابھی تک تہہ بند ہی استعمال کرتے ہیں. البتہ کبھی کبھار شلوار بھی پہن لیتے ہیں. بہر حال مدعا یہ تھا کہ وہ سونا جو خام مس سے بن جائے تو اس کا وزن بھی کان سے حاصل شدہ سونے کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔ اتنا وزن ضرور ہوتا ہے کہ صراف دھوکہ میں آ کر اسے خرید لیتا ہے''

حضور بادشاہ جانؒ کا عزم کشمیر:۔

خیر تو تذکرہ یہ ہو رہا تھا۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ کا افغانستان سے واپس ہونے پر سید مستان شاہ (کشمیر بادشاہ) پہلے ہی سے ان کے منتظر تھے۔ اسی سلسلے میں حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے:۔

''جب میں کابل سے واپس لوٹا تو کشمیر بادشاہ نے مجھے بتایا کہ سرزمین کشمیر میں اسے ایک کامل فقیر ہاتھ آ گیا ہے جس سے انہوں نے بیعت بھی کی تھی۔ ساتھ ہی مجھے بھی وہاں لے چلنے کا کہہ دیا. کشمیر بادشاہ نے بتایا کہ مجھے وہاں سے ضرور فائدہ پہنچے گا. یہ سن کر میں خوشی سے پھولے نہ سمایا اور اس کے ساتھ کشمیر روانہ ہو گیا''.

مکرمہ و معظمہ مائی صاحبہؒ اور جناب محمد اکبر صاحبؒ:۔

یہاں میں اپنے قارئین کرام کو حضور سائیں محمد عظیمؒ اور فخر العلماء الاولیاء بادشاہ جانؒ کی اولین ملاقات کا واقعہ حضرت مائی صاحبہ مرحومہ و مغفورہؒ کی زبانی بیان کرنا بہتر سمجھتا ہوں. اس لئے کہ وہ محترمہ سائیں صاحبؒ کی زوجہ محترمہ تھیں. اور ہم سب ان کو ''مائی صاحبہ'' کہا کرتے تھے۔ یہ رابعۂ دہر صرف مجھی سے نہیں بلکہ حضور مرشد پاکؒ کے تمام مریدوں کو بہت عزیز رکھتی تھیں. جب کبھی میں موضع نڑاں حاضر ہوتا تو مائی صاحبہؒ اکثر مجھے اپنے حضور میں طلب فرماتیںؒ.

چنانچہ اسی طرح ایک روز میں اس رابعۂ عصرؒ کے حضور میں حاضر تھا. اور یہ ایک ایسا موقعہ تھا کہ اسی روز حضور بادشاہ جانؒ نے جناب محمد اکبر صاحبؒ خلف حضور سائیں صاحبؒ کو کسی بات پر ٹوکا تھا. یاد رہے کہ اگرچہ حضور بادشاہ جانؒ حضرت محمد اکبر صاحبؒ سے عمر میں بڑے تھے۔ لیکن ہر حال میں ان کا احترام مدنظر رہتا تھا. اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ حضور بادشاہ جانؒ انکے ہاتھ چومتے اور اپنے ہاتھ ان کے قدموں تک لے جایا کرتے تھے۔ اس لئے کہ حضرت محمد اکبر صاحب انہی قدسی صفت اور شمع ہدایت حضور سائیںؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ جنہوں نے حضور بادشاہؒ کو تسلی اور اطمینان کی عرفانی دولت بخشی تھی۔ اور جہاں تک اس خاص موقع پر حضرت محمد اکبر صاحب کو ٹوکنے کا تعلق ہے تو اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ یہ حضور سائیں صاحبؒ کے عرس مبارک کا موقعہ تھا. اور خاندان چشتیہ کے قاعدے کے مطابق ختم شریف کے بعد محفل سماع کا پروگرام تھا. لیکن چونکہ موضع نڑاں میں ملاؤں کا بڑا زور تھا اور حضرت محمد اکبر صاحبؒ انہی ملاؤں کے زیر اثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کئی امور میں ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔ بنا بریں حضور بادشاہ جانؒ نے ان کو ٹوکا تھا کہ:۔

''دونوں کام بیک وقت نہیں ہو سکتے۔ یا تو فقر و درویشی کے راستے پر چلو گے اور یا ملائیت کو اپنانا ہو

گا"۔
اسی دوران میں محترمہ ومکرمہ مائی صاحبہ نے بھی حضور بادشاہ جانؒ سے فرمایا تھا کہ "شاہ جی! محمد اکبر نادان ہے اسے سمجھادیا کرو"۔

حضور بادشاہ جانؒ اور حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کی اولین ملاقات:۔

بہر حال محترمہ ومعظمہ مائی صاحبہؒ نے حضور بادشاہ جانؒ اور حضور سائیں صاحبؒ کی اولین ملاقات کے بارے میں یوں ارشاد فرمایا تھا کہ:۔
"ایک روز حضور سائیں صاحبؒ اس سامنے والی جگہ (ارشاد فرما کر بتایا) میں تشریف فرما تھے اور مجھے پاس بلا کر ارشاد فرمایا کہ "آج کچھ پکایا بھی ہے؟" مجھے حضرتؒ کے اس سوال پر کچھ حیرت سی ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ قبل ازیں انہوں نے اکل وشرب کے بارے میں مجھ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ فرمایا تھا۔ بس جو کچھ حاضر ہوتا۔ پیش خدمت کر دیتی اور وہ بھی اس حال میں کہ حضرتؒ دو دو یا تین تین دن کے بعد روٹی کا محض ایک ٹکڑا لے کر تناول فرماتے بہر صورت حضرت میری حیرانگی کو بھانپ گئے۔ اور ارشاد فرمایا کہ "پوچھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج ایک بڑا ہی دلاور! مہمان اور سید آنے والا ہے۔ اس نے کبھی بھی روکھی سوکھی روٹی نہیں کھائی ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا۔ کہ اس کے لئے کوئی عمدہ چیز پکالو یہ سنکر میں نے گزارش کی۔ کہ حضور! آج اور اس وقت تو جھونپڑی میں کسی قسم کی کوئی خاص چیز موجود نہیں ہے۔ تاہم میں کوشش کروں گی۔ کہ ایک مرغا دستیاب ہوجائے۔ الحاصل میں نے جا کر ایک مرغا حاصل کیا۔ اور اُسے ذبح کرا کے پکالیا۔
شام سے کچھ دیر پہلے میں یہ دیکھنے کی غرض سے باہر آ گئی کہ آیا وہ مہمان عزیز پہنچ گیا ہے یا نہیں مگر وہاں جا کر دیکھا کہ سوائے حضرت کے کوئی اور شخص موجود نہیں حضرت نے مجھے دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ میں ان کے قریب گئی۔ تو انہوں نے نیچے ڈھلوان کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ فرمایا۔ اور جب میں نے نیچے دیکھا تو دو آدمی اوپر کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے حضرت کی طرف دیکھا۔ تو انہوں نے "پشاور والے شاہ جی (حضور بادشاہ جانؒ) کی طرف اشارہ کر کے ارشاد فرمایا۔ کہ "کشمیر والے شاہ جی کے ہمراہ یہی وہ لاڈلا جوان رعنا ہے۔ جس کا میں منتظر ہوں"۔

حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی:۔

اس سلسلے میں حضور بادشاہ جانؒ کا اپنا ارشاد گرامی ہے کہ:۔
"جب میں نے حضور وقبلہ شیخ سائیں محمد عظیم صاحبؒ کی قدمبوسی کی سعادت حاصل کی۔ تو اس

وقت ان کی خدمت اقدس میں چند پونڈ بھی بطور نذر پیش گئے۔انہوں نے دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ'' یہ کیا ہے؟ میں نے گزارش کی کہ'' یہ پونڈ ہیں اور ایک پونڈ کی قیمت پندرہ روپے نقد ہوتے ہیں'' اس پر حضور سائیں صاحبؒ نے تبسم فرما کر اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ۔'' بیٹا! ان چیزوں کو ترک کیئے ہوئے لمبا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں انہیں لیکر کیا کروں گا؟'' میں نے عرض کیا کہ'' حضورؒ کا ارشاد بجا ہے لیکن دنیا کے تمام ضروری امور انہی چیزوں سے انجام پذیر ہوتے ہیں'' چنانچہ انہوں نے مسکراتے ہوئے سر مبارک ہلا کر ایک پونڈ کو شرف قبولیت بخشا۔ اور مکرمہ و معظمہ مائی صاحبہؒ کی طرف پھینکتے ہوئے ارشاد فرمایا. کہ یعقوبؒ (حضرت سائیں صاحب فرزند) سے کہہ دو کہ مہمانوں کے لئے کچھ لے آئے''.

صدق طلب کا کمال:۔

اصولی طور پر جب طلب میں مکمل صدق اور انتہائی خلوص پیدا ہو جائے۔ تو استقامت خود بخود نصیب ہو جاتی ہے۔ بلکہ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ جس وقت سالک کی صداقت میں دُرستی آ جاتی ہے۔ تو اسی وقت اس سالک کی منزل بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ خود منزل کا خاتمہ تو کسی حال میں بھی ممکن نہیں بہر دستور حضور بادشاہ جانؒ کی طلب کا جذبہ بحیثیت کلی حق و صداقت پر مبنی تھا. اسی لئے (من جد وجد). اور جوئیندہ یابندہ کے مصداق اطمینان کے صحیح مقام تک پہنچ گئے۔
دوسرے روز صبح کشمیر بادشاہ نے حضور بادشاہ جانؒ کے متعلق حضرت خواجہ راجہ شیخ سائیں محمد عظیمؒ کی بارگاہ میں عرض داشت پیش خدمت کی کہ براہ نوازش سید عبدالستار شاہؒ سے بھی مہربانی کی جائے۔

حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کی تلقین اور حضورؒ کی درخواست:۔

اسی بارے میں حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔
''جس وقت حضور سائیں صاحبؒ نے مجھے اپنے حضور میں طلب فرمایا تو ارشاد ہوا کہ'' شاہ صاحب! فقر و درویشی کا راستہ بڑا ہی کٹھن اور مشکل ہے۔ اس میں بھوک، پیاس، ننگا پن، رسوائی، بدنامی اور علالت و بیماری کے علاوہ اور بھی بہت سے سخت مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اب تمہیں بتانا پڑے گا. کہ آیا تم ان سب کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو؟'' میں نے عرض خدمت کیا کہ'' حضور! میں ان سب کو برداشت کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہوں'' تب میرے شیخ نے ارشاد فرمایا کہ'' میرے یہاں تو تربیت دینے کا قاعدہ یہ ہے کہ تمہیں کچکول گدائی پھرانا ہوگا'' یہ سنکر میں نے التجا کی کہ'' حضورؒ کو معلوم ہے کہ میں سید ہوں. اور اگر میں کسی گاؤں کی مسجد میں ایسے ہی بیٹھ جاؤں تو بالیقین لوگ مجھے دو وقت کا کھانا دیں گے. اور اگر بعض اہل سادات کی طرح اپنی غیور

فطرت اور زندہ ضمیر کے گلے پر چھری پھیر کر خیرات وصدقات قبول کرنے پر اکتفا کراوں تو بھی اچھی طرح سے گزر بسر ہو سکتی ہے۔ حضورؐ! مجھے مرجانا قبول ہے مگر کاسۂ گدائی کے پھرانے سے معذور ہوں'' میری ان توضیحات کو سماعت فرما کر حضور سائیں صاحبؒ چپ ہو گئے. اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ۔ ''بہتر ہے تو فی الحال تم انتظار کرو. میں بعد میں تمہیں جواب دوں گا'' چنانچہ اس کے بعد وہ اپنے خلوت خانے میں تشریف لے گئے. اور مسلسل دو روز اور دو راتیں وہاں گزار دیں. تیسرے روز مجھے دوبارہ اپنے حضور میں طلب فرمایا. حسب الارشاد میں حاضر ہو گیا. تب مجھے ارشاد فرمایا کہ۔ ''شاہ صاحب! تمہارے معاملے کا تصفیہ کرالیا ہے؟ بے شک تم بہترین لباس پہن لیا کرو. انواع واقسام کے پر تکلف اور لذیذ کھانے کھایا کرو. گھوڑے پر سواری کا بھی اذن ہے۔ بشرطیکہ اپنے رب کو نہ بھولو''.

طبائع میں اختلاف اور مرشد کامل کا صوابدید:۔

میں کہتا ہوں ۔ کہ راہ طریقت میں کامل مرشد کی تربیت کے طریقے میں اپنے اگلے مرشدوں کے مقررہ اصول وضوابط کے علاوہ اس کے ذاتی تجربے اور صوابدید کی بناء پر کچھ فرق بھی ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہر شخص کی طبیعت اور رجحان میں فطری طور پر فرق ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اس کی منزل کی صورت بھی جداگانہ ہوا کرتی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی مرشد کے مریدوں میں مختلف الرائے اور مختلف الخیال اصحاب ہوا کرتے ہیں. اس کی وجہ یہ ہے ۔ کہ ہر انسان کا ''عین'' دوسرے انسان کے ''عین'' سے مختلف ہوتا ہے ۔ چنانچہ راہ سلوک میں ان کے محسوسات بھی جداگانہ ہوتے ہیں. اور ان کے حال اور واردات میں بھی بیّن فرق ہوتا ہے۔ خود میرے اپنے خیالات دوسرے برادران طریقت سے قطعی طور پر مختلف رہے۔

مثال کے طور پر بعد از مرگ روحانی زندگی کا تو ہر مسلمان قائل ہے۔ بلکہ مسلمان تو رہے ایک طرف کفار ومشرکین کی ارواح بھی زندہ ہوں گی. اب دیکھنا یہ ہے ۔ کہ ایک ولی اللہ کی روح کیونکر زندہ نہ ہو گی. ظاہر ہے کہ ضرور زندہ ہو گی. اور اسی عقیدے پر طریقت کے تمام سلسلوں کا مکمل اتفاق ہے ۔ البتہ یہ بات الگ ہے کہ بعض متکلمین جسم کے ساتھ روح کے فنا ہونے پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں. ان کا کہنا ہے کہ بس قیامت ہی میں حق سبحانہ وتعالیٰ تمام ارواح کو صرف حساب کتاب لینے کے لئے دوبارہ زندہ فرما دیں گے. یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں انہی متکلمین کے جواب میں لکھا تھا کہ (انا الحق ۔ انا الدھر اور انا قرآن ناطق) کے نعرے گویا گروہ متکلمین کے جواب میں لگائے گئے تھے ۔ وہ متکلمین جو جسم کے ساتھ روح کی موت کے بھی قائل ہیں.

میرا اپنا نظریہ:۔

جہاں تک اس مسئلے کے بارہ میں میرے اپنے نظریئے کا تعلق ہے یعنی بعد از وفات روح کی جس نوعیت کی حیات کا میں قائل ہوں تو وہ میرے اکثر برادران طریقت کے عقیدے اور خیالات سے قطعی طور پر مختلف اور جداگانہ ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس ضمن میں میری رائے دیگر خانوادوں کے محترم حضرات سے بھی مختلف ہے۔ کیونکہ میں ایک ولی اللہ کی بعد از وفات انفرادی طور پر زندگی کا اس طرح قائل نہیں جس طرح میرے دوسرے برادران طریقت قائل ہیں. بلکہ میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ بعد از وصال ایک ولی اللہ اس کلیّت تامہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جس کے ساتھ اس کا تعلق عالم ناسوت میں ایک فرد واحد کی صورت سے وابستہ ہوتا ہے ۔ ہرچند اس کی حیثیت عالم ناسوت میں ایک فرد واحد کی تھی ۔مگر اس کے باوصف اس کا تعلق کسی صورت میں اپنے کل سے منقطع یا جدا نہ تھا. محض ایک نسبتی اور اضافی امر ایسا ضرور موجود تھا. کہ وہ خود کو انفرادی شکل میں پاتا. اس مسئلہ کی پوری پوری وضاحت کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں مل رہے کہ اپنے جملہ قارئین کو بطریق احسن سمجھا سکوں۔ البتہ میں کوشش کروں گا. کہ اپنے مطلب کی وضاحت سہل ترین طریقے سے بیان کر دوں.

ایک مثال:۔

فرض کیجئے. کہ ہم لکڑی کا ایک گول تختہ لے لیتے ہیں. ایسا تختہ جو عام طور پر گول میزوں کا ہوا کرتا ہے ۔ اسی تختہ میں جا بجا ہم کئی سوراخ ڈال دیتے ہیں. اب اس تختہ کو سیدھا کھڑا کر کے اس کے پیچھے بجلی کا ایک بڑا سا بلب روشن کر لیتے ہیں. اب معلوم ہوگا کہ پشت پر روشن بلب کی روشنی سوراخوں میں سے گذر کر سامنے دیوار پر پڑے گی. ظاہر ہے کہ دیوار پر منعکس ہر کرن یا شعاع ایک جداگانہ وجود رکھے گی. اور ایک خاص مقام پر بھی نظر آئے گی. لیکن تختے کی دوسری طرف جہاں بڑا بلب روشن ہوگا. بلا شبہ وہاں پر کسی شعاع کا انفرادی وجود نہ ہوگا. نہ ہی ایسا ممکن ہوسکتا ہے ۔ اس لئے کہ وہاں تو بجلی کے بلب سے بحیثیت مجموعی روشنی خارج ہوتی ہے ۔لیکن یاد رہے کہ اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ دیوار پر منعکس کرنوں کا انفرادی وجود بلب کی اجتماعی روشنی میں نہ ہوگا. بلکہ ہونا چاہئے ۔ اور ضرور ہوگا لیکن ہر کرن کا احساس (اگر کچھ ہو) تو بحیثیت کلی ہوگا. یعنی اس حال میں اس کا انفرادی وجود بھی وجود کلی کا حکم رکھے گا. اس حقیقت تک نہ پہنچ جانے کی وجہ سے اکثر لوگوں سے اور تو کچھ بھی نہ بن پڑا. البتہ صفات کو" زائد بر ذات" کہہ ڈالا. اور اسی طرح حق سبحانہ و تعالیٰ کو صفات کا معلول گردانا غور فرمایئے. اگر ہم پانی کا ایک قطرہ دریا میں پھینک دیں تو بظاہر تو

قطرے کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن قطعی طور پر فنا نہیں ہوتا بلکہ اس قطرے کی انفرادی نوعیت دریا کے پانی میں مل کر اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ کی تحریریں :۔

میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ میری مندرجہ بالا رائے کی تائید میں کسی اور صوفی بزرگ نے کچھ تحریر کیا ہوگا۔ البتہ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی تحریروں میں یہ نظریہ پوری تابنا کی سے نظر آتا ہے۔ اور اگر کسی صاحب نظر نے اس نظریئے کو وہاں بغور مطالعہ کر لیا تو نہ صرف یہ بلکہ تصوف کے اکثر و بیشتر اہم مسائل کو سمجھنے میں دقت محسوس نہ ہوگی. بہر حال اس موقعہ پر اس مسئلہ کے بارے میں مزید کچھ تحریر کرنا خلاف مصلحت سمجھتا ہوں. اس کی دو وجوہات ہیں. اولاً یہ کہ اس مسئلہ کی باریکی کو سمجھنا عام قاری کے بس سے باہر ہے۔ ثانیاً یہ کہ بعض لوگ اس کی شدید مخالفت پر اتر آئیں گے. اور چونکہ یہ فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ کا تذکرہ ہے لہٰذا میں اسی بناء پر اس محل میں اختلافی مسائل کو چھیڑنا خلاف مصلحت سمجھتا ہوں.

عین انسانی اور حق سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء وصفات :۔

تو بات یہ ہو رہی تھی۔ کہ حضرت خواجہ راجہ سائیں محمد عظیمؒ بھی اپنے بعض مریدوں سے دوران تربیت میں دریوزہ گری کرایا کرتے تھے۔ لیکن یہ کوئی اٹل اصول نہیں. وجہ یہ ہے کہ مرشد کامل کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ سالک کی حیوانیت مغلوب ہو جائے. اور اس کی انسانیت غالب آ جائے. نیز یہ امر اس کے صوابدید پر موقوف ہوتا ہے یعنی جس موزون طریقے پر وہ مناسب سمجھے مسترشد کو اسی طریقے پر آمادۂ عمل کرائے. لیکن اس مقام پر یہ بات مدنظر رہے۔ کہ اس قسم کی تربیت دینے کی استطاعت ہر مرشد میں نہیں پائی جاتی. کیونکہ جب تک کوئی مرشد انسانی نفسیات اور بالخصوص نفس کی ہر صفت سے پورے پیمانے پر باخبر نہ ہو اسی سلسلہ میں سب سے بڑی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ جب تک مرشد کامل ہر آدمی کے اس بنیادی اور فطری اسم سے واقف نہ ہو۔ جس پر متعلقہ شخص کی تخلیق کا مدار ہوتا ہے۔ تب تک کوئی مرشد سالک کو کامل تربیت دینے کا اہل نہیں ہو سکتا. اس لئے کہ ہر انسان حق سبحانہ وتعالیٰ کے ایک نہ ایک اسم پر پیدا ہوا ہوتا ہے۔ اور اسی اسم پر اس انسان کی فطرت کی بنا ہوتی ہے. جس میں تغیر وتبدل ناممکن ہوتا ہے۔ اسی خاص اسم کی صفت کا نقشہ اسی شخص کی گفتار و کردار میں صاف طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ حضرات جو اس ذات کبریا سبحانہ سے بکمال تمام محبت اور الفت رکھتے ہیں. وہ ہر فرد بشر کے چہرے میں اسی اسم کو بحسن خوبی پڑھ سکتے ہیں. وجہ یہ ہے کہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق استوار رکھنا سالک کو کلیت

سے روشناس کراتا ہے. اور چونکہ اسماء وصفات ذات الٰہی عزوجل میں شامل ہیں. اور عین ذات ہیں. اس لئے لازمی ہے کہ جو کوئی بھی ذات حق سبحانہء وتعالیٰ کی معرفت حاصل کر لے۔ تو صفات کی معرفت خود بخود حاصل ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح ہر صفت بزعم خویش اپنے اپنے اثرات اور اپنی الگ دنیا رکھتی ہے۔ اسی طرح اس کی منزل بھی جداگانہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں کسی شخص کا ناک نقشہ، خدوخال اور کردار وغیرہ کسی دوسرے شخص کی مانند نہیں ہوتا. البتہ لکھوکھا انسانوں میں بمشکل تمام کہیں دو آدمی ایسے پیدا ہو جاتے ہیں. جن میں خدوخال کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے. اور وہ یہ کہ کبھی کبھی ایک ہی صفت کی کوئی قریبی متحد اور رفیق صفت ایک انسان کی (فطرت) کی اساسی انیت بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اسم غفور اور اسم رحیم کو لے لیجئے۔ ان صفات الٰہی عزوجل میں واضح طور پر اتحاد اور رفاقت موجود ہے. تو بالفرض جن انسانوں کی تخلیق ایسی متحد صفات پر ہوئی ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے خدوخال اور کردار میں بھی مشابہت ہوتی ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ بعض صفات ایک دورے کو مکمل کرنے کے بعد دوسرا دورہ شروع کرتے ہیں. مثلاً مشہور ومعروف بات ہے۔ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے سات عدد ثبوتی صفات ہیں. اور ہر صفت کے ساتھ ان گنت اضافی صفات شامل ہیں. تو فرض کیجئے کہ ان ثبوتی صفات میں سے کوئی ایک صفت تو لاکھ انسانوں کی تخلیق کا موجب ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد دوبارہ اپنا دورہ شروع کرتی ہے۔ چنانچہ اسی دورے میں دو آدمی ہو بہو ایک ہی شکل وصورت کے پیدا ہو جاتے ہیں.

ہر چند اگر چہ صفت عین ذات ہے۔ لیکن جب تخلیق سے متعلق ہوتی ہے تو اپنا محدود دائرہ رکھتی ہے ۔ اور ''علم الاسماء کلھا''. کا ربانی اشارہ اسی طرف ہے۔ یعنی انسان کی فطرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء وصفات سے تخلیق ہوئی ہے۔

یاد رہے کہ ہر انسان میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی تمام صفات موجود ہیں. ان میں سے کوئی سی ایک صفت بنیادی حقیقت کی حامل ہوتی ہے۔ اور یہ صفت اس اسم سے متعلق ہوتی ہے. جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہوتی ہے۔ اور مذکورہ بالا آیت مبارک میں اگر ہم ''آدم'' سے حضرت بنینا آدم علیہ السلام مراد لیں تو بھی اس سے اسی مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے اس لئے کہ تمام بنی آدم کی ارواح پہلے ہی سے حضرت آدم علیہ السلام کی صلب میں رکھی گئی تھیں جن سے ایک موقعہ پر الست بربکم کے جواب میں بلیٰ کا اقرار بھی لیا گیا تھا. اور اگر کوئی صاحب کلھا کے مفہوم میں جملہ موجودات کا تصور شامل کر لے. تو یقیناً یہ بھی درست ہوگا. اس لئے کہ ان تمام اشیاء کے علم کا بنیادی مفہوم انسانی فطرت میں داخل کیا گیا تھا اور یہی مفہوم حق سبحانہ وتعالیٰ کے ان صفاتی اسماء کا پرتو ہے۔ جو انسانی فطرت میں موجود ہے۔ اس وجہ سے کہ علم کا سرچشمۂ اعلیٰ ذات سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اور اس تعالیٰ کے صفاتی اسماء وہ

شعاعیں ہیں جن پر انسانی کالبد کا علم موقوف ہے۔ انسانی ذہن بھی انہی شعاعوں کی چمک دمک میں ترقی کرتا ہے اور نئی نئی ایجادیں روشناس کراتا ہے۔ لیکن بہ این ہمہ کوئی انسان اپنے صفتی اسم اور ''عین'' کے حلقے سے باہر نہیں نکل سکتا. کہ ''عین'' اسم اور صفت کی وہ امتیازی انفرادیت ہے کہ خارجی وجود تو اس کا مظہر ہوتا ہے۔ لیکن بذات خود اس نے خارجی وجود کی بو بھی نہیں سونگھی ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے عین کی قید میں رہتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر کام کے لئے جدا جدا طور پر مخصوص لوگ مقرر ہیں. اور یہ بالکل حق ہے۔ کہ ''لکل فن رجال'' سو ہر ایک کا کاروبار جدا. اور ہر ایک کا راستہ الگ ہے۔ اور درحقیقت یہی اختلاف ہی دنیا کی آبادی اور روز افزوں ترقی کا ضامن ہے۔ انہی پرزوں کے ذریعے کارخانہ ہستی کی مشین رواں دواں ہے۔ یہی اضداد ہیں جن پر اشیاء کی معرفت کا مدار اور ''الاشیاء یعرف باضدادھا'' اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

اگر ان حقائق کی طرف کوئی صاحب دل بغور دیکھے. تو یہ بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی. کہ کارخانہ ہستی کی کوئی شے بے مقصد اور لاحاصل نہیں ہے۔ اور ''**ربنا ما خلقت ھذا باطلا** '' اس پر دال ہے۔ گویا اس کل کا ہر پرزہ حیات انسانی کے لئے انتہائی ضروری اور لابدی ہے۔ اسی لئے اس کل کا ہر پرزہ اپنے خالق حقیقی کے منشا کے مطابق اپنا اپنا وظیفہ ادا کر رہا ہے۔ اور نگاہ حق آگاہ سے مخفی نہ ہوگا. کہ بذات خود ان پرزوں یا ان کے عمل میں کوئی قباحت موجود نہیں ہے۔ نہ ہی ان میں کوئی برائی ہے۔ فرض کیجئے! اگر ہم ایک دوسرے کو برا تصور کرتے ہیں. تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے فرائض اور کاروبار یا راہیں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی راستہ میں ہماری اپنی کوتاہی یا غلطی کی وجہ سے آپس میں تصادم یا تقابل پیدا ہو جاتا ہے۔ ورنہ حقیقت میں تصادم اور تقابل برائے نام بھی موجود نہیں. نکتہ یہ ہے کہ نظام ہستی کا یہ اختلاف آخر کار ایک بہت بڑی باقاعدگی کا باعث ہو جاتا ہے۔ جو عام نظروں سے یقیناً مخفی ہوتا ہے۔ اور یہی باقاعدگی خالق کے بے علت وجود اور کامل علم کا پرتو ہے.

حضور بادشاہ جانؒ کی بیعت اور خدادوست خان کاکڑ کی معیت:۔

غرض یہ کہ جب حضور بادشاہ جانؒ نے حضرت خواجہ راجہ شیخ سائیں محمد عظیمؒ سے بیعت فرمائی۔ تو واپس پشاور تشریف لے آئے. یہاں چند دن قیام فرما کر بار دگر عازم ہندوستان ہو گئے۔ وہاں پر ان کے ایک محب قلبی خدادوست خان کاکڑ ان کیلئے چشم براہ تھے۔ خدادوست خان کا پیشہ بھی ٹھیکیداری تھا. وہ ایک علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ بڑے پر وقار، پیکر سخاوت، صاحب اخلاق فاضل اور گونا گوں خوبیوں کے مالک تھے۔ حضور بادشاہ جانؒ جب

دوسری مرتبہ اپنے مرشد حضور سائیں محمد عظیمؒ کی خدمت اقدس میں سلام عرض کرنے کے لئے حاضر ہورہے تھے تو خدادوست خان کاکڑ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اور اسی موقع پر انہوں نے حضور سائیں محمد عظیمؒ سے بیعت کرلی تھی۔

خدادوستؒ خان کاکڑ کو ہم سب ''کاکا'' کہہ کر پکارتے۔ ایک حیثیت سے وہ ہمارے طریقت کے چچا لگتے تھے۔ اور دوسری حیثیت سے ہمارے پیر بھائی بھی ہوتے تھے۔ وہ اس طرح کے حضور سائیں صاحبؒ کا پردہ فرمانے کے بعد ''کاکا'' نے راہ سلوک کی تکمیل ہمارے مرشد پاکؒ سے کی تھی۔ حضور بادشاہ جان سے ان کی والہانہ محبت اور پرخلوص الفت کی کیفیت یہ تھی کہ وہ دل جان سے حضور بادشاہ جانؒ پر فدا تھے۔ چونکہ عیال دار نہ تھے۔ اس لئے جو کچھ کماتے بلا پس وپیش حضور بادشاہ جانؒ کی نذر کرتے اور اگر اجمیر شریف میں حاضری دیتے تو وہاں کے مساکین کی عید ہوجاتی۔ کاکاؒ کی عادت تھی کہ آٹھ روپیہ سے کم کسی مسکین کو نہ دیتے۔ اور زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ نہ تو کسی کو ان کی آمد کا علم ہوتا اور نہ ہی رخصت ہونے کی خبر۔ بس ناگہانی طور پر ایک رہرو یا بن بلائے مہمان کی طرح آجاتے۔ اور اسی طرح ان کی آمد ورفت عجیب وغریب ہوتی تھی۔ جیسے وہ خود نادر اور منفرد شخصیت کے مالک تھے۔

کاکاؒ کی وفات بعارضہ دمہ واقع ہوئی تھی۔ اور اس وقت وہ پشاور میں تھے۔ جبکہ ان کو مرض کے شدید دورے پڑنا شروع ہوگئے تھے۔ مادی اور روحانی ہر دو طریقوں پر علاج معالجہ ہوتا رہا حضور بادشاہ جانؒ کو ان کی صحت کے بارے میں بڑی تشویش تھی۔ بارے چند دنوں کے بعد افاقہ ہوگیا۔ اور افاقہ ہوتے ہی اپنے ٹھیکیداری کے کام پر تشریف لے گئے۔ ان دنوں انہوں نے سکھر (سندھ) میں ایک ٹھیکہ لیا تھا. اور سکھر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے رحلت فرمانے کے دن وہاں کے ایک کبیر الشان ولی اللہ نے اپنے سجادہ نشین کو خواب میں ہدایت فرمائی. کہ ''آج خاندان چشتیہ کے ایک ولی نے پردہ کرلیا ہے۔ لہذا میرے قبرستان میں جو جگہ خالی ہے اس کو اس جگہ دفن کرنے کا انتظام کرلو'' امر واقعہ یہ تھا کہ مذکورہ خالی جگہ سجادہ نشین صاحب کسی اور کو دینے پر راضی نہ تھے۔ مگر خدادوست خانؒ کو طوعاً وکرھاً اسی جگہ دفن کرایا گیا. اصل میں سجادہ نشین صاحب کا خیال تھا. کہ خود وہاں دفن ہو. بہر حال حضور مرشد پاکؒ کو کاکاؒ کی وفات سے جو رنج ہوا وہ بے انداز تھا. میں نے بھی کاکا کا ایک مرثیہ لکھا تھا.

(باب ۳)

رشد و ہدایت کی ابتدا

1931ء میں حضور بادشاہ جانؒ کے مریدوں کی ایک جماعت نڑاں (آزاد کشمیر) گئی تھی۔ان میں سے ایک میں بھی تھا. یہ وہ زمانہ تھا. کہ ہنوز میں نے حضور فخر العلماء الاولیاءؒ سے باقاعدہ طور پر بیعت نہ کی تھی۔ اگر چہ ویسے تو ان کی ملکوتی صحبت میں شمولیت کی سعادت 1924ء سے حاصل تھی۔ بہر حال ان دنوں حضور بادشاہ جانؒ نے حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کے مزار پر انوار کو پختہ طور پر تعمیر نہ کرایا تھا. البتہ بعد میں مزار اقدس پر گنبد بنانے کے علاوہ اندرونی مزارات کو بھی پختہ کر دیا. حضور سائیں صاحبؒ سے قبل ان کے سعادت مند صاحب زادے جناب سائیں محمد یعقوبؒ نے وصال فرمایا تھا. اور جب حضور سائیں صاحبؒ کے بعد مکرمہ و معظمہ مائی صاحبہؒ نے پردہ فرمایا. تو رابعہء دہر کا مدفن حضور سائیں صاحبؒ اور جناب سائیں محمد یعقوب صاحبؒ کی ابدی خوابگاہوں کے درمیان بنایا گیا. گنبد مبارک کے باہر دیگر لوگوں کی قبریں ہیں. انہی میں سے ایک قبر ملا ولی جان شنواری کی ہے۔ جن کو حضور بادشاہ جانؒ کے بالکا ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ ملا ولی اللہ جان بڑے سادہ مگر غضب کے غصیلے تھے۔ ان کا ایک واقعہ یاد ہے۔

ملا ولی جان کا ایک واقعہ:۔

ایک شب کو حضور بادشاہ جانؒ ڈبگری بازار میں میر غلام بنجارے کی دکان میں رونق افروز تھے. (یاد رہے۔ کہ فخر العلماء الاولیاءؒ کی اول سے لیکر آخر تک ذاتی طور پر اپنی کوئی جگہ نہ تھی) اسوقت حضو بادشاہ جانؒ دکان کے بیرونی تختے پر تشریف فرما تھے۔ اور میرے مشفق حقیقی ملک برادر خانؒ مرشد پاکؒ کی خوشنودی طبع کے لئے رباب بجا رہے تھے۔ (بعد میں اپنے بھائی کی جگہ یہ فریضہ عرصۂ دراز تک میں انجام دیتا رہا) اسی اثناء میں ہم نے دیکھا کہ ایک شخص حضور بادشاہ جانؒ کی طرف آ رہا ہے۔۔ مگر حیرت انگیز بات یہ تھی۔ کہ اس شخص کے سر پر بیل کی طرح دو عدد لمبے سینگ تھے۔ وہ شخص تیزی سے آیا اور بلا تائل حضور بادشاہ جانؒ کے قدموں میں گر گیا. اور معاً دست بستہ التجا کی۔ کہ حضور! بخدا! میری مثال بیل کی سی ہے۔ آپ مجھ پر کیوں خفہ ہوتے ہیں؟'' حضور بادشاہ جانؒ نے متبسم ہو کر ارشاد فرمایا:۔

''ملا ولی جان! بھلا میں کیوں ناراض ہونے لگا مگر خود تمہارا غیض و غضب ہی قیامت خیز ہے''۔

مارگل اور رشی بابا میں چلہ کشی اور ملا ولی جان :۔

یہی ملا ولی جان تھے۔ جنہوں نے اپنی تُند مزاجی کی وجہ سے کئی کئی بار حضور بادشاہ جانؒ کو ناراض کیا تھا. حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ :۔

"حضور سائیں صاحبؒ سے ملاقات کرنے سے قبل کسی زمانے میں میں نے مارگل پہاڑی کی چوٹی پر چلہ کشی شروع کی تھی۔ مگر اتفاق ایسا ہوا کہ چلہ کشی تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ اس کے بعد ایک اور چلہ کشمیر کے رشی بابا میں شروع کیا. وہاں پر عوام الناس کو یقین تھا. کہ یہ شخص کسی صورت میں یہاں سے زندہ اور سلامت نہ نکلے گا. ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ جو کوئی بھی راتوں کو رشی بابا کے احاطے میں رہے گا. تو بچ کر زندہ نہ رہے گا. بہر حال ان دونوں چلوں کے دوران ملا ولی جان میرے ساتھ رہا. وہ ہر شام کو صرف ایک پاؤ دودھ مجھے لا کر دیتا۔ جس میں کھجور کے دو عدد ابالے ہوئے دانے بھی ہوتے تھے۔ اور یہی میرے شب و روز کا طعام ہوتا تھا.

انہی دنوں ملا ولی جان بازار چلا گیا اور وہاں پر کسی ہندو کے ساتھ مشت و گریبان ہو کر اس کو بری طرح زد و کوب کیا. طرفہ یہ کہ قرب و جوار کے ہندو مسلم مل کر میرے پاس آئے۔ اور سب نے ہاتھ جوڑ کر اور قسمیں کھا کر مجھے یقین دلایا کہ گویا بازار کے ہنگامے میں سارا قصور مضروب ہندو کا ہے۔ اور ملا ولی جان ہرگز قصوروار نہیں. مگر صاف ظاہر تھا کہ سارا فساد میرے مرید نے کیا تھا. اور زیادتی بھی اسی کی طرف سے ہوئی تھی۔ مگر مقام حیرت ہے کہ لوگوں نے اسے قطعی طور پر بری الذمہ قرار دیا. فی الحقیقت اس کی اصل وجہ رشی بابا میں میری چلہ کشی اور پھر معجزانہ طور پر بقید حیات رہنا تھا. اور لامحالہ ان کے دلوں پر میری ہیبت، رعب اور میری تقدیس چھا گئی. اس پر مستزاد اسی علاقے کے ایک معروف بزرگ اور نامور صوفی سید احمد صاحبؒ کو رشی بابا میں میرے چلے کھینچنے کا علم ہوا. تو وہ بکمال سرعت گھوڑے پر سوار ہو کر میرے پاس آئے مجھے چلے سے باہر نکالا اور کرم فرما کر چاروں طریقوں میں خلافت عطا کر دی"

اسی خلافت نامے کو میں نے دیکھنے اور پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

نڑاں میں حضور سائیں صاحبؒ کی جائے وفات :۔

بہر نوع زیر بحث یہ تھا. کہ 1931ء میں ہمارے پیر بھائیوں کا ایک گروہ نڑاں گیا تھا. اسی موقع پر مکرمہ و معظمہ مائی صاحبہؒ نے مجھے اپنے حضور میں طلب فرمایا. حسن اتفاق سے اس وقت وہ رابعۂ دہرؒ اس واجب التعظیم اور متبرک کمرہ میں تشریف فرما تھیں جس میں حضرت خواجہ شیخ سائیں محمد عظیمؒ نے وصال فرمایا تھا. اس مقدس مقام کے گرد لکڑی کا ایک جنگلہ سا بنا دیا گیا تھا.

حسب الارشاد جب میں اس رابعہ دہر کے حضور میں حاضر ہوا تو سب سے پہلے میں نے اس معظمہ سے اسی جنگلے کے بارے میں پوچھ لیا۔ کہ یہ جنگلہ کیوں بنا ہے؟ میرے سوال کے جواب میں اس رابعہ عصر نے ارشاد فرمایا کہ ''دراصل یہ وہ متبرک مقام ہے جہاں اکثر اوقات حضرتؒ ذکر وفکر میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اور ایک روز اسی جگہ تشریف رکھتے تھے۔ کہ مجھے بلا کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''دیکھو! آج اس دنیا میں میری زندگی کا سب سے آخری دن ہے۔ لہٰذا اگر تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔ تو کہہ سکتی ہو''.

مکرمہ ومعظمہ مائی صاحبہ کا ارشاد ہے۔ کہ ''حضرتؒ کے اس ارشاد سے مجھے اچنبھا ہوا۔ اس لئے کہ وہ تندرست تھے۔ چنانچہ میں نے عرض کیا کہ ''حضرت تو بفضل ایزدی چنگے بھلے ہیں۔ خدانخواستہ یہ کیا ارشاد فرمارہے ہیں؟'' میری گزارش سماعت فرما کر حضرتؒ متبسم ہوئے. اور ارشاد فرمایا کہ:۔

''حضرت حق جل مجدہٗ کی بارگاہ اقدس سے جب بلاوہ آتا ہے تو چنگے بھلے کا سوال درمیان سے اٹھ جاتا ہے بہر حال تمہیں یہاں بلانے کا مقصد یہ تھا کہ اگر تمہاری کوئی دلی آرزو ہو تو کہہ ڈالو''.

محترمہ ومکرمہ مائی صاحبہؒ کا کہنا ہے کہ تب میں اچھی طرح سمجھ گئی کہ حضرتؒ کے وصال کا وقت آ گیا ہے. چنانچہ ان کی خدمت اقدس میں اپنے فرزند محمد اکبر کے بارے میں عرض کر دیا کہ ''حضرتؒ کی وفات کے بعد وہ کیا کرے گا؟ میری گزارش سماعت فرما کر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ:۔ ''تم اس کا فکر نہ کرو محمد اکبرؒ کو میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں رکھی اور تم تسلی رکھو کہ میرے بعد وہ حکومت کرے گا. البتہ جہاں تک اس اصل امانت کا تعلق ہے جو خصوصی طور پر میرے سپرد کی گئی تھی تو وہ سید عبدالستار بادشاہؒ کے حوالے کی گئی''.

محترمہ ومکرمہ مائی صاحبہؒ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ پردہ فرماتے وقت حضور سائیں صاحبؒ کے سر مبارک اور ریش مبارک کے بال سب سفید تھے۔ لیکن وصل کے بعد سر اور ریش مبارک کے آدھے آدھے بال سیاہ ہو گئے.

حضور بادشاہ جانؒ کو پشاور جانے کا حکم:۔

حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے. کہ:۔

''جب حضو سائیں محمد عظیمؒ نے وصال فرمایا۔ تو اس وقت میں بمبئی میں تھا بمبئی ہی میں مجھے میری امانت مل گئی چنانچہ بمبئی سے چل کر میں نے براستہ احمد آباد اجمیر شریف میں حاضری دی۔ اور حضرت سلطان الہند خواجہ خواجگانؒ کی خدمت اقدس میں ہدیہ سلام پیش کرنے کی خاطر حاضر ہوا۔ اجمیر شریف میں چند ایام گزارنے کے بعد جونہی حضور سلطان الہند خواجہ بزرگ معین الدین حسن سنجریؒ کی بارگاہ اقدس سے پشاور جانے کا حکم صادر ہوا تو میں پشاور چلا آیا''.

پشاور میں قیام اور حلقۂ معتقدین:۔

قدرت خداوندی ہے کہ پشاور کے ساتھ حضور بادشاہ جانؒ کو پہلے ہی سے بڑا انس تھا. اور بفضلہ اس عالی قدر حکم کا صدور عین ان کے منشا کے مطابق ہوا. اس سے قبل جب کبھی حضور بادشاہ جانؒ پشاور تشریف لاتے تو سلطان نامی موچی کی دکان میں ٹھہرتے ۔ اور جب حکما یہاں تشریف لائے تو بھی سلطان مذکورہ کی دکان میں رہائش اختیار فرمائی.
کچھ عرصے کے لئے مذکورہ دکان میں بودو باش رکھنے کے بعد اسی ڈبگری بازار میں ایک اور دکان میں منتقل ہوگئے. اور اب کی بار یہ دکان حضور بادشاہ جانؒ کے ایک مرید زرین خان آفریدی کی تھی جن کا پیشہ خیاطی تھا. اس دکان میں دو چار پائیاں سما سکتی تھیں. البتہ اس کے علاوہ چھ سے لیکر آٹھ آدمیوں کے لئے زمین پر بیٹھنے کی گنجائش نکل سکتی تھی ۔ دکان کے باہر دروازہ سے ملحقہ تختے پر جلوہ افروز ہوکر حضور بادشاہ جانؒ بازار کا تماشہ دیکھتے جیسا کہ میر غلام بنجارے کی دکان کے سلسلے میں کسی جگہ مذکور ہو چکا ہے۔ میر غلام کی دکان سے ذرا آگے حضور بادشاہ جانؒ عملی نامی نسوار فروش کی جگہ میں منتقل ہوگئے. اس دوران میں حضور بادشاہ جانؒ سے جمعہ خان، زرین خان، کٹور شاہ، جان ولی، محمد ایوب اور چند دوسرے احباب نے بھی بیعت کی تھی. حضور بادشاہ جانؒ بعد از نماز عشاء کھانا تناول فرماتے اور اس کے بعد رباب سماعت فرماتے ۔ رباب بجانے کا شرف میرے بڑے بھائی ملک باور خان کو حاصل تھا. گلاب مرحوم اور جان ولی مرحوم گھڑا بجاتے اور کبھی جان ولی یا کوئی اور غزل ورباعی گاتے. رستم خان میرا ایک پیر بھائی اس وقت چھوٹا تھا. زرین خان سے درزی کا کام سیکھتا تھا. بعد میں وہ حضور کے آستانہ میں لوگوں کو پانی پلانے پر مامور تھا. خصوصاً حضور ہی اس سے پانی مانگا کرتے ۔ نیز حضور بادشاہ جانؒ کا قاعدہ مبارک تھا. کہ ہر چاند کی ساتویں رات کو حضرت سلطان الہند غریب نواز خواجہ خواجگان معین الدین حسن سنجریؒ کا ختم شریف کرتے ختم شریف کے بعد سماع کا اہتمام ہوتا. محفل سماع حضور بادشاہ جانؒ کی جائے رہائش کے اوپر ہی ایک چھوٹے سے بالا خانے میں منعقد ہوتی. اور دس بارہ نفوس کے لگ بھگ اس مبارک محفل میں شریک ہوتے برادرم باور خان قوالوں کے ساتھ مل کر بھی رباب بجاتے علاوہ ازیں میرے ایک دوسرے بڑے بھائی ملک بلخی خان کو ان کے پیر روشن ضمیر سید نور علی شاہ بادشاہؒ نے ہدایت کی تھی کہ وہ حضور بادشاہ جانؒ کی ملکوتی مجلس میں نشست و برخاست کو اپنا شعار بنادے. چنانچہ برادرم بلخی خان اپنے پیرومرشد کے ارشاد کے مطابق حضور بادشاہ جانؒ کی قدسی محفل میں شمولیت کرتے ۔ پھر انہوں نے اپنے دوسرے بھائی یعنی برادرم ملک باور خان کو بھی اس سعادت کی پیش کش کی ۔ لہذا برادرم ملک باور خان بھی حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں حاضر رہتے ۔

حضور بادشاہ جانؒ سے میری اولین ملاقات:۔

جہاں تک خود میرا تعلق ہے۔تو یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ میں اسلامیہ کالجیٹ ہائی سکول میں زیر تعلیم تھا.ایک روز جو میں اپنے بڑے بھائی ملک بلخی خان کے ہمراہ پشاور آیا.تو دیکھا کہ وہ شہباز ملک ملکوتؒ اسی تختے پر جلوہ افروز ہیں.اور بازار کی سیر وتماشے میں مصروف ہیں.اس سے ذرا پہلے میرے محترم ومکرم بھائی جان نے مجھے چوکنا فرماتے ہوئے کہا تھا.کہ دیکھ لڑکے!وہ سامنے حضور بادشاہ جانؒ تشریف فرما ہیں'' چنانچہ قریب پہنچ کر میں نے ہدیہ سلام پیش کیا.یکا یک رخ انور میری جانب مڑ گیا.اللہ اکبر!اس آفاقی نگاہ اولین کی کیا بات تھی۔اور معلوم نہیں کہ اس صہبائی نظر میں کس قسم کی برقی قوت تھی۔جو آناً فاناً میرے روئیں روئیں میں سرایت کر گئی.میرے ننھے سے دل کے ساز خود بخود بجنے لگے۔اور بیک محبت کا پر درد نغمہ چھڑ گیا.آنکھوں نے بھی دل کا ساتھ دیا.چنانچہ ان سے معصوم آنسوؤں کی لڑی ڈھلک گئی.گویا ان مقدس نگاہوں کے قدم رنجہ فرمانے کے لئے چھڑکاؤ کا سامان ہو رہا تھا.حضور بادشاہ جانؒ نے میرے ہدیہ سلام کے جواب میں اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں موتی بکھیرے.''وعلیکم السلام!امیر حمزہ خوش آمدی''.
میں نے آگے بڑھ کر دست ہائے مبارک کو بوسہ دیدیا.اور ایک طرف بیٹھ گیا.اس وقت میری عمر پندرہ یا سولہ برس کی ہوگی.اور یہی فخر العلماء الاولیاء سے میری سب سے پہلی ملاقات تھی۔اب معلوم نہیں کہ حضورؒ ایسے ہی میرے نام سے واقف تھے یا اس سے فوراً قبل کسی نے میرا بازار میں آتے آتے تعارف کرادیا تھا.بہرنوع وہ مجھے پہنچانتے تھے۔اور میں آنس ومحبت کی وہ پر کیف گھڑی پوری صراحت کے ساتھ الفاظ میں نہیں بیان کرسکتا۔وہ ایک لاجواب وقت تھا.اور کافی دیر تک میں دم بخود مکمل محو سکوت تھا.میری زبان گنگ تھی .اور ایک روح دوسری روح سے سرگرم ملاقات تھی۔جیسے دونوں روحیں باہم دگر محب اور آشنا ہوں.شاید عالم امر اور عالم مثال میں بھی ہم راز ودمساز ہوں۔اوراب۔جبکہ۔مدت مدید کے بعد عالم شہادت میں ملاقی ہوئیں تو اسقدر طویل عرصہ کے بعد اثنائے ملاقات میں خوشی کے آنسو ابل پڑے.

حضورؒ کی زبردست توجہ اور حسن اخلاق:۔

دراصل حضور بادشاہ جانؒ کی توجہ اتنی پُر تاثیر تھی۔کہ اگر ایک بار بھی کسی کی طرف محبت بھری نگاہ سے دیکھ لیتے تو اس شخص کے لئے اس نگاہ لطف وکرم کا برداشت کرنا قطعی طور پر ناممکن ہوتا.الغرض اس کے بعد میں کبھی کبھی خدمت اقدس میں حاضری دیتا.محفل سماع میں شرکت کرتا.اور اپنے ڈیرے میں بھی رباب سنتا.

حضور بادشاہ جانؒ کو ہر ایک کی دلداری منظور ہوتی تھی .اور ہر ایک کا ناز اٹھاتے ۔کسی موقع پر بھی کسی شخص کے خلاف گفتگو نہ فرماتے .حیا کا یہ عالم تھا .کہ اگر کوئی شخص ان سے معافی طلب کرنے کی خاطر حاضر ہوتا .تو خود حضور بادشاہ جانؒ کے مبارک گالوں میں حیا کی سرخی نمودار ہوتی اور نگاہیں نیچے فرما لیتے تھے ۔صبر و تحمل کا یہ حال تھا .کہ بعض ملایان خشک نے برملا طور پر یہ بدگوئی اور ستم شعاری اختیار کی تھی ۔حضور مرشد پاکؒ کو ان کی بدکلامی اور ستم ایجادی کی خبریں باقاعدہ پہنچتی تھیں .مگر اس کے باوجود نہایت نرمی سے ارشاد فرما دیتے ۔کہ:۔

قل کل یعمل علے شاکلته (کہہ دے اے پیغمبر ﷺ ہر انسان اپنے طور طریقے کے مطابق عمل کرتا ہے)

مجال نہیں کہ جواب میں کبھی برا بھلا یا نامناسب الفاظ سنے گئے ہوں ۔اور تو اور حضور بادشاہ جانؒ تو نماز و صلوٰۃ کے بارے میں بھی کسی کو ہدف ملامت نہ فرمایا کرتے تھے ۔نہ ہی کسی کو لمبی چوڑی داڑھی رکھنے کا ارشاد فرماتے ۔

حضور بادشاہ جانؒ کی حکیمانہ حکمت عملی:۔

ایک بار کسی نے حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت میں عرض بھی کیا تھا کہ حضورؒ !آپ تو کبھی بھی کسی سے یہ ارشاد نہیں فرماتے کہ فلاں کام کرو اور فلاں نہ کرو. آخر اس کی وجہ کیا ہے ؟'' جواباً حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

'' ایسا زمانہ آ گیا ہے ۔کہ اگر ہم پند و نصیحت کے اس طریقے کو اپنائیں تو کوئی فرد بشر بھی ہمارے قریب نہ آئیگا .اس سلسلے میں ہماری حکمت عملی آیت ربانی پر عمل پیرا ہونے کے عین مطابق ہے ۔وہ جو ارشاد ربانی ہے کہ (ترجمہ:۔اے پیغمبر ﷺ !اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور اچھی اچھی نصیحتوں کے ساتھ بلاؤ).

صوفیائے کرام قدس اسرارہم کا اصولی مسلک:۔

میں کہتا ہوں کہ جماعت صوفیہ صافیہ قدس اسرارہم کا یہ اصولی مسلک بالکل صحیح اور درست ہے ۔کہ ابتدا میں ان کا معمول کچھ اس انداز کا ہوتا ہے .کہ سب سے پہلے وہ سالک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں .اور جب اس کے رجوع کا محور بہ ہمہ وجوہ اپنا شیخ ہو جاتا ہے .تو اس مرحلہ کو طے کر لینے کے بعد شیخ سالک کو محض اس مقدار تک ارشاد فرماتا ہے ۔جس کا وہ متحمل ہو سکتا ہو ۔اور اس کو برداشت کرنے کی قوت بھی رکھتا ہو .نماز کے بارے میں حضور مرشد پاکؒ صرف اس حد تک ارشاد فرماتے کہ:۔

''ارے جوانو! نماز کی پابندی ضروری ہے۔'' مقصد یہ کہ براہ راست کسی شخص کو مخاطب نہ فرماتے تھے۔

زنا کاری سے بچنے کی شدید تلقین:۔

البتہ ایک امر ایسا تھا۔ جس سے بچنے کے لئے حضور بادشاہ جانؒ اپنے مریدین و معتقدین کو پوری شدت سے تلقین فرماتے۔ اور وہ زنا کاری تھی۔ لیکن اس قسم کی تلقین بھی اشارتاً اور کنایتاً ہوتی۔ حضور مرشد پاکؒ اسی فعل قبیح کے بارے میں اکثر ارشاد فرماتے۔

''زنا کاری کے فعل شنیع کے علاوہ کوئی بھی دوسرا گناہ سالک کی روحانیت کو فنا نہیں کر سکتا۔''

ایک سید زادے کو تلقین:۔

یہ واقعہ 1952ء کا ہے کہ ایک سید زادہ حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت عالیہ میں بیعت لینے کے لئے حاضر ہوا۔ بیعت ہو چکنے کے بعد سید صاحب سے ارشاد ہوا کہ:۔

''بادشاہ صاحب! ویسے تو باتیں بہت ہیں۔ لیکن مختصر طور پر بنیادی بات کان لگا کر سن لو۔ کہ آزار بند کو پوری مضبوطی سے گانٹھ گٹھیلا رکھو۔ مابقایا خیریت رہے گی۔''

حضور بادشاہ جانؒ کی مردم شناسی:۔

فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ کی صحبت بابرکت میں جتنا عرصہ مجھے بیٹھنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ تو میں اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں۔ کہ وہ پہلی نظر میں کسی نو وارد شخص کے چہرہ مہرہ کو پڑھ لیتے تھے۔ اور اسے پوری طرح تول کر جس حیثیت کا وہ شخص ہوتا تھا اسی مناسبت سے اس کے ساتھ تعلق رکھتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ حضور بادشاہ جانؒ صبح اور عصر کے وقت ڈھگری بازار کی سلطان سرائے کی ڈیوڑھی میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ ایک روز حضور مرشد پاکؒ چائے نوش فرما رہے تھے۔ (عادت مبارک تھی کہ دونوں وقت کی چائے اسی جگہ نوش فرمایا کرتے تھے) کہ اتنے میں ایک نو وارد دکھائی دیا۔ اس ہیئت کذائی کے ساتھ۔ کہ برف کی طرح سفید ریش مبارک، سبز عبا زیب تن۔ سر پر سبز عمامہ شریف۔ ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں تسبیح کھنکھٹاتا ہوا بڑی متانت اور پروقار طریقے سے تانگہ سے اترا۔ اور سیدھا حضور بادشاہ جانؒ کی طرف آنے لگا۔ حضور مرشد پاکؒ جس چارپائی میں تشریف رکھتے تھے اس کے سرہانے سے ملحقہ دوسری چارپائی کی پائینتی کو میں بیٹھا تھا۔ اور ایسے موقعوں پر عام طور پر قاعدہ یہ ہوتا تھا کہ جب کبھی اس ہیئت کا کوئی مہمان وارد ہوتا تو ہم لوگ اس کے لئے جگہ خالی کرتے۔

ڈیوڑھی کا راستہ اتنا لمبا چوڑا تھا نہیں ۔ مزید برآں قریب ہی شیخ رفیع الدین چائے فروش کی دکان تھی ۔ محدود سی جگہ میں دو تین عدد کرسیاں بھی حضور مرشد پاکؒ کی چارپائی کے پاس رکھی رہتی تھیں. مالکان سرائے کو بھی حضور بادشاہ جانؒ کی دلبندی اور دل آرائی منظور تھی ۔ اس لئے وہ بھی جگہ کی تنگی کی شکایت کا حرف زبان پر نہ لاتے تھے ۔ خیر! تو جونہی میں نے اس خضر صورت بزرگ کو دیکھا تو حسب معمول اپنی جگہ سے اٹھنے کا ارادہ کرلیا.مگر اسی دوران جب میں نے حضور بادشاہ جانؒ کی طرف دیکھا تو ابروئے مبارک کو شکن آلود پایا. معاً انہوں نے مجھے کچھ اس انداز سے اشارہ کر کے سمجھا دیا. کہ گویا ارشاد فرمارہے ہوں ۔ کہ اپنی جگہ سے ہلنے کی ضرورت نہیں اور آرام سے بیٹھے رہو ۔ اتنے میں سفید ریش ہستی نے حضور بادشاہ جانؒ سے مصافحہ کرلیا. اور اس کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ گئے ۔ کچھ دیر تو ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی ۔ بعد ازیں اس پیر زر نے حضور بادشاہ جانؒ سے چند روپوں کا سوال کیا ۔ حضور مرشد پاکؒ کی عادت مبارک تھی. کہ اکثر اوقات اپنی جیب میں ریزگاری یا روپوں کے چھوٹے نوٹ نہ رکھتے تھے ۔ اور اگر بہ فرض محال جیب میں روپے پیسے ہوتے تو بے جا مصرف میں ہرگز نہ لاتے ۔ چنانچہ اس پیر ہفت خلد سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''شیخ صاحب! خود ہم نے یہاں پر لوگوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسا دیا ہے ۔ اب فرمائیے کہ آپ کو کیا دے سکیں گے؟

مگر وہ پیر سال چونک سے بھی گیا گزرا ایسا چالاک اور پیشہ ور گداگر تھا کہ پے در پے اپنے سوال کو دہراتا. اور اقسام وانواع کے محاورات اور ضرب الامثال سے اسے تقویت دیتا. یہاں تک کہ حضور بادشاہ جانؒ کو ارشاد فرمانا پڑا کہ:۔

''کہ صاحب! اس وقت تو میرے پاس ٹوٹے ہوئے روپے نہیں ہیں. ہاں! اس چائے والے کو کہہ دیں گے کہ آپ کو ایک روپیہ دیدے''.

چنانچہ شیخ رفیع الدین سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''شیخ صاحب! اس بزرگ کو ایک روپیہ عنایت کر دیجئے.'' شیخ رفیع الدین سے روپیہ لیکر جب وہ بوڑھا رخصت ہوا. تو حضور بادشاہ جانؒ نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر شیخ رفیع الدین سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''میاں! اس سے اپنا روپیہ لے لو''.

تو تذکرہ ہو رہا تھا کہ حضور بادشاہ جانؒ ہر آدمی سے اس کی حیثیت اور ظرف کے مطابق سلوک فرمایا کرتے تھے ۔

دوران تربیت انتہائی خوف کے بارے میں میری گزارش:۔

حضور مرشد پاکؒ کی تربیت دینے کے طریقے میں رجا سے خوف کا عنصر بڑھ چڑھ کر ہوتا تھا۔اسی لئے ایک مناسب موقع پر میں نے ان سے دریافت کیا تھا۔کہ ''حضورؒ! یہ اس قدر بے پناہ خوف تو کسی مسلمان کے لئے بالعموم اور ایک پختون کے لئے بالخصوص زہر قاتل کے مترادف ہے۔ یہاں تک کہ باوجودیکہ میں کہستانوں کے دلاور اور جرات مند پختونوں کے قبیلہ شنواری کا ایک فرد ہوں۔مگر میرے دل کی کمزوری اور خوف کا یہ عالم ہے کہ اگر کہیں سے بندوق کی شلک سن لوں۔تو مارے گھبراہٹ کے میری حالت بڑی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔حضورؒ! آخر اتنی کمزوردلی بھی تو نہ چاہئے۔اور مانا کہ ہندو تصوف میں یہ حالت ناگزیر ہوتی ہے۔لیکن میرے خیال میں اسلامی تصوف سے تو کسی صورت میں زیب نہیں دیتی۔حضور! اگر جہاد کا موقعہ آ گیا تو میری حالت بعینہٖ اس صوفی کی سی ہو جائے گی۔جو جہاد پر گیا تھا۔اور مولانائے روم قدس سرہٗ نے اس کا یوں ذکر کیا ہے۔کہ جونہی اس صوفی نے میدان جنگ میں تلواروں کی جھنکاروں کو سنا اور گھوڑوں کی یلغاروں کو بچشم خود دیکھا تو بے چارہ بیہوش ہو گیا''۔

شدت خوف کا اسرار:۔

میری مندرجہ بالا گزارش سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''تمہاری بات بری نہیں۔لیکن یاد رکھنا چاہئے۔کہ اس قسم کے خوف سے مقصود سالک کی اصلاح ہوتی ہے۔اور جب یہ کام مکمل طور پر پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔تو خوف و خطر کا سارا غلبہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ آج کل کے مسلمان تو کسی صورت میں بھی مسلمان کہلانے کا حق نہیں رکھتے۔ وجہ یہ ہے کہ سارا زمانہ الحاد اور مادیت کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔نفسانی خواہشات نے دین و مذہب کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔بہترین استعداد رکھنے والے حضرات کے قلوب پر مادیت کا پرتو پڑ جانے کیوجہ سے سیاہی آ گئی ہے۔ان حالات میں جب تک ان پر انتہائی خوف اور متواتر تکالیف نہ آئیں گی۔ان کے باغی نفس حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف مائل نہ ہوں گے۔(بالفاظ دیگر) جب تک سالک کا برزخ نہ بنے گا۔تو وہ حقائق کا ادراک بھی نہ کر سکے گا۔یعنی جب تک آئینہ صاف نہ ہوگا۔تو صورت کے انعکاس کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔البتہ اگلے زمانے کے لوگ بڑے دیندار اور طالبان حق ہوتے تھے۔اس لئے کہ تھوڑا سا مجاہدہ کر کے ان کا برزخ بن جایا کرتا تھا۔مگر آج کل ہمارے زمانے میں تو ہزارہا آدمیوں میں سے بمشکل ہی کوئی ایک شخص ایسا ملے

گا۔لہذا خوف ہی ایک ایسی چیز ہے جو انسانی فطرت اور حواس کے لئے دھنیئے کا کام دیتا ہے؟۔

خشیت الٰہی اور خوف مرگ:۔

میں نے دوبارہ عرض کیا.کہ ''حضور کا ارشاد بجا ہے لیکن بات یہ ہے کہ حضورؒ! اصل مسئلہ یہ ہے۔کہ آدمی کے دل میں خوف خداوندی ہونا چاہئے نہ کہ ہر وقت وہ موت سے خوفزدہ اور ہراسان ہوتا پھرے.اور ہمارا یہی حال ہے کہ بس موت سے خوفزدہ ہیں اور یہ ایک مسلمان کے لئے قطعاً شایان شان نہیں.کہ ہر لمحہ اس کے سر پر موت کا خطرہ سوار رہے۔

مسلمان اور خوف الٰہی:۔

میری گزارش سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''دیکھو! تم نے دوبارہ مسلمان کا نام لے لیا۔ارے جو شخص صحیح معنوں میں مسلمان ہوگا۔وہ کاہیکو موت سے ڈرنے گا؟ مقصد صرف یہی تھا کہ اسی خوف ہی کا نسخہ ایسے صحیح مسلمانوں کو تیار کراتا ہے ۔اگر چہ یہ خوف ابتداء میں موت سے ڈرنے کے ماسوا اور کچھ نہیں ہوتا.اس لئے کہ ابتداً آدمی مادیت کے زیر اثر ہوتا ہے۔چنانچہ اسی کے ردعمل کے طور پر موت سے ڈرتا ہے۔لیکن جس وقت برزخ بن جاتا ہے۔تو پھر یہی خوف خشیت الٰہی عزوجل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اس قسم کے خوف کا ردعمل یہ ہوتا ہے۔کہ آدمی شریعت کے تمام اصولوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔اور صحیح معنوں میں مسلمان کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔''

خوف سے متعلق 1947ء کا ایک واقعہ:۔

میں کہتا ہوں کہ حضور بادشاہ جانؒ کا یہ ارشاد بالکل بجا اور درست ہے۔وجہ یہ ہے کہ اگر تصوف میں دل کے کمزور ہو جانے کا خطرہ ہوتا تو حضور بادشاہ جانؒ کا دل بھی کمزور ہوتا۔مگر خداوند قدوس کے فضل سے ایسا نہ تھا.اس لئے کہ 1947ء میں جن دنوں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے ۔اور ہر طرف اندھا دھند گولیاں چل رہی تھیں تو اسی ہولناک صورت حال میں حضور بادشاہ جانؒ اپنے بالاخانے سے نیچے بازار کی طرف اتر آئے۔اور وہاں سے سیدھے رام داس بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔لوگوں نے عرض کیا کہ ''حضورؒ! سامنے ہندوؤں کے گھروں سے گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔اور نہیں تو اتنا کر لیجئے کہ ذرا احتیاط کے طور پر ایک طرف ہو کر چلیئے''.
مگر حضور بادشاہ جانؒ کوئی پرواہ کیئے بغیر آگے بڑھے جا رہے تھے ۔ دراصل رام داس بازار کی طرف تشریف لے جانے کی وجہ یہ تھی۔کہ اسی علاقے کے قریب میرے بھائی ملک باور خان کا گھر

ہندو آبادی کے عین وسط میں آباد تھا. اور شک نہیں کہ حضور بادشاہ جانؒ برادرم باور خان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ حضور بادشاہ جانؒ ان کا حال احوال معلوم کرنے کے لئے تشریف لے جارہے تھے۔ دس یا بارہ آدمی بھی ان کے ہمراہ تھے گولیاں متواتر چل رہی تھیں. مگر حضور بادشاہ جانؒ کسی چیز کو خاطر میں لائے بغیر پوری بے پرواہی سے آگے آگے تشریف لے جارہے تھے۔ حتیٰ کہ ابھی وہ راستہ ہی میں تھے۔ کہ کسی نے آ کر اطلاع بہم پہنچائی. کہ باور خان اہل وعیال سمیت بخیر وعافیت ہیں. لہذا حضور بادشاہ جاںؒ واپس ہوئے. اور اپنے ڈیرے تشریف لے آئے۔ غرض یہ کہ دوران سلوک میں سالک کو جس قسم کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ تو اس کی اصلی غایت اصلاح ہوتی ہے. بعد میں ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ اس کو موت سے محبت ہو جاتی ہے۔

مجھ پر حضورؒ کی توجہ کا اثر:۔

1930ء کا واقعہ ہے۔ کہ میں پنجاب فلم کمپنی کی ایک فلم میں کام کرنے کے لئے چلا گیا تھا. انہی دنوں میرے والد بزرگوار رحلت فرما گئے۔ میں پنجاب سے واپس اپنے گاؤں آ گیا. حضور بادشاہ جاںؒ بھی تشریف لائے تھے۔ یہ عین میرے شباب کا دور تھا. بلا شبہ ان دنوں میں نفسانی خواہشات کے مکمل نرغے میں تھا. پچیس برس کی عمر! دل میں طرح طرح کے ارمان۔ اور دنیائی ترقی کی خواہش، کافی شہرت حاصل کرنے کی امنگ کے علاوہ ذہن کی دنیا پر مادیت کے عفریت نے پورا قبضہ جمالیا تھا. ایک رات جب میں حجرے سے اپنے گھر چلا گیا اور چارپائی میں دراز ہو گیا. تو یکایک میں نے محسوس کر لیا. کہ میرے پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں. ساتھ ہی میرے بدن سے ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے۔ دل کی حالت لحہ بہ لحہ غیر ہونے لگی. اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی. کہ میرے منہ سے چیخ نکل گئی. معاً میں اٹھ بیٹھا. اور دوسرے لمحے چارپائی سے اتر کر کھڑا ہو گیا. میری اہلیہ میری یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئی. وہ پریشان تھی۔ کہ اسے یہ کیا ہو گیا؟

میری حالت ابتر تھی۔ اور اسی ابتری کی حالت میں بے تحاشہ بھاگ کر حجرے میں حضور بادشاہ جانؒ کی چارپائی کے قریب عین انؒ کے سامنے کھڑا ہو گیا. میرا تن بدن لرز رہا تھا. میں لڑکھڑا رہا تھا. حضور بادشاہ جاںؒ نے دیکھا. تو تسلی وتشفی کے چند کلمات ارشاد فرما کر دم شدہ پانی پلایا. بارے میں کچھ سنبھل گیا. اور تب جا کر آرام کیا. گویا یہ میرے مرشد پاکؒ کی اولین زوردار توجہ تھی۔ اور اب وہ وقت آ گیا تھا کہ حضور بادشاہ جانؒ مجھے مادی دنیا کی آسائشوں سے زبردستی نکال کر روحانی دنیا کی طرف لے آئیں.

بہرحال یہ۔۔۔ ابتداء تھی۔ اور اس کے بعد یہ دورہ وقتاً فوقتاً آتا. جب تکلیف نا قابل برداشت ہوتی۔ تو اور کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر میں مرشد پاکؒ کا تصور کرتا. اور تھوڑی دیر میں محبت کی توجہ وصول کر

لیتا۔ تکالیف فوراً رفع ہو جاتی۔ اور اطمینان آ جاتا۔ مدعا یہ کہ یہی خوف و رجاء کی کیفیت سالک کے برزخ کو تیار کرتی ہے۔

مرشد سے محبت رکھنے کے اثرات:۔

یاد رہے کہ مرشد کے ذریعے یہی محبت حضور سرور کائنات فخر موجودات محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ مطہر اتم و اکمل ﷺ سے قلبی انس اور حق تعالیٰ جل وعلا سے دلی محبت اور تعلق کا سبب بنتی ہے۔ بالآخر جب سالک موت کو خوش آمدید کہہ لیتا ہے اور اسے تسلیم کر کے سر تسلیم خم کر لیتا ہے تو دریں اثناء اطمینان کلی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد اگر کوئی تکلیف آ بھی جائے تو وہ سالک کے لئے موجب زحمت نہیں بلکہ باعث رحمت ہوتی ہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر ست

خوف کے ذریعے روحانی ارتقاء:۔

بلاشبہ مسلسل خوف اور متواتر تکالیف سالک کی روح کو مادیت کی قید سے چھٹکارا دلاتی ہیں۔ اس کا نفس امارہ مغلوب ہو کر نفس ملہمہ اور نفس ملہمہ نفس مطمئنہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی دور میں سالک کی روح کو عالم ملکوت سے ایک خاص قسم کی نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جس میں سالک اس مادی دنیا سے بدرجہا بلند و ارفع ایک اور جہان کو محسوس کر لیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی روح اپنے اصل وطن سے آنے والی شعاعوں کی جھلکیاں موصول کرنے لگ جاتی ہے۔ انہی مراحل میں روح اعظم کے ساتھ تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اب سالک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس دنیا سے اڑ کر نکل جائے اور اسی دنیا میں پہنچ جائے۔ اور یہ وہ دور ہوتا ہے۔ جس میں سالک کو اپنی ہی موت سے پیار ہو جاتا ہے۔

تناسخ کا چکر:۔

کسی زمانے میں خود میرا یہی حال تھا ان دنوں اکثر رات کی خاموش فضا میں مختلف ستاروں کو متواتر دیکھتا اور مجھے ان میں سے بعض ستارے ایسے نظر آتے جیسے میں وہاں بھی بہت عرصہ گزار چکا ہوں۔ بعد میں میرے اس قسم کے تصور نے تناسخ کی شکل اختیار کی اور انتہا یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ میرا یہ خیال وسیع تر ہوتا گیا۔ حالانکہ یہ خیالات مجھے بہت عرصہ سے آیا کرتے تھے۔ مگر میں انہیں بھلا دیتا تھا۔

زیادہ تعجب کی بات تو یہ تھی۔ کہ پیہم واقعات بھی اسی خیال کی تائید میں پیش آتے رہے۔ 1931ء میں پہلی بار میں حضرت شیخ علی ترمذی المعروف پیر بابا قدس سرہٗ کی زیارت کرنے کے لئے علاقہ بنیر روانہ ہو گیا۔ میں اور میرا ساتھی جب ملندری نامی گاؤں پہنچ گئے۔ تو وہ جگہ مجھے جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اب اگر تم میرے ساتھ نہ بھی رہو گے تو بھی میں راستے سے واقف ہو گیا ہوں۔ اور اب کسی کی رہنمائی کے بغیر میں پہاڑی کی چوٹی تک پہنچ سکتا ہوں۔ سو میں روانہ ہو گیا یہاں تک کہ ہم پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ گئے اور میرے ساتھی کو حیرت ہو رہی تھی۔

اسی طرح کئی بار ایسے واقعات رونما ہوتے رہے۔ اور تناسخ پر میرا عقیدہ پختہ ہوتا گیا لیکن کبھی کبھی دل کی گہرائیوں سے اس کی مخالفت میں بھی ایک صدا استتار ہا۔ اور یہی آواز میرے یقین کو متزلزل کر دیتی تھی۔ مگر ظاہر ہے کہ جب ایک بار نفس کسی چیز سے محبت کرنے لگ جائے۔ اور اس سے مطمئن بھی ہو جائے۔ تو پھر زیادہ تر اسی چیز کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ طرفہ یہ کہ عقل بھی اس سودا بازی میں نفس کا ساتھ دینے میں ذرا بھی نہیں کرتی۔ ذہن بھی اپنی معلومات کے تمام دفتر کھول کر سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ اور تناسخ کو ثابت کرنے کے لئے بے شمار دلائل مجھے خود بخود پیش آتے۔ اگرچہ 1931ء سے قبل بھی مجھے اس قسم تصورات آتے رہے۔ لیکن 1940ء کے بعد ان کا زور عروج پر تھا۔

تناسخ کا تصور قطعی بے معنی نہیں:۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ تناسخ کا تصور الحاد کے تصور سے بہت اعلیٰ وارفع ہے۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ تصور قطعی طور پر بے معنی بھی نہیں۔ لیکن ایک بات ذہن نشین رہے۔ کہ اس کا مطلب وہ عقیدہ ہرگز نہیں جو ویدک دہرم نے اپنا لیا ہے۔ بلکہ سمجھ لینا چاہئے۔ کہ یہ ذہن انسانی کی ارتقائی منزل کا ایک پڑاؤ ہے اور در حقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر انسانی نفسیات کے علوم انگڑائی لے لیتے ہیں۔ تاہم یہ الگ بات ہے۔ کہ بعض لوگ اسی مقام میں مستقل طور پر رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسے لوگوں میں اسی مقام سے آگے نکل کر اگلی منزل میں قدم رکھنے کی استطاعت نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ یہاں رک جاتے ہیں۔ اور اسی مقام کو سب سے آخری منزل تصور کر کے تازیست اسی پر قائم رہتے ہیں۔

تناسخ اور مولانائے رومؒ:۔

حضرت مولانائے روم قدس سرہٗ نے بھی چند اشعار ایسے کہے ہیں۔ جن کو بعض ہندوؤں نے تناسخ کو ثابت کرنے کے سلسلے میں دلیل کے طور پر پیش کئے ہیں۔ لیکن متاسفانہ مولانائے روم

قدس سرہٗ کے اشعار کا وہ مقصد قطعی نہیں جو بعض ہندو حضرات نے اخذ کیا ہے۔

ھفت صد و ھفتا و قالب دیدہ ام
ھمچو مثل سبزہ ھا روئیدہ ام

پھر جہاں مولانائے روم قدس سرہٗ نے ارتقائے انسانی کے متعلق اشعار کہے ہیں تو گویا وہ تناسخ کے بنیادی اصولوں کی توضیح اور تشریح معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں. کہ میں نے جماد سے نبات کی شکل، اختیار کی بنات سے حیوان کی صورت میں نمودار ہوا. حیوان سے انسان بنا. انسان کے بعد ملک بن جاؤں گا۔ اور جب ملک کی حیثیت سے مرجاؤں گا. تو وہ چیز بن جاؤں گا. جو بالکل ماورائے ادراک ہے۔ پھر میرا کہنا یہ ہوگا. کہ جہاں سے میں چلا تھا اسی طرف لوٹ آیا.
اب اگر ہم کو ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا بغور تجزیہ کرلیں تو معلوم ہوگا. کہ اس لحاظ سے بھی مولانائے روم قدس سرہٗ معلم اول کا درجہ رکھتے ہیں. رہے اور اگر اواگون پر عقیدہ رکھنے والے تو اگر وہ حضرات مولانائے روم قدس سرہٗ کے ان اشعار کو تناسخ کا بنیادی درجہ کہدیں تو بلا خوف تردید یہ ان کی بہت بڑی بھول ہوگی. وجہ ظاہر ہے وہ یہ کہ مولانائے رومیؒ کا مطلب ہرگز یہ نہیں بلکہ ان کا ارشاد تو یہ ہے کہ ''میں اپنے اس اصلی مقام تک پہنچ جاؤں گا۔ جہاں سے میں چلا تھا''۔
غور فرمائیے۔ کہ اگر ہر چیز کی اصل حق سبحانہ وتعالیٰ ہو۔ اور نیز یہ کہ تمام اشیاء پہلے حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات والاصفات میں مضمر تھیں. حق سبحانہ وتعالیٰ ہی کے ارادے سے بتدریج ظہور میں آ گئیں. اور بالآخر اسی ذات اقدس کی طرف واپس لوٹ کر جائیں گی. تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ کہ بلا شک وشبہ اس نظریئے کی روشنی میں تناسخ کا عقیدہ قطعی طور پر باطل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی مکمل تردید میں کوئی کسر نہیں رہتی۔

ویدک دہرم کا عقیدہ اور اس کا ابطال:۔

جہاں تک ویدک دہرم کا تعلق ہے تو اس کا عقیدہ یہ ہے کہ مادہ اور روح دونوں حق سبحانہ وتعالیٰ کی مخلوق نہیں. اور صریحی طور پر یہ دھرم ان ہر دو انواع کو ''غیر مخلوق'' مانتا ہے۔ البتہ اس قدر ضرور تسلیم کرتا ہے۔ کہ روح اور مادہ صفات کے لحاظ سے حق تعالیٰ جل وعلا کے مقابلے میں کم قوت اور کمزور تھے۔ اس لئے جس طرح ہر طاقتور کمزوروں پر تسلط جما کر حکومت کرتا ہے۔ اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ نے بھی روح اور مادہ کو ترکیب دے کر کائنات عالم کا سلسلہ قائم کردیا. یہ تو رہا ویدک دھرم کا عقیدہ لیکن اگر ان پر یہ سوال وارد کیا جائے کہ اس حالت میں جبکہ مادہ اور روح مخلوق خداوندی نہ ہوں گی. تو لازماً ایک وقت ایسا بھی ہونا چاہئے۔ کہ یہ دونوں چیزیں مرکب نہ ہوں گی. جیسے کہ اس عقیدے کی رو سے ظاہر ہے۔ تو اس صورت میں لامحالہ ان دونوں کو ترکیب

دینے کے لئے وقت کی بھی ضرورت ہوگی۔ اور ہونی چاہئے۔ لہذا ترکیب کی ابتداء بھی ثابت ہو جاتی ہے اور اسی کے ساتھ ہی تناسخ کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے گر جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہر قالب اعمال کے بدلے عطا ہوا کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ابتداء میں اعمال کا موجود ہونا محال ہوگا۔ اور جب سرے سے اعمال ہی نہ ہوں گے تو ظاہر ہے کہ مختلف قالب کیسے وجود میں آ گئے؟ اس سوال کے جواب میں یہ لوگ کہہ دیتے ہیں۔ کہ "خداوند تعالیٰ عزاسمہ، روح اور مادہ تینوں قدیم ہیں۔ اور جس طرح حق سبحانہ وتعالیٰ کی کوئی ابتداء اور انتہا نہیں اسی طرح روح اور مادہ کی بھی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا اسی طرح ان تینوں کے اعمال وافعال قدیم ہیں۔ اور ہم ان کی ابتداء ماننے کے لئے کسی طرح سے بھی تیار نہیں" لیکن اس عقیدے کے رو سے تسلسل کے قائل ہو جاتے ہیں اور تسلسل عقلاً محال ہے۔ اگر صحیح ہوتا تو یہ عالم ہی وجود میں نہ آتا۔

ایک اشتباہ کا ازالہ:۔

اصل بات یہ ہے کہ وجود مطلق نے مرتبہ احدیت سے مرتبہ وحدت میں۔ اور مرتبہ وحدت سے مرتبہ واحدیت میں نزول فرمایا اور اسی طرح وجود نزول فرماتا رہا۔ جس کو ہم ارتقاء کا نام دیتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ وجود مطلق کا نزول ہماری ارتقاء ہے۔ اور روح نے ہر مرحلہ میں تنزل اور تغیر کا احساس کیا ہے۔ گویا ایک حالت سے دوسری حالت کو اور ایک مقام سے دوسرے مقام کو انتقال کیا ہے۔ اسی چیز یا اسی احساس نے اس کے وجود میں جگہ پیدا کی ہے۔ تو جس وقت وہ اس دنیا میں ایسے حالات سے دوچار ہو جائے جو تناسخ سے ملتے جلتے ہوں۔ تو فوراً تناسخ ہی کے شبہ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اصلیت مسئلہ:۔

اسی طرح میں بھی متواتر ایسے حالات سے دوچار ہوتا رہتا اور اگر کسی دوسری جگہ چلا جاتا تو وہ جگہ مجھے قطعی طور پر جانی پہچانی اور دیکھی بھالی معلوم ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی ادراک کی ایک خاصی فرحت ناک کیفیت بھی طاری ہو جاتی۔ چنانچہ مجھے یقین آ جاتا۔ کہ اس سے قبل بھی میں یہاں پر آیا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ دوست واحباب سے تناسخ کے بارے میں بحثیں گرم رکھتا اسی ضمن میں ایک روز میرے احباب میں سے ایک محب نے کہا تھا کہ "اگر تناسخ میں رتی بھر بھی حقیقت ہوتی تو ہم گزشتہ زندگی کے حالات یقیناً یاد رکھتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ ہمیں تو کچھ بھی یاد نہیں"۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "تناسخ کا مطلب علم کے اضافے اور نفس کی تکمیل ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ جب تک تم گزشتہ علم یکسر نہ بھلا دو گے تو تکمیل تک پہنچنا

ممکنات میں سے ہوگا. بدیں طور کہ جب روح ایک وجود سے دوسرے وجود کو منتقل ہو جاتی ہے تو نئے وجود کے اثرات پرانے قالب کے تمام لمحات اور کیفیات بھلا دیتے ہیں. بس یوں سمجھ لیجئے۔ کہ جیسے ایک عرصہ کے بعد ایک دیوار کی دوبارہ لپائی ہوگئی ہو تو ظاہر ہے کہ پرانی لپائی کے اثرات پنہاں ہو جاتے ہیں. لیکن یہ ایں ہمہ پرانی لپائی بدستور دیوار کا جزو لانیفک ہوتی ہے۔ اسی طرح مختلف قالبوں میں روح کی حالت قیاس کو لینی چاہئے''

بہر حال چند برسوں کے بعد میرا تخیل اس منزل سے آگے نکل گیا. اور میری سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ کہ تناسخ کی وہ قسم جس کو ویدک دھرم بیان کرتا ہے صریحاً باطل ہے۔ کیونکہ اس تناسخ کا مطلب یہ ہے کہ روح ایک جسم سے نکل کر کسی دوسرے ایسے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ جس کی ساخت پہلے سے شکم مادر یا انڈے میں اس کے اعمال وافعال کے مطابق ہوئی ہوتی ہے۔

رہی یہ بات کہ بعض نادیدہ مقامات ایک شخص کو کیوں جانے پہچانے اور دیکھے بھالے نظر آتے ہیں جیسے مجھے حضرت پیر باباؒ کے راستہ میں ملندری گاؤں دیکھا بھالا دکھائی دیا تھا تو اس کا جواب یہ ہے ۔اور میں نے سطور بالا میں اس امر کی وضاحت بھی کی ہے۔ کہ روح مسلسل تغیر وتبدل کی وجہ سے ایسے اشتبا میں پڑ جاتی ہے۔ اور جو مقامات یہاں اس عالم شہادت میں دیکھتی ہے۔ تو دراصل یہی مقامات اس نے قبل ازیں عالم مثال میں بھی ملاحظہ کئے ہوتے ہیں۔ انہیں مقامات میں یا پھر دوسری اشیاء میں جو چیزیں اس کے حافظے میں محفوظ رہ گئی ہوں. اور ان کو یہاں دیکھ لے تو فوراً پرانا نقشہ یاد آ جاتا ہے۔

یاد رہے کہ مادئین کے قول کے مطابق عالم شہادت عالم مثال کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ لیکن حضرات صوفیہ صافیہ کے نزدیک عالم شہادت عالم مثال کی ایک تنزل یافتہ شکل ہے۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہاں وہ مقامات یا اشیاء ترقی یافتہ یا تنزل یافتہ شکل میں دکھائی دیتی ہیں. اور ہر گاہ جبکہ یہ تمام مقامات وصور بنیادی حیثیت سے عالم مثال میں ملاحظہ کئے ہوئے مقامات اور اشیاء کے ہم مثل ہوتے ہیں. تو اسی بناء پر ایک شخص یہی سمجھ لیتا ہے۔ کہ گویا یہ سب کچھ وہ پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ جنت کا معاملہ بھی ہو بہو اسی طرح ہوگا. کیونکہ جنت میں جب یہ چیزیں ملاحظہ کی جائیں گی تو اہل جنت یہی کہیں گے کہ:۔

(ترجمہ:۔ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیئے جاتے تھے)

روح انسانی کی مثال اور انسانی حافظہ:۔

اسی ضمن میں دوسری بات یہ بھی ذہن نشین رہے کہ روح انسانی کی مثال بازار میں لگے ہوئے ایک آئینہ کی سی ہے۔ جس کے اندر ہر رہرو وغیرہ کی صورتیں منعکس ہوتی ہیں. اور جو امور

اشیاء یا واقعات انسانی ذہن کو پوری طرح متاثر کر لیتے ہیں. تو اس قسم کے امور و واقعات لمبی مدت تک یادرہتے ہیں. اس کے برعکس جو واقعات ذہن انسانی کو متاثر نہیں کر پاتے تو حافظہ بھی ان کو یاد رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا. البتہ یہ الگ بات ہے کہ ان واقعات کو اپنے سے کلی طور پر خارج بھی نہیں کرسکتا. یہی وجہ ہے کہ کوئی دیکھی بھالی چیز یا سنی سنائی بات ذہن انسانی سے خارج نہیں ہوسکتی ۔ وہ شعور سے تحت الشعور کی طرف چلی جاتی ہے۔ اور اسی لاشعور کے گودام خانہ میں انسانی شخصیت کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ پھر بھولی بسری چیزیں انسانی حافظہ میں بصورت وجود مثالی موجود رہتی ہیں. اور جس وقت ان کو بعد میں کسی موقعہ پر دوبارہ دیکھنے کا اتفاق ہو جائے. تو ذہن انسانی تو بالیقین متاثر ہو جاتا ہے۔ لیکن حافظہ اس کا پورہ نقشہ سامنے لانے اور مکمل طور پر ساتھ دینے سے رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اسی حالت میں اتنا تو ضرور سمجھ لیتا ہے کہ کم از کم اسی چیز یا معاملہ سے قطعی نابلد نہیں ہوں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دیکھے ہوئے خواب آدمی بھول جاتا ہے۔ لیکن جب خواب میں دیکھی ہوئی چیزیں سرراہے دوبارہ دیکھ لے تو فوراً فراموش کردہ خواب عود کر آتا ہے۔ اور واقعہ یاد آجاتا ہے۔ ملندری گاؤں کے متعلق بھی میرا شبہ اسی نوعیت کا تھا ۔ کہ یا تو میں نے اس مقام کو عالم مثال میں دیکھا ہوگا. اور یا اسی عالم شہادت میں خواب میں دیکھا ہوگا. بصورت دیگر یہ بھی عین ممکن ہے کہ اسی گاؤں کے مشابہ میں نے قبل ازیں کوئی دوسری جگہ ملاحظہ کی ہو. جو حافظہ سے نکل گئی تھی مگر اس کا وجود مثالی میرے حافظے میں بہرنوع موجود تھا. تو جونہی یہ مقام سامنے آیا۔ اور میں نے دیکھا تو حافظہ نے فوراً مثالی وجود پیش کر دیا. یہاں تک کہ مجھے یقین آ گیا کہ یہ جگہ اس سے پہلے بھی میں نے دیکھی ہے۔

یادرہے کہ دنیا کی بہت بڑی بڑی شخصیتیں اسی منزل میں رہ گئی ہیں. مثال کے طور پر فیثا غورث، افلاطون اور کرشن وغیرہ بھی۔ لیکن حقیقت حال محض اسی قدر ہے کہ تناسخ اس سے زیادہ کسی قسم کی اصلیت کا حامل نہیں۔

کوہاٹ کے بازار اور ڈبگری بازار میں مماثلت :۔

یہاں پر میں اس اشتباہ کی ایک نفسیاتی کیفیت بھی عرض کردوں. امر واقعہ یہ تھا. کہ جشن جمہوریہ پاکستان کے سلسلہ میں کوہاٹ میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہونا قرار پایا تھا. اس مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لئے مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ یہ اولین جشن جمہوریہ تھا. لہذا بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت سے منائی جارہا تھا۔ خیر تو جب ہم کوہاٹ بازار میں داخل ہوئے اور میں نے تلے اوپر بازار کا جائزہ لیا تو یک لخت مجھ پر وہی کیفیت طاری ہوگئی۔ اب کوہاٹ کا بازار مجھے دیکھا بھالا دکھائی دیا. لیکن بحمد اللہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اب مجھے اشتباہ کے اس راز سے پوری طرح آگاہی

بخش دی تھی۔ چنانچہ اس کیفیت کے آتے ہی میں غور کرنے لگا کہ آخر اسکی کیا وجہ ہے؟ بالآخر میرے تفکر نے مجھے تحت الشعور کا نقشہ پیش کر دیا اور معاً مجھے یاد آیا کہ 16-1915ء میں جبکہ میں پشاور آیا تھا تو ان دنوں ڈبگری بازار کی ہیئت بعینہ ایسی تھی۔ جیسے کہ آج میں کوہاٹ کے بازار کو پا رہا تھا۔

جذب کا چکر اور حضور بادشاہ جانؒ کی توجہ:۔

دوران تربیت میں تناسخ کے چکر میں گرفتار ہونے کے علاوہ کئی دیگر مراحل سے بھی گزر چکا ہوں۔ ان میں سے ایک واقعہ تو گزشتہ اوراق میں اس مجذوب باباؒ کے تذکرہ میں گزر چکا ہے۔ جو ڈبگری دروازے سے باہر قبرستان میں ہوا کرتا تھا۔ اس باباؒ کا تعلق جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں ناگ پور کے باباؒ تاج الدین سے تھا۔ مولوی عبدالمجید افغانی مرحوم جو مشن کالج میں پروفیسر تھے۔ اور ارباب تاج محمد خان خلیل جو وکالت کے بعد سیشن جج مقرر ہو گئے تھے۔ یہ دونوں نامی گرامی حضرات بھی اس باباؒ کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ مجھے بھی مجذوب بنانے میں ذرا سی دیر تھی۔ مگر حضور بادشاہ جانؒ نے میری نسبت اس باباؒ سے قطع کرا دی۔ ایک روز باتوں باتوں میں یہ ذکر چھڑ گیا تو حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"میں نے تمہیں اس کے پاس محض علاج کے لئے بھیجا تھا مگر اس نیک بخت نے تم پر باقاعدہ قبضہ جما لیا اور قبضہ بھی ایسا کہ عنقریب تم بھی مجذوب بن جاتے"۔

حقیقت بھی یہی تھی اور اگر حضور بادشاہ جانؒ کی توجہ نہ ہوتی تو مجذوب باباؒ مجھے لے اڑا تھا۔

اسی طرح لنڈی کوتل کے قاصد باباؒ نے بھی اپنی پوری کوشش کی تھی۔ کہ میں ان کا چیلہ بن جاؤں مگر ان کو بھی کامیابی نہ ہوئی۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہو گا۔ کہ جناب قاصد باباؒ میرے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ حضور بادشاہ جانؒ کی عادت مبارک تھی۔ کہ موسم گرما میں ہمارے ہاں لنڈی کوتل تشریف لاتے۔ اور چند دن وہاں قیام فرماتے۔ تو جس روز حضور بادشاہ جانؒ تشریف لاتے اور موٹر یا لاری سے قدم مبارک زمین پر رکھتے تو قریب ہی قاصد باباؒ پہلے سے موجود ہوتے۔

اجمیر شریف میں قاصد باباؒ کے ایک مرید کا واقعہ:۔

یہ تو تھے قاصد باباؒ ان کے ایک مرید کا واقعہ بھی بڑا ہی عجیب و غریب ہے۔ غالباً 1933ء میں ہم حضور بادشاہ جانؒ کے ساتھ اجمیر شریف گئے تھے۔ انہی ایام میں وہاں ایک مجذوب کو خوب ہی شہرت حاصل ہو گئی۔ محتاط اندازے سے دو گز لمبا قد رکھتا تھا۔ اور جوان سال تھا۔

مگر سر کے بال سفید تھے۔ وہ پختونوں کے کوچی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور نام شیر علی تھا. اجمیر شریف کے سیٹھ مہا سیٹھ جھولیاں بھر کر روپوں کی تھیلیاں اس کے عقب میں پھرایا کرتے۔ اس غرض سے کہ اگر کسی بھی وقت شیر علی نے روپے طلب کیے تو فوراً مہیا کیے جائیں. اور یہ بات زبان زد خاص و عام تھی۔ کہ جو کچھ بھی شیر علی کے منہ سے نکلے وہی ہو کر رہتا ہے۔ اس مجذوب کا یہ دستور العمل حیرت انگیز تھا کہ وہ اپنے پاس ایک استرہ رکھتا اور جھٹ اسے نکال کر دھار کی طرف اپنی کھوپڑی کے اوپر رکھ لیتا. صرف یہی نہیں بلکہ اوپر سے ایک وزنی پتھر سے شدید ضرب لگا لیتا. آناً فاناً استرہ اس کی کھوپڑی کی ہڈی کو چیرتا ہوا مغز استخوان میں پیوست ہوتا.

اور جونہی وہ اپنی کھوپڑی سے استرہ باہر نکالتا تو ساتھ ہی ساتھ اس کے سر سے خون کی ندی بہنے لگ جاتی۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ تھی کہ دوسرے دن جب لوگ شیر علی کو دیکھتے اس کی کھوپڑی میں زخم کا نام ونشان تک نہ ہوتا۔ البتہ استرہ لگنے کی ہلکی سی دھاریاں ضرور نظر آتیں. پر ہیبت اتنا تھا کہ ڈر کے مارے کوئی شخص بھی اس سے بات نہ کر سکتا تھا. خصوصی طور پر اس حال میں جبکہ اس کی مستی اور جذبہ جلال پر ہوتا تو کیا مجال کہ کوئی فرد بشر اس کے قریب جا سکے. تاہم ایک روز میں اس کے پاس چلا گیا. اس وقت وہ بلند دروازے کے نیچے کھڑا تھا. اور میں نے قریب ہوتے ہی اس سے پوچھ لیا. کہ ''شیر علی! تم کس کے مرید ہو؟'' اس نے اپنی بڑی بڑی اور پر ہیبت آنکھیں میری طرف موڑ کر جواب دیا. کہ ''بھلا تم میرے پیر کو کیا جانو گے؟'' میں نے کہا ''تم ذرا بتا تو دینا پھر دیکھا جائے گا'' یہ سنتے ہی اس نے جواب دیا. کہ ''میرا پیر لنڈی کوتل میں ہے'' میں نے متحیرانہ انداز میں دوبارہ پوچھا کہ ''تعجب ہے لنڈی کوتل میں پیر لوگ کہاں سے آ گئے؟ یہ سنکر شیر علی نے مجھ سے پوچھا ۔کہ ''میاں! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''میں لنڈی کوتل کا باشندہ ہوں''. یہ سن کر وہ مسکرایا. اور کہنے لگا کہ ''حیرت ہے لنڈی کوتل کا باشندہ ہو کر تم قاصد باباؒ کو نہیں جانتے''۔ یہ سن کر واقعی میں ششدر رہ گیا اور اسے مزید کریدا. میں نے اس سے پوچھ لیا کہ ''شیر علی! تم نے قاصد باباؒ کو کیسے اور کہاں دیکھا تھا؟'' اس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''بھائی! میں کوچی ہوں. اونٹ میرے ساتھ تھے۔ اور پشاور آ رہا تھا مگر جونہی لنڈی کوتل کی سرائے تک پہنچ گیا تو قاصد باباؒ وہاں کھڑا تھا. یک لخت اس نے میری طرف کچھ ایسی پر تاثیر نظروں سے دیکھا کہ بس نہ پوچھو. جیسے امیر صاحب (امیر کابل) کی اثر دافن (اژدہا فم) توپ کی اڑا دینے والی ضرب لگا دی ہو''۔

محفل خانے میں شیر علی کی آمد:۔

اسی رات کو محفل خانہ میں محفل سماع خوب گرم تھی۔ اتنے میں اچانک کہیں ایک طرف سے شیر علی محفل میں داخل ہو گیا۔ اور آتے ہی استرہ نکال لیا۔ حضور بادشاہ جانؒ نے دیکھتے ہی فوراً سید خان محمد عرف اسٹیشن ملا کو ارشاد فرمایا کہ:۔

''بٹھا دو اس غلیظ کو-----!''

اسٹیشن ملا اٹھے اور شیر علی کو بازو سے پکڑ کر غضبناک لہجے میں کہہ دیا کہ 'بیٹھ جاؤ!'' یہ سنتے ہی شیر علی نے آہستہ سے اپنا استرہ جیب میں لڑھکا دیا۔ اور کافی دیر تک آرام سے بیٹھ کر سماع سنتا رہا۔ مگر اس واقعہ کے چوتھے یا پانچویں دن ایسا غائب ہو گیا۔ کہ آج تک دکھائی نہ دیا۔

قاصد باباؒ کی پیشکش اور میرا انکار:۔

جہاں تک قاصد باباؒ کا تعلق ہے۔ تو جب ان کی رحلت کا وقت قریب آ گیا۔ تو مجھ سے فرمایا۔ کہ ''میرے لئے ایک خانقاہ تعمیر کر دو'' مگر میں آج اور کل میں ٹالتا رہا۔ آخر ایک روز تو صاف الفاظ میں اس کی وضاحت بھی کر دی۔ کہ میں ''اپنا سارا کام تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں'' مگر میں ان کے جواب میں یہی کہتا کہ 'قاصد باباؒ آپ کا کام تو رہا ایک طرف اگر دونوں جہان بھی میرے حوالے کرو گے۔ تو بھی میں ننگا ہونے کے لئے تیار نہ ہوں گا۔'' وہ مچل کر فرما دیتے کہ 'نیک بخت! کون تمہیں ننگا کرے گا؟ دیکھو تم میرا کام سنبھال لو۔ ورنہ بعد میں یقیناً پچھتاؤ گے اور یاد رکھو تمہارے پیر نے تمہارے رباب پر صدف لگائے ہیں۔ مگر میں اس میں خالص موتی جڑھ دونگا۔ محمد اسلم (حضور بادشاہ جانؒ) نے تمہیں دال دی ہے۔ اور میں باسماتی چاول دے دونگا۔''

لیکن میری نسبت میرے مرشد پاکؒ سے اس قدر پختہ اور قوی تھی۔ کہ قاصد باباؒ کی اس قسم کی پیش کش سے ذرا برابر متاثر نہ ہوا۔

آدمیت کا پردہ:۔

مجھے تأسف کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے۔ کہ فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ کے مبارک تذکرہ میں میری اپنی زندگی کے بعض حالات بھی قلمی ہو گئے۔ مجھے احساس ہے کہ اصولی طور پر ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بات یہ ہے۔ کہ جب میں حضور مرشد پاکؒ کے طریقہ ہائے تربیت کو زیر بحث لاتا ہوں۔ تو قدرتی طور پر انؒ کے دیگر مریدوں کی بہ نسبت مجھے اپنے آپ کو بطور مثال پیش کرنا زیادہ سہل معلوم ہوتا ہے۔ تاہم میں اپنے عالی قدر قارئین سے معافی طلب کرتا ہوں اور

عرض پردازوں کہ حاشا! اس سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ گویا اپنی شخصیت کو اجاگر کروں۔ اور بالفرض اگر میری شخصیت کا کوئی وجود واقعتاً موجود بھی ہو تو اس کا سرچشمہ اعلیٰ میرے مرشد پاک ؒ ہی کا فیض عام ہے۔ اور خدانخواستہ۔ خدانخواستہ اگر میرے مرشد پاک ؒ کا فیض ایک لحظہ کے لئے بھی مجھ سے اٹھ جائے تو وہ پرانا سادہ اور بے علم انسان ہو کر رہ جاؤں گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک موقعہ پر میں نے اس شہباز ملک ملکوت ؒ کو مخاطب کر کے عرض کیا تھا کہ۔

پر دہ دسڑی توب پہ ما پر تہ دہ سڑے نہ یم

یادہ ستادنظر اخکلے ردا شاہ ستارہ

(میں آدمی نہیں۔ لیکن میرے اوپر آدمیت کا پردہ ضرور پڑا ہے۔ یا پھر اے شاہ ستار ؒ! یہ پردہ آپ ہی کی نگاہ کرم کی خوبصورت چادر ہے)۔

حضور جبہ و عصا کے نمودی پیر نہ تھے:۔

1931ء کا واقعہ ہے کہ فخر العلماء الاولیاء ؒ کی ہمراہی میں اجمیر شریف جا رہا تھا۔ یہ بھی حضور خواجہ خواجگان غریب النواز ؒ کے عرس مبارک کا موقع تھا۔ ہر سمت سے لوگ ہندوستان کی طرف آ رہے تھے۔ ہم دہلی پہنچے تو فتح پوری بازار کے سرے پر ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ شیر محمد عرف تیراہ ملا اور ان کے دو ایک مرید بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ (شیر محمد عرف تیراہ ملا کو حضور بادشاہ جان ؒ کے اولین خلیفہ ہونے کا اعزاز حاصل تھا) اب صورت حال یہ تھی۔ کہ حضور بادشاہ جان ؒ دوسرے پیروں کی طرح عبا و قبا وغیرہ زیب تن فرمانے کے روادار نہ تھے۔ اور حق یہ ہے کہ فخر العلماء الاولیاء میں مکر و فریب کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ اگر چہ کبھی کبھی از راہِ تفنن فرمایا کرتے تھے کہ ''فقر کے ساتھ مکر بھی لوازمات میں سے ہے۔ اس لئے کہ اس کے بغیر کوئی پیر بھی شہرت تام حاصل نہیں کر سکتا''۔

ایک حکایت:۔

اور اسی ضمن میں ایک حکایت ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ:۔

''ایک طالب علم نے علوم ظاہری کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر حصول علم باطنی کے لئے ایک پیر روشن ضمیر سے بیعت کر لی۔ اور جس کو مجاہدے کا حق ادا کرنا کہتے ہیں تھوڑے عرصہ میں پورا کر دیا۔ چنانچہ کاملیت کے درجے پر فائز ہو کر دنیائے سلوک میں خاص مقام حاصل کر لیا۔ بنا بریں مرشد کی طرف سے خلافت بھی مل گئی۔ اور ساتھ ارشاد و ہدایت کا حکم بھی دے دیا۔ لیکن متاسفانہ کافی عرصہ ہو چکنے کے بعد بھی کسی شخص نے اس کامل اور فارغ مولوی صاحب سے بیعت نہ کی۔ چنانچہ مجبوراً اپنے مرشد کے پاس آ کر دکھڑا سنایا۔ مگر پیر تھا کوئی روشن ضمیر لہذا اس نے اپنے خلیفہ کو یہ مشورہ دیا۔ کہ ''میاں! کام ایسا نہ بنے گا۔ جب تک فقر کے ساتھ مکر کا بدرقہ نہ ملاؤ گے اور نیز یہ بھی یاد رکھو کہ

اس قسم کا مکر کار ثواب میں شامل ہے۔ اس لئے کہ مخلوق خدا کو بڑا فائدہ پہنچے گا. اس ہدایت کو پلے باندھ کر مولوی صاحب نے جا کر ایک ایسی مسجد کا رخ کیا جس میں ایک متبحر اور جید عالم دین نے درسگاہ قائم کی تھی۔ مولوی صاحب نے اسی عالم دین سے التجا کی کہ اسے مسجد میں قیام کی اجازت دی جائے۔ وہ سب کی خدمت بھی کرے گا. اور حروف ہجا کے دو، دو حروف بھی یاد کرے گا. معمر مولوی صاحب کی یہ بات سنکر چند مست الست طلبائے درسگاہ نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور لگے کہنے کہ "ارے او بوڑھے طوطے! اتنی عمر تو کہاں رہا؟ جواب اس سفید ریش مبارک کو لیکر پڑھنے آیا ہے۔ اب تو پڑھے گا تو کیا پڑھے گا. اور یاد کرے گا تو کیا یاد کرے گا؟ جاؤ اس بڑھاپے میں تمہارے لئے بہتر ہے کہ کسی مرد آدمی کے بچوں کو کھلاؤ" مگر مولوی صاحب کب ٹلنے والا تھا؟ اس نے بڑی آہ وزاری سے التجائیں کیں. حتیٰ کہ جید عالم کو اس کی حالت زار اور شوق حصول علم پر رحم آ گیا۔ اور مسجد میں رہنے کی اجازت دیدی. اب مولوی صاحب ہر روز حروف ہجا کے دو ایک حروف یاد کرتا. اور اگر کبھی بھول جاتا تو استاد غصے میں آ کر اسے کہتا کہ بھلے مانس! دو مہینے ہونے کو آئے مگر تا حال تم نے الف، ب سے واقفیت پیدا نہیں کی۔ معلوم نہیں کہ تمہارے سر میں از قسم مغز کوئی چیز موجود بھی ہے یا اس جنس گرانمایہ سے یکسر خالی ہے؟" مگر مولوی صاحب انتہائی بردباری سے یہ تمام بری بھلی باتیں سنتا. انہیں برداشت کرتا اور خاموش رہتا. اسی طرح ایک سال گزر گیا.

ایک روز علی الصبح وہ اپنے استاد محترم کی خدمت میں حاضر ہوا. اور عرض کیا کہ "استاد صاحب! آج رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے" استاد نے ناک بھنویں چڑھا کر جواب دیا ارے میاں --- کیا تم اور کیا تمہارا خواب! مگر خیر -- سنا دو تم نے خواب میں کیا دیکھا؟ وہ بولا کہ "صاحب! میں نے دیکھا کہ رسول ﷺ مجھے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرما رہے ہیں. کہ جاؤ تم کو ہم نے علوم ظاہری اور علوم باطنی عطا فرما دیئے".

قریب بیٹھے ہوئے طلباء نے جب یہ سنا تو سخت برانگیختہ ہو گئے۔ اور قریب تھا کہ اس کی اچھی طرح سے مرمت کر کے مسجد سے باہر نکال دیں. کہ اسی اثناء میں ان کے استاد محترم نے مداخلت کرتے ہوئے ان سب کو سمجھا دیا. کہ اس سفید ریش پر غصہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں. البتہ اس کی آزمائش ضرور کر لینی چاہئے۔ اور یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے اس لئے کہ جو شخص رسول ﷺ کو خواب میں دیکھے تو یہ واقعتاً درست ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شیطان لعین سرور عالم ﷺ کی صورت میں نہیں آ سکتا. اب اگر یہ سفید ریش اپنے قول میں سچا ہے۔ اور اس نے واقعی نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا ہو. اور آقائے نامدار محمد مصطفیٰ ﷺ سے یہ بھی سنا ہو. کہ ظاہری اور باطنی علوم اس کو عطا فرما دیئے گئے ہیں تو ابھی آزمائش کر لیں گے اور ابھی سب کچھ عیاں ہو جائے گا" یہ کہہ کر عالم دین نے فقہ کی ایک ادق کتاب سفید ریش کے سامنے دھر دی۔ اور کہا کہ "میاں ذرا پڑھ تو لو.

کیا لکھا ہے؟''

سفید ریش نے دیکھتے ہی فرفر کتاب کی عبارت پڑھ لی یہ حیران کن تماشہ دیکھ کر طلباء انگشت بہ دندان رہ گئے۔ کیونکہ ان سب کو بخوبی معلوم تھا۔ کہ بڑے میاں کو آئے ہوئے پورا ایک سال ہوگیا ہے اور ابھی بغدادی قاعدہ بھی ختم نہیں کیا ہے۔ استاد نے اپنی مزید تسلی کرانے کے لئے اس عجوبہ روزگار سفید ریش کے سامنے مشکوٰۃ شریف رکھدی۔ مگر بڑے میاں کی زبان تھی کہ رکتی نہ تھی۔ اب تو کوئی کسر نہ رہی۔ اس لئے کہ استاد سابق کو یقین آ گیا کہ بخدا یہ بوڑھا ولی اللہ ہے۔ چنانچہ وقت ضائع کئے بغیر اس نے بڑے میاں سے بیعت کرلی۔ رہے شاگرد! تو وہ بھی کیوں پیچھے رہتے۔ لگے ہاتھوں ان کو بھی بیعت سے سرفراز فرمایا۔ ظاہر ہے کہ یہ غیر معمولی بات تھی۔ اس لئے اس واقعہ کو اتنی زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ کہ مخلوق الٰہی عزوجل کی ایک کثیر تعداد اس کی ارادت میں آ گئی''۔

ریاکاری اور نمائشی رکھ رکھاؤ سے نفرت:۔

یہ حکایت برسبیل تذکرہ عرض کی گئی۔ کہنا یہ تھا کہ حضور بادشاہ جانؒ نمائش و زیبائش اور خودستائی ایسی باتوں سے قطعی مبرا تھے۔ وہ ان باتوں کے بڑے مخالف تھے۔ اور ریاکاری سے انہیں شدید نفرت تھی۔ وہ پختون خوانین کی طرح صاف ستھر الباس زیب تن فرماتے۔ البتہ سر کے موئے مبارک اتنے رکھے تھے۔ جو کانوں تک بمشکل پہنچتے۔ اور یہ عام طور پر سوات کے اردگرد رہنے والے پختونوں کا دستور ہے۔

دہلی کے ہوٹل میں ایک رات:۔

خیر تو عرض یہ کررہا تھا کہ دہلی کے ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ اور ہم سب بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ہوٹل کا ایک بیرہ آ گیا۔ اور حضور بادشاہ جانؒ کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ بولا کہ '' خانصاحب! اگر رات کو رنگین بنانے کے لئے مہ جبین دوشیزاؤں کی ضرورت ہو۔ تو ہماری خدمات حاضر ہیں۔ اس لئے کہ ''وظیفہ شب'' ادا کرنے کے لئے ہمارے ہاں کئی خوبرو دوشیزائیں دستیاب ہیں''۔ بیرے کا کلام اردو میں تھا۔ اور یہ سنتے ہی میرے ماتھے پر کئی بل آ گئے۔ نیز شرم وحیا کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہوگیا۔ دوسری جانب ملا شیر محمد کی حالت بھی قابل دید تھی۔ لیکن حضور مبارکؒ، اللہ اکبر! جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ان کے چہرہ مبارک پر کسی قسم کا کوئی اثر اور اس کا کوئی ردعمل موجود نہ تھا۔ انہوں نے بیرے کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ:۔

'' دیکھو میں تو کچھ بوڑھا سا ہو چلا ہوں۔ دوشیزائیں مجھے پسند نہ کریں گی۔ ہاں ہمارے یہ ملک صاحب جوان ہیں اور '' دوشیزاؤں'' کا '' شوق'' بھی رکھتے ہیں۔ بس! انہی سے طے کرلو۔ شاید سودا

بن جائے؟“

اس ارشاد کے ساتھ ہی مجھے بھی بیرے سے نبٹ لینے کا اشارہ فرمالیا. ملا شیر محمد نے صافے کے شملے سے منہ چھپائے تبسم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنی دیر میں انفعالی کیفیت ختم ہوگئی تھی۔ اب میں بھی مزاح اور چھیڑ چھاڑ کے لئے تیار تھا. چنانچہ حضور بادشاہ جانؒ کے ارشاد کے بعد جونہی بیرے نے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے کہہ دیا۔ کہ ”ہاں! کوئی حرج نہیں. لیکن ایک بات ہے اور وہ یہ کہ ”مال“ دیکھنے کے بعد ہی انتخاب ہو سکے گا.“ ملا شیر محمد۔۔۔۔۔۔۔۔۔(جو بدستور صافے سے منہ چھپائے ہوئے تھے) مسکراتے ہوئے کہا کہ ”بھائی ٹھیک ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ. اس لئے ”مال“ کا معائنہ اور ملاحظہ کرنا خوب ہوگا. اسی موقع پر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

”توکل میں بھی تو کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ اکثر چیزیں چمک دمک تو ضرور دکھاتی ہیں. مگر سونا یا چاندی نہیں ہوتیں.“

اب ملا شیر محمد کی باری تھی۔ وہ بولے۔ کہ ”درحقیقت حمزہؒ شاعر ہے اور منتخب روزگار حسن کو چن لے گا.“ آپس میں ہماری ساری گفتگو پشتو زبان میں ہورہی تھی. ادھر ہوٹل کا ملازم اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا. کہ ہو نہ ہو یہ سب ”دام حسن“ میں گرفتار ہوگئے ہیں. اور آپس میں صلاح ومشورہ ہو رہا ہے۔ اسی اثناء میں حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ۔ ”اچھا! تو حمزہ انتخاب کے لئے چلا جائے۔ اور دیکھو میاں! میرا انتخاب بڑا ہی موزوں ہوتا لیکن!“

ایک مختصر سا سکوت فرمانے کے بعد دوبارہ ارشاد ہوا.

”لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔!“

اور اب کی بار اس ”لیکن“ کی طرز ادائیگی کو ذرا طول دیدیا اور تبسم فرمایا. میں نے عرض کیا. کہ ”حضور! صحیح انتخاب نہ تو آپ کر سکتے ہیں. اور نہ تیراہ ملا صاحب (ملا شیر محمد)!“ یہ سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے جلدی سے استفسار فرمایا.

”بھلا کیوں۔۔۔۔؟“

میں نے دوبارہ عرض کیا کہ 'حضور! اس لئے کہ ”آپ دونوں نے تجرد کی زندگی گزاری ہے۔ اس کے برعکس مجھے اس کا پورا تجربہ حاصل ہے۔“ میری اس بات کے جواب میں حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

”تب تمہارا خیال درست نہیں. اس لئے کہ جس چیز کا تجربہ تمہیں حاصل ہے تو اس کا تعلق حسن سے ہرگز نہیں بلکہ اس کا مدار تمام تر خواہش اور شہوت پر ہے۔ البتہ تمہارے برعکس جس قسم کا تجربہ ہم کو حاصل ہے تو لازماً اس کا تعلق عین حسن سے ہے۔ اور اس حقیقت کے پیش نظر حق بات یہ ہے۔ کہ

حسن کا صحیح معیار بھی ہمیں جیسے تجرد پیشہ لوگ قائم کر سکتے ہیں''۔

مرشد پاکؒ کے ان قدسی الفاظ سے میں کیا عرض کروں۔ کہ میں ان سے کس قدر لطف اندوز ہوا؟ اس وقت مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی کہ ٹپ ٹپ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور قریب تھا کہ غش کھا کر گر جاؤں۔ مگر مرشد دل آگاہؒ نے موقعہ ومحل کی نزاکت کو محسوس فرماتے ہوئے۔۔۔۔۔۔ بات کا رخ فوراً دوسری طرف پھیر دیا۔ اور بہ کمال سرعت اردو زبان میں ارشاد فرمایا کہ:۔

''بہتر ہے۔۔۔ تو ملک صاحب کو اپنے ہمراہ لے جاؤ۔ یہ انتخاب کرلیں گے''۔

چنانچہ میں خاموشی سے بیرے کے ساتھ ہولیا۔ کمرے سے باہر نکل کر ذرا فاصلہ پر میں نے اسے ٹھہرا کر سمجھایا کہ 'بھلے مانس! یہ جس سے تم باتیں کر رہے تھے تو وہ ہمارے مرشد ہیں۔ اور تمہیں چاہئے کہ آئندہ کے لئے ہر کسی کے ساتھ ایسا کلام کرنے سے محتاط رہا کرو۔'' ہوٹل کا ملازم یہ سن کر متعجب ہوا۔ اور کہنے لگا کہ ''ہمارے ملک میں تو ایسے پیر کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ مگر خیر! حرج ہی کیا ہے کہ کم از کم آپ کی ''سیر'' تو ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔ اندر کوئی ایک درجن کے قریب خوبصورت لونڈیاں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ لیکن میں فوراً ہی اس کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔ حضور بادشاہ جانؒ کے روبرو ہوا تو وہ مسکرائے۔ اور استفسار فرمایا کہ:۔

''کہو میاں! کرلیا انتخاب؟''

میں نے گزارش کی کہ ''حضور! کئی کئی منتخب حسینوں میں سے یہ ناچیز کس کو منتخب کرتا؟ وہاں تو یہ عالم تھا کہ ہر جانب سے کرشمہ حسن دامن التفات کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا''۔

حسن اور حصول حسن:۔

میری مندرجہ مذکورہ گزارش سماعت فرمالینے کے بعد حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی یہ تھا کہ:۔''بس۔۔۔بس۔۔۔! اب تم انتخاب کرنے کے بالکل قریب آ گئے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان سب حسیناؤں میں صرف ایک ہی قدر مشترک تمہارے دامنِ التفات کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اور وہ تھا حسن! مگر یاد رکھو کہ حسن بذات خود ایک مجرد چیز ہے۔ لیکن تماشہ یہ کہ یہی حسن مختلف قالبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تو جب کبھی ہم اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے حصول کی کوشش اور سعی کرتے ہیں۔ تو مجرد حسن کی بارگاہ میں پہنچنے کی بجائے صرف اس کے قالب تک رسائی حاصل کرلیتے ہیں۔ گویا پانی کی جگہ خالی جام اٹھا لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ دولت حسن کی لازوال دولت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ حسن کا حصول صورت و قالب سے۔۔۔ تجرد کا متقاضی ہے۔ کیونکہ وہ قطعی مجرد ہے۔ اور مجرد ہی اس دولت عظمیٰ سے ہمکنار ہوسکتا ہے۔''

اس نفیس ولطیف ارشاد گرامی کے بعد حضور مرشد بے نواؒ نے نماز مغرب کی ادائے گی کے لئے ملا شیر محمد علیہ کو جائے نماز بچھانے کا اشارہ فرمایا.

مخالفت کا دور اور کفر کے فتوے:۔

جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں ۔ کہ ابتدائی ایام میں حضور بادشاہ جانؒ ایک چھوٹے سے بالا خانہ میں مجلس سماع منعقد فرمایا کرتے تھے ۔ لیکن جب مخلوق خداوندی عزوجل بڑی تعداد میں آنے لگی. تو محفل سماع کے لئے ہمارا بالا خانہ پسند فرمایا گیا. یہ بالا خانہ ڈبگری بازار میں سلطان سرائے سے چھ سات دکانیں پرے مغرب کی طرف تھا. یہ کافی بڑا تھا. اور اس میں کئی لوگ سما سکتے تھے ۔ لیکن جوں جوں حضور بادشاہ جانؒ کی شہرت عام ہوتی گئی تو ساتھ ہی آس پاس کے علاقہ میں ان کی مخالفت بھی شروع ہوگئی. حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ کے علاوہ ان معتقدین اور ارادتمندوں پر بھی کفر کے بھاری بھاری فتوے صادر ہو گئے.

اس مخالفت کی ابتداء حضور بادشاہ جانؒ سے مخاصمت رکھنے والے ستم پیشہ لوگوں نے پشاور شہر سے کی تھی ۔ اسی عنصر نے ایک اور زبردست سازش بھی کی ۔ وہ ایسے کہ بڑے بڑے ملا صاحبان کو جمع کیا. اور پھر سب مل کر موضع کڑوی کے مرحوم ومغفور قاضی صاحب کے ہاں چلے گئے .۔۔۔۔۔ وہاں جا کر قاضی صاحب مرحوم کے سامنے حضور بادشاہ جانؒ کے خلاف کچھ ایسا زہر اگلا کہ وہ بھی ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے. بس اس کی دیر تھی اور اسی طرح مخالفین کا ایک جم غفیر کڑوی سے پشاور شہر کی طرف روانہ ہو گیا.

دراصل قاضی صاحب مرحوم کو کہا گیا تھا. کہ یہاں پر ایک نیا پیرا وارد ہو گیا ہے ۔ جو برسر عام گمراہی (سماع) کا ارتکاب کرتا ہے ۔ اور طرفہ یہ کہ اس گمراہی (سماع) کو مستحب اور مباح بھی کہتا ہے ۔ مزید برآں یزید، معاویہ اور دوسرے صحابہ کو بھی برا کہتا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ ایسے ہی اور بھی کئی الزامات لگا لئے تھے ۔ مگر اتفاقاً باتوں باتوں میں قاضی صاحب مرحوم کو معلوم ہو گیا. کہ یہ سب ملا صاحبان ایک سید کی مخالفت میں جمع ہوئے ہیں. اور یہ جانتے ہی انہوں نے پشاور آنے سے انکار کر دیا ۔ انہوں نے ملا صاحبان کو سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ ''میں طبعاً'' یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ ایک صحیح النسب سید زادے سے کفر کا کوئی کام صادر ہو سکتا ہے ۔ رہی بات یزید و معاویہ کی تو کوئی بھی سید بچہ ان دونوں کو فطری طور پر اچھی نظروں سے نہیں دیکھ سکتا. ظاہر ہے کہ ان دونوں خاندانوں میں شدید اور قدیمی دشمنی تھی ۔ معاویہ علی (علیہ السلام) پر لعنت بھیجتا اور علی (علیہ السلام) معاویہ پر اب اگر تم اس سید زادے کو یہ کہہ دو کہ معاویہ پر لعنت بھیجنا کفر ہے ۔ تو وہ صاف الفاظ میں جواب دے گا. کہ میرے دادا جان علی علیہ السلام نے بھی معاویہ پر لعنت کی تھی ۔ اور اگر

ایسا کرنے سے کفر واجب ہوتا ہے تو لامحالہ میرے دادا جان علی علیہ السلام کی طرف بھی کفر منسوب ہو جائے گا. اب تم ہی بتاؤ کہ تمہارے پاس اس بات کا کیا جواب ہوگا'' قاضی صاحب مرحوم کی گفتگو سن کر سب ملا صاحبان خاموش ہو گئے. اور اسی طرح ان کا مجمع ابتر ہو گیا.

یہاں پر ایک اور بات بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ پشاور شہر میں تو سرکاری قانون چلتا تھا. ملا صاحبان کفر کا فتویٰ صادر تو کر سکتے تھے۔ لیکن حد جاری کرنا ان کے بس سے باہر تھا. اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے مخالف ملاؤں کا سارا زور علاقہ غیر کی طرف منتقل ہو گیا. اور مرکزی طور پر لنڈی کوتل میں مضبوط مورچے قائم کر لئے گئے. اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ یہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ اور یہاں بھی محفل سماع کا اہتمام فرماتے. چنانچہ لنڈی کوتل کے دو بزرگوں یعنی شلمان ملا صاحب اور صاحبزادہ محمد ابراہیم کا کانے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر حضور بادشاہ جانؒ کی شدید طور پر مخالفت شروع کر دی.

حیرت انگیز بات یہ تھی۔ کہ مذکورہ بالا ہر دو حضرات کی آپس میں بھی بڑی سخت مخالفت تھی۔ لیکن اس کے باوصف ان کا یہ دستور العمل عجیب تھا. کہ اگر باہر سے کسی ''دشمن'' کے ساتھ زور آزمائی کی نوبت آتی تو دونوں بزرگ ایک روح اور دو قالب ہو جایا کرتے تھے۔ ان میں اول الذکر یعنی شلمان ملا صاحب مانکی شریف کے ملا عبدالوہاب کے مازون تھے۔ اور مؤخر الذکر صاحبزادہ محمد ابراہیم صاحب چک نور کے مشہور و معروف ملا صاحب کے خلیفہ تھے۔ گویا مانکی شریف اور ہڈے شریف کے ہر دو معتقد باوجود یکہ ایک ہی سلسلہ کے مرید تھے۔ لیکن پھر بھی ایک دوسرے کی خوب خوب مخالفت کرتے۔ ہڈے ملا صاحب اور مانکی شریف کے ملا صاحب کی مخالفت اور فروعی تنازعات تو خیر مشہور عام ہیں.

بیجا مخالفت پر حضور بادشاہ جانؒ کا اظہار تاسف:۔

اس بے جا مخالفت کو دیکھ کر ایک روز حضور بادشاہ جانؒ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''شلمان کے ملا صاحب اور صاحبزادہ کاکا سے مجھے بڑا شکوہ ہے۔ اس لئے کہ جب میں لنڈی کوتل آ رہا تھا. تو مجھے پورے طور پر ان حضرات سے یہ توقع کی تھی۔ کہ یہ ہر دو بزرگ مجھے خوش مدید کہیں گے۔ اور یہاں پر میرے آ جانے سے ان کو بڑی خوشی ہوگی. اسلئے کہ چاروں طریقوں کے معتقدین آپس میں بھائی بھائی ہیں. اور ہندوستان میں تو یہ دستور ہے۔ کہ چشتی، قادری، نقش بندی اور سہروردی طریقوں سے وابستہ حضرات الگ الگ سلسلوں میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے اعراس اور ختم شریف کی محفلوں میں شمولیت کرتے رہتے ہیں. اور بالفرض اگر ختم شریف کے بعد سماع شروع ہو جائے تو قادری، نقش بندی اور سہروردی طریقوں سے تعلق رکھنے

والے بزرگ آداب مجلس کوملحوظ خاطر رکھ کر پورے سکون سے سماع سنتے ہیں. اور اٹھ کر چلے نہیں جاتے۔ البتہ یہ جدا بات ہے کہ اگر کوئی بزرگ کسی وجہ سے جانا بھی چاہے تو ختم شریف کے فوراً بعد با قاعدہ اجازت لے کر چلا جاتا ہے۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ لنڈی کوتل کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔"

ہمارے خاندان پر کفر کا فتویٰ:۔

المختصر یہ کہ معاملہ اس حد تک بڑھ گیا کہ ہمارے خاندان پر بھی کفر کا فتوی لگا دیا گیا. اور لنڈی کوتل کے مذکورہ بالا ہر دو بزرگوں نے خصوصی طور پر یہ فتویٰ عام کر دیا کہ:۔
"ملک باز میر خان اور اس کی ذریت سے نکاح یا دیگر کسی قسم کا لین دین کرنا حرام قطعی ہے۔ ان کی نماز جنازہ بھی نہ پڑھی جائے۔ اور اگر کسی نے ان سے کسی قسم کا تعلق روا رکھا تو وہ بھی قطعی کافر ہو جائے گا"۔

حضور بادشاہ جانؒ افراط و تفریط کے قائل نہ تھے:۔

اس سے قبل میرے برادر بزرگ کے شیخ جناب سید نور علی شاہ صاحبؒ بھی لنڈی کوتل تشریف لایا کرتے تھے۔ اور مخالفین کی ہمارے خاندان سے مخالفت کی زیادہ تر وجہ ان کی ذات بابرکات بھی تھی۔ دراصل وہ اپنی باتوں میں افراط تفریط سے کام لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ نے متعدد بار ان سے ارشاد فرمایا تھا. کہ اس قسم کی گفتگو مناسب نہیں لیکن جناب سید نور علی شاہ صاحبؒ خفہ ہو گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا. جبکہ حضور بادشاہ جانؒ کے حلقۂ ارادت میں سے جمعہ خان نامی ایک مرید کو بڑی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ بات محض اس قدر تھی۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ اکثر معاملات میں جمعہ خان سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ اسی بناء پر وہ جامے سے نکل گیا حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی. کہ وہ اپنے آپ کو برملا طور پر حضور بادشاہ جانؒ سے کئی گنا برتر اور بزرگ تر سمجھنے لگا.

باب (۴)

آزمائش وابتلا

آزمائش وابتلا کا فلسفہ اور فوائد:۔

آزمائش کو قدرت حق کی طرف سے تنقید سمجھ لینا چاہیئے۔ جو ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اور بقائے اصلح یا بقائے انفع کے قانون کے ماتحت اس میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ اگر ہم عمیق نظر سے آزمائش کے فلسفے کا جائزہ لیں تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ بہر حال ایک تعمیری چیز ہے۔ یہ محض ایک نقاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جب تک کوئی شخص اس مرحلہ سے پوری سلامتی کے ساتھ گزر نہ جائے۔ تو اس شخص کی شخصیت کی معراج تک رسائی محال ہوتی ہے۔
حق سبحانہٗ وتعالیٰ اپنی سنت جاریہ کے مطابق اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا رہتا ہے۔ شاید ایسا کرنے سے حضرت حق جل مجدہ کی یہ حکمت بالغہ کارفرما ہو کر آزمائے ہوئے بندے کو اپنی حیثیت بخوبی معلوم ہو جائے. کیونکہ آزمائش کے بعد آدمی کو اپنی کمزوری اور ناتوانی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کو تو ہر چیز کا کما حقہ علم ہے۔ لیکن جہاں تک بندے پر آزمائش لانے کا تعلق ہے۔ تو اس کا سب سے بڑا اور واضح ترین فائدہ یہ ہے۔ کہ اس تعالیٰ شانہ کے بندے پر خود اس کی حقیقت الم نشرح ہو جائے. تا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برخود غلطی کے ہولناک بھنور میں نہ پھنسا رہے۔
بہر تقدیر قدم قدم پر امتحان کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور جب تک منزل جاری ہو گی متصلاً امتحانات بھی آتے رہیں گے. بلکہ کہنا چاہیئے کہ منزل کے بعد بھی امتحانات پلٹ کر آجاتے ہیں. کیونکہ منزل کا اختتام تک پہنچنے کے بعد تو اور ہی قسم کی آفتیں اور ان گنت ابتلائیں آزمائش کی شکل میں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں. حق تعالیٰ جل وعلا کے ایک طالب صادق کی راہ میں تمام ماسوی اللہ ایک مضبوط آہنی دیوار اور محکم بندش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جب تک طالب صادق کی استقامت صحیح طور پر مکمل اور اس کی نسبت قوی طور پر پختہ نہ ہو تو ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا. غرض یہ کہ درسگاہ طریقت میں طالب حق کو جس طرز کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں یقینی طور پر امتحانی دور بھی آیا کرتا ہے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ طالب حق سے باقاعدہ طور پر امتحان لیا جاتا ہے۔

نفس وشیطان کی فتنہ سامانیاں:۔

اس ضمن میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ اور اپنے مرشد کامل کی جانب سے امتحانات کے علاوہ نفس وشیطان کے مکروفریب بھی شامل ہیں. کیونکہ یہی دونوں عناصر ہیں. جو فطری طور پر اس راہ کے طالب کی صف اول کے دشمن ہیں. دراصل یہ دونوں کسی صورت میں یہ نہیں برداشت کر سکتے کہ کسی طالب حق کو پوری پوری کامیابی حاصل ہو. دوسری جانب مجاہدے کی ابتداء میں سالک کی مثال اس زیر تربیت سپاہی کی سی ہوتی ہے۔ جس کو مصنوعی طور پر جنگ کی ترکیبیں سکھائی جارہی ہوتی ہیں. اور گویا یہ ترکیبیں حقیقی جنگ کے لئے بنیادی تیاریاں ہوتی ہیں. اس دور میں سالک پر جس قسم کی کیفیات یا واردات آتے ہیں. تو وہ سراسر مصنوعی اور نقلی ہوتے ہیں. یہی وجہ ہے کہ ایک صاحب فہم اور معقول سالک ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا. لیکن اس کے برعکس اکثر اوقات بعض ناسمجھ اور کم فہم سالک انہی مصنوعی اور نقلی واردات پر اصلی ہونے کا گمان کر لیتا ہے۔ حالانکہ حقیقت میں وہ تمام تر کیفیات اور واردات اس کے اپنے نفس کے بناوٹی تصورات کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہوتا. خصوصی طور پر جب وہ تھوڑی سی منزل بھی طے کر لیتا ہے۔ تو اسے نفس وشیطان کے گٹھ جوڑ سے بھی سابقہ پڑ جاتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سالک کے واردات انتہائی خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں. اس قسم کے خطرناک واردات اور ان کے مہلک اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے علم شریعت اور کامل مرشد کی صحبت بابرکت بے حد ضروری ہوتی ہے. صرف یہی نہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا. کہ علم شریعت کے ساتھ سالک کی ذاتی دانائی اور عام سمجھ بوجھ بھی اشد ضروریات میں سے ہے۔

مرشد بھی انسان ہوتا ہے:۔

وجہ یہ ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو آخر مرشد بھی تو انسان ہی ہوتا ہے۔ اور اسے خود بھی بعض اوقات ایسے واردات سے سابقہ کرنا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرشد بزعم خویش کسی آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کہ بقضائے بشری اس کے بھی اوسان خطا ہو جاتے ہیں. ایسے لمحات میں وہ اپنے آپ کو بچانے کی فکر میں ہمہ تن مصروف ہوتا ہے۔ اس حال میں اس کے پاس مریدوں کو توجہ دینے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ اور بفرض محال اگر اس کی گنجائش نکل بھی آئے تو اس وقت اس کی توجہ میں اتنا اثر نہیں ہوتا کہ مرید کو بھی فائدہ پہنچا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ ابتلا کے بلاخیز لمحات میں مرشد کی قوت ارادی متزلزل ہوتی ہے۔ اور اس کے خیالات ایک نقطہ پر مرکوز نہیں ہوتے۔

حضرت نبینا یعقوبؑ کی مثال:۔

مثال کے طور پر حضرت یعقوبؑ کا بھی ان کے دور ابتلا میں یہی حال تھا. ظاہر ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کنوئیں میں گر پڑے تھے۔ تو وہ اس کا احساس نہ فرما سکے تھے۔ لیکن جب امتحانی دور گزر گیا تو بعد میں مصر سے حضرت یوسف علیہ السلام کی ارسال کردہ قمیص کی بوئے مبارک کو محسوس فرمالیا. اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ؎

گھے بر طارم اعلیٰ نشینم
گھے بر پشت پائے خود نہ بینم

مرشد کے ارادے کا تنزل اور دانشمند مرید:۔

اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ مرشد کے اپنے خیالات یا ارادہ میں تبدیلی آ جانے کی وجہ سے براہ راست اس کے مریدوں کے خیالات اور ارادہ بھی متنزل ہو جاتے ہیں. بشر طیکہ مرشد کی ابتلا طول پکڑے. اسی سلسلے میں میں اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر عرض کروں گا. کہ اسی کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ جیسے ہی پاور ہاؤس کی مشینیں کام کرنا بند کر دیتی ہیں. تو فوراً سارا شہر گھپ اندھیرے کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر سالک ذی عقل اور صاحب علم ہو تو وہ آناً فاناً اس اندھیرے کا احساس کر لیتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں کہ اپنے ارادے کو پختہ اور اپنی نسبت کو محکم رکھے۔ بلکہ اپنے آپ کو بچا لینے کے ساتھ ساتھ دیگر برادران طریقت کو بھی وقتاً فوقتاً سمجھاتا رہے۔ علاوہ ازیں پوری آہ وزاری اور مکمل خلوص کے ساتھ اپنے مرشد کے لئے بھی دعائیں مانگتا رہے۔

نیک بخت اور بد بخت پیر:۔

جناب سید نور علی شاہ صاحبؒ کبھی کبھی بڑے مزے کی بات کیا کرتے تھے۔ وہ فرماتے کہ ''نیک بخت پیر وہ ہوتا ہے. جس کو حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے نیک بخت مرید عطا فرما دیئے ہوں. اور بد بخت پیر وہ ہوتا ہے جس کو حق تعالیٰ نے بے عقل اور بد بخت مرید دیئے ہوں۔'' ایک مرتبہ میرے برادر بزرگ نے ان سے اس بات کی تشریح مانگی تو انہوں نے فرمایا کہ ''جس پیر کے شاگرد عقل مند، نیک بخت اور صاحبان علم ہوں تو وہ اپنے پیر کو خدا اور رسول کا درجہ نہیں دیتے۔ لیکن ان کے مقابلے میں جس پیر کو حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے جاہل اور بد بخت مرید دیئے ہوں تو اس قسم کے لوگ اپنے پیر کو خدا اور رسول بنا لیتے ہیں. اس کو سجدہ کرتے ہیں اور یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ خداوند وتعالیٰ عز اسمہٗ کی پوری خدائی پیر صاحب کے قبضہ اختیار میں ہے۔ دوسری جانب پیر بھی

آخرانسان ہوتا ہے۔اورانسان طبعاً چاپلوسی کو پسند کرتا ہے۔تو مسلسل طور پر اس قسم کی خوشامد اور بے جاادب کرنے سے پیر بیچارے کو بھی یہ گمان ہو جاتا ہے کہ گویا وہ خدااوررسول کا مختار ہے۔ چنانچہ مریدوں سمیت گمراہی کی گڑھے میں گر جاتا ہے۔"

نفس کو مسلسل مجاہدہ کے شکنجے میں رکھا جائے:۔

میں کہتا ہوں۔کہ یہ بات بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے سے اپنی تعریف وتوصیف سنتا ہے۔اور قطع نظر اس کے وہ اس تعریف کا حقدار بھی نہ ہو۔نیز اسے یہ بھی بخوبی علم ہو کہ یہ اوصاف سرے سے اس کے اندر موجود ہی نہیں.لیکن بہ ایں ہمہ پھر بھی نفسیاتی طور پر اس کا نفس خوشی اور فرحت محسوس کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نفس انسانی کسی حالت میں بھی قابل اعتبار تصور نہیں کیا جاسکتا.اوراگر یہ سرکش نفس مستقل طور پر مسلسل مجاہدہ کے شکنجہ میں قابو اور پابند نہ رکھا جائے تو بہر حال اس کے باغی ہونے اور بغاوت کرنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ کیونکہ سوائے انبیاء علیہ السلام کے کسی بھی اور شخص کا نفس مکمل طور پر مسلمان نہیں ہوتا. بلکہ حضرات انبیاء علیہ السلام کے نفسوں میں بھی خطرے کا احتمال ہوتا ہے۔لیکن حق سبحانہ وتعالیٰ ان کو ایسے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔اس لئے کہ ایسی چیزوں کا اثر براہ راست امتوں پر پڑتا ہے۔دراصل نفس کی سرشت کی بنیاد ہی حیوانیت پر ہے۔اور حیوانیت زبردست قوت اور سخت دباؤ کے بغیر مطیع نہیں ہوتی.اس کے علاوہ جس شخصیت کا مرتبہ جتنا اور جس قدر بلند ہوگا تو بحسب مرتبہ واولعزمی اس کی آزمائش اور ابتلا بھی عظیم الشان ہوگی.

میں نے اپنے ایک شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

لویـه چـه درجـه لـری بـلائـې دسـر ډيـرې وي
خشـکـې نـې تل ئـو کـې وي کـوم غـرونـه چـه رفعـت لـري

(عظیم المرتبت شخصیتوں کے لئے بلائیں بھی ان گنت ہوتی ہیں (اس لئے کہ) جو پہاڑ بلند وبالا ہوں گے ان کی چوٹیاں بھی خشک ہوں گی)

مدعا یہ کہ ہمارے حضور بادشاہ جاؒن بھی ان گنت آزمائشوں اور ابتلاؤں میں مبتلا رہے۔

جاہل مجاہدہ کرنیوالوں کی آزمائش:۔

مثال کے طور پر حضور بادشاہ جاؒن کے ارشاد کے ابتدائی دنوں میں ان کے بعض دوست اس نوعیت کے تھے۔جن کا وجود حضور بادشاہ جاؒن کے لئے سخت ترین آزمائش وابتلا کا باعث تھا.ان میں بعض وہ لوگ بھی شامل تھے۔جو براہ راست حضور بادشاہ جاؒن کی طبیعت میں

دخیل تھے۔رہے وہ محبان حقیقی جو بہترین مجاہدہ کرنے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں.متاسفانہ وہ بے علم تھے۔اورحق یہ ہے کہ بعض اوقات ان سے اپنی بے علمی اور کم فہمی کی وجہ سے ایسی حرکت کا صدور ہو جاتا.جس کی بنا پر بالواسطہ حضور بادشاہ جانؒ کوزک پہنچ جاتی.

مفہوم یہکہ گویا شیطان انہی لوگوں کے ذریعے حضور بادشاہ جانؒ کواپنا ہدف بناتا.اورہم نے پڑھا ہے۔کہ عزازیل بلند پایہ مراتب تک پہنچ گیا تھا.مگر چونکہ بے علم تھا اس لئے قعر بلا خیز میں گرگیا. دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عزازیل کو چودہ علم یاد تھے۔اوراس بات کو بڑی شہرت حاصل ہے۔لیکن یہ ایک مفروضہ اور غلط فہمی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔کیونکہ اصل بات یہی ہے کہ وہ ایک جاہل مجاہدہ کرنے والا تھا.اوراس کے قعر مذلت میں گرنے کی اصل وجہ بھی یہی جہالت ہے۔اور اسی حقیقت پر حق سبحانہ وتعالیٰ کا کلام مبین ناطق ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ۔

(ترجمہ:۔اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو عالم ہیں.)

ظاہر ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا قانون اٹل ہے۔اوراسی کے بموجب اس کے عالم بندے ہی صحیح معنوں میں اس سے ڈرتے ہیں. یہ ایک کلی حقیقت ہے۔اوراس کی روشنی میں اسی امر کا تجزیہ کرنا مشکل نہیں کہ اگر عزازیل عالم ہوتا تو لازمی طور پر حق سبحانہ وتعالیٰ سے ڈرتا اور حکم الہٰی جل مجدہٗ کو بلا پس وپیش ماننے کے لئے سر تسلیم خم کر لیتا.اورانکار نہ کرتا.

لیکن اگر کسی کو یہ اصرار ہو کہ عزازیل یقیناً عالم تھا.اوَر بفرض محال اگر ہم اس رائے سے اتفاق بھی کر لیں.تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا.کہ حضرت نبینا آدم علیہ السلام کے مقابلے میں عزازیل کی علمیت سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف تھی۔اسی سلسلے میں بھی حضرت قرآن ناطق ہے۔ارشاد ہوتا ہے.کہ:۔

(ترجمہ:۔پھر جبکہ ایسا ہوا کہ مشیت الہٰی نے جو کچھ چاہا تھا ظہور میں آ گیا اور آدم علیہ السلام نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الہٰی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کر لئے۔پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا.اور فرمایا اگر تمہارا خیال صحیح ہے (کہ خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ.انہوں نے عرض کیا۔کہ نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے۔ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں.جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے.حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں)

مقصد یہ ہے کہ اس علمی ''معارضہ'' میں ملائک آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں ناکام رہے اور شک نہیں کہ طبقہ ملائک میں عزازیل بھی شامل ہوگا. چنانچہ اس نے اپنی سرشت سے مجبور ہو کر خفت محسوس کی ہو گی.اوراسی بناء پر حضرت آدم علیہ السلام سے دشمنی پیشہ اختیار کیا.قدرتی طور پر ہر پست فطرت جاہل کا یہی خاصہ ہوتا ہے۔کہ جب وہ کھسیا جائے تو بغض وحسد کے گھٹیا ہتھیار اٹھالیتا ہے۔

حضورؒ کے ایک جاہل مرید کی ستم ظریفیاں:۔

ہم لکھ آئے ہیں۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ کے مریدوں میں سے ایک مرید بہت آگے نکل گیا تھا. یہاں تک کہ حضور بادشاہ جانؒ اس کی کسی بات کی تردید نہ فرماتے تھے۔اسی بندۂ خدا نے ایک بار حضور بادشاہ جاںؒ سے کہا کہ ''حضرت خواجہ بزرگ سلطان الہند غریب النوازؒ نے مجھے ارشاد فرمایا ہے۔ کہ تم دونوں (یعنی وہ خود اور حضور بادشاہ جاںؒ) فوراً اجمیر شریف میں حاضری دو''۔ چنانچہ حضور بادشاہ جانؒ فوراً تیار ہو گئے۔اور بلا پس و پیش اجمیر شریف روانہ ہو گئے۔ مرید مرشد نما ان کے ہمراہ تھا۔اجمیر شریف میں چند ایام گزارنے کے بعد اسی شخص نے دوبارہ کہا کہ ''اب یہ حکم صادر ہوا ہے۔ کہ تم دونوں پونا اور بمبئی ہو آؤ'' لہذا پونا اور بمبئی روانہ ہو گئے۔تیسرا ''الہام'' یہ تھا کہ ''حضور بادشاہ جاںؒ کی داڑھی مبارک ذرا چھوٹی ہے لازمی ہے کہ قبضہ برابر لمبی داڑھی رکھی جائے۔تا کہ شرع شریف کے مطابق ہو اور اگلے حکم کے ملنے تک حضور بادشاہ جاںؒ پیش تری کا ساگ اور مکا کی روٹی کھایا کرے''۔

مرید مرشد نما کا آخری الہام:۔

حضور بادشاہ جاںؒ نے اس حکم پر بھی عمل درآمد شروع کیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ حضور بادشاہ جاںؒ کی صحت پر بہت بڑا اثر پڑا۔اور صحت کافی بگڑ گئی۔سب سے آخری حکم یہ تھا۔کہ خواجہ غریب النوازؒ نے حکم دیا ہے۔کہ ''اب عبدالستار شاہؒ تم سے بیعت کر لے۔اور تمہارا مرید بن جائے''۔
حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔
''بسم اللہ۔آؤ! مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ بیعت کس طریقہ میں ہوگی.اور نیز یہ کہ مجھے تلقین کیا کرو گے؟''

اس شخص نے تلقین کے بارے میں وہی ذکر بتایا۔جو حضور بادشاہ جاںؒ نے اسے دیا تھا۔اور سلسلہ بھی یہی چشتیہ نظامیہ نیازیہ بتا دیا۔تب حضور بادشاہ جاںؒ نے اسے ارشاد فرمایا کہ:۔
''دیکھو میاں! اس سلسلے میں تو تم خود میرے مرید ہو اور یہ ذکر اور اس کا طریقہ بھی میں نے تمہیں تلقین کیا ہے۔ان کو چھوڑ کر تمہیں یہ بتانا ہوگا۔کہ اگر کسی دوسرے سلسلے میں تمہیں کوئی فیض ملا ہو اور ساتھ ہی اجازت بھی لیکر آئے ہو تو وہ مجھے بتا دو''۔
اس شخص نے کہا کہ ''اسی طریقے کا حکم ملا ہے۔اور آپ کو اسی میں بیعت کرنا ہوگی''۔اب حضور بادشاہ جاںؒ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔اس شخص پر برس پڑے اور خوب سخت سست فرمایا۔انجام کار وہ شخص حضور بادشاہ جانؒ کے مخالف گروہ میں شامل ہو گیا۔اور اس کے بعد حضور بادشاہ جاںؒ کے

دربار میں حاضر نہ ہوا۔ البتہ ایک بار ضرور ایسا ہوا تھا۔ کہ حضور بادشاہ جاںؒ کا پردہ فرمانے کے کوئی پانچ یا چھ مہینے کے بعد یہی شخص ایک چھوٹے بچے کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے کے لئے آیا تھا۔ اور اسی موقعہ پر مزار پرانوار کے سامنے ذرا قدم روک کر فاتحہ پڑھ لیا تھا۔

خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ اور شیخ احمد سرہندیؒ:۔

برسبیل تذکرہ یہاں پر مجھے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ اور شیخ احمد سرہندی کا واقعہ یاد آ گیا۔ تفصیل کے ساتھ تو میں نے اس واقعہ پر اپنی ایک کتاب ''وجود و شہود'' میں پوری روشنی ڈالی ہے۔ لیکن یہاں پر مختصر طور پر ذکر کروں گا۔ بات یہ تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آن پہنچا۔ کہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کا راستہ اپنے پیر حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ سے الگ ہو گیا۔ وہ ایسے کہ شیخ احمد سرہندیؒ نے وحدت الوجود کے نظریہ سے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ اشارتاً اس کو کفر کے عقیدے سے تعبیر کیا۔ مثال کے طور پر انہوں نے تحریر فرمایا کہ ''اس بزرگوار (خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ، نے میری بہترین تربیت کا بیڑا اٹھایا۔ اور اس کام میں بڑی محنت اور جانفشانی سے مصروف رہے۔ لیکن! میں کیا کروں۔ اور کس طرح سے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ شرک کو گوارا کر لوں''۔

علاوہ ازیں اس سلسلہ میں شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کے درمیان مباحثے بھی ہوئے۔ لیکن جب بات نہ بنی اور حضرت خواجہ باقی باللہ پوری طرح سمجھ گئے کہ شیخ کی نسبت ان سے قطع ہو گئی ہے اور اپنے لئے ایک الگ راستہ پسند کر لیا ہے۔ اور نیز شیخ کا ''عین'' بھی اسی امر کا مقتضی ہے کہ کسی صورت میں بھی توحید وجودی پر ایقان رکھنے کے لئے تیار نہیں تو ارشاد فرمایا کہ ''اب تم خود بھی کامل ہو گئے ہو۔ اور بے شک اپنے راستے پر چل سکتے ہو''

یہی وہ بات تھی۔ جس کو بعد میں شیخ احمد سرہندیؒ اپنے سلوک کے لئے بطور استناد پیش کرتے رہے۔ کہ ''گویا میرے پیر نے مجھے کامل کہہ ڈالا ہے'' اسی طرح شیخ احمد سرہندیؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''قاضی ابو یوسف کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بزعم خود مقام اجتہاد تک پہنچنے کے بعد ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتا پھرے۔''

کسی وقت جب شیخ کے بعض برادران طریقت نے ان پر یہ اعتراض کیا کہ ''حضرت! آپ نے اپنے پیر کی نسبت کیوں ترک کر دی؟'' تو انہوں نے یہ جواب دے دیا کہ ''میرے پیر نے میری کاملیت پر صاد کیا ہے۔ اور ویسے بھی پیر کی پہلی نسبت سے چمٹے رہنا خالی از نقص نہیں۔ یہاں تک کہ خود میرے پیر حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ نے بھی بڑی سعی کی تھی کہ اپنی پہلی نسبت کو قائم رکھ سکیں گے۔ مگر کامیاب نہ ہوئے''۔

"سب ٹھیک!":۔

خیر! تو حضور بادشاہ جانؒ کا بھی اپنے مرید کے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ انہوں نے کئی کئی بار اس برخود غلط مرید کوٹوکا لیکن وہ اپنی کسی غلطی کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اور نوبت بہ ایں جارسید کہ ایک روز تو برملا طور پر اعلان کر دیا کہ "خواجہ خواجگان غریب النوازؒ نے مجھے ارشاد فرمایا ہے کہ تم غوث زمانہ ہو"۔ حضور بادشاہ جانؒ نے سنا تو ارشا فرمایا کہ:۔

"تب تو یہ بڑی عمدہ بات ہوگئی لیکن ایک بات دوسری بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ غوث تو ساری دنیا کا متصرف ہوتا ہے۔ اب اگر تم اپنے قول میں صادق ہو تو تم بھی کسی کام کے لئے اپنی۔ پوری ہمت متوجہ کرلو۔ اور اگر واقعی وہ کام ہو گیا۔ تو ہو سکتا ہے۔ کہ تمہاری بات میں کچھ صداقت موجود ہو"۔ اس شخص نے جواب دیا کہ "کام کے لئے تو میں نے ہمت آزمالی ہے۔ مگر ہوا نہیں"۔ چنانچہ حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"پھر تم نے یہ کیسے باور کرلیا کہ تم غوث زمان ہو؟"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شخص پورا ہٹ دھرم واقع ہوا تھا اور کسی صورت میں اپنی ضد کو نہ چھوڑا۔ بنا بریں اس کے بعد وہ جو کچھ بھی کہتا تو حضور بادشاہ جانؒ اس کی تائید میں سر مبارک ہلاتے۔ کہ گویا تم "ٹھیک" کہتے ہو۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچ گئی. کہ یہ شخص حضور بادشاہ جانؒ سے مستقل طور پر جدا ہو گیا۔

عبدالرشید بادشاہ کا تعارف:۔

ہم چنیں حضور بادشاہ جانؒ کے سلسلہ میں چند اور افراد بھی ایسے موجود تھے جن کی لایعنی گفتگو اور غیر معقول رویہ کو دیکھ کر تعلیم یافتہ طبقہ بدگمانی اور برگشتگی کا شکار ہو گیا۔ اور حضور بادشاہ جانؒ سے جدائی اختیار کی۔ منجملہ ان میں سے ایک عبدالرشید بادشاہ تھے۔ یہ صاحب بٹ کوٹ کے اخوند موسیٰؒ کی اولاد سے تعلق رکھتے تھے۔ کافی عرصہ حضور خواجہ خواجگان سلطان الہندؒ کی درگاہ عالیہ میں گزارا تھا۔ درگاہ کے متولی جناب سید نثار احمد صاحب مرحومؒ نے ان کو رہائش کے لئے ایک حجرہ بھی دیا تھا. اور یہ وہی حجرہ تھا جس میں ہمارے مرشد پاکؒ عرس سے قبل اور مابعد قیام فرماہوتے تھے جس کا ذکر ہم گزشتہ اوراق میں بھی کر آئے ہیں۔

خیر! تو یہی عبدالرشید بادشاہ عرس کے دوران میں حضور بادشاہ جانؒ کے ڈیرہ میں اخراجات کے منتظم ہوا کرتے تھے۔ علی الصبح حضور مرشد پاکؒ ان کو خرچ واخراجات کے لئے روپے دیتے۔ اسی عبدالرشید بادشاہ نے اجمیر شریف میں چند بالکے بھی پیدا کر لئے تھے۔

اجمیر شریف کے مولوی صاحبان
اور عبدالرشید بادشاہ کی لایعنی باتیں:

اجمیر شریف میں چند مولوی صاحبان بھی حضور بادشاہ جانؒ کے سلسلہ میں شامل ہو گئے تھے۔ جن میں سے مولوی عبداللہ خاصی شہرت کے مالک تھے۔ اور صاحب علم طبقہ ان کو صرف ونحو کا امام مانتے تھے۔ دوسرے مولوی عبدالحی تھے۔ جن کا پیشہ مدرسی تھا۔ ایک اور کا اسم گرامی مولوی عبد المنان تھا۔ اور چوتھے مولوی عبدالستار تھے۔ یہ سبھی حضور بادشاہ جانؒ کے انتہائی عقیدت مند تھے۔ لیکن متاسفانہ جب کبھی یہ عالم حضرات عبدالرشید بادشاہ کی بے سروپا گفتگو سن لیتے تو شکوک و شبہات کے گرداب میں پھنس جاتے۔

یاد رہے کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر کامل حضرت کے حلقہ میں چند ایک افراد بالیقین ایسے ہوتے ہیں جو غیر شعوری طور پر لغزش دینے اور رسوائی کا موجب بنتے ہیں۔ الغرض عبدالرشید بادشاہ ان معزز مولوی صاحبان سے اس قسم کی مضحکہ خیز باتیں کرتے اور کہتے کہ "میری مثال ٹیڑھی کھیر کی سی ہے" راستے میں پڑا رہتا ہوں۔ اور کسی کی کیا مجال جو ایک قدم بھی بادشاہ جانؒ کی طرف بڑھا سکے۔ البتہ یہ بات الگ ہے۔ کہ پہلے مجھے راضی کر لے۔ تو کہیں جا کر اس بات کا امکان ہے۔ کہ بادشاہ جانؒ کے حضور میں رسائی نصیب ہو۔" حضور بادشاہ جانؒ بھی ان کے اس قسم کی لایعنی گفتگو پر تبسم فرما لیتے تھے۔ مگر دوسری جانب مولوی صاحبان کو حیرت ہوتی کہ آخر حضور بادشاہ جانؒ اس شخص کی سرزنش کیوں نہیں فرماتے؟۔

اور تو اور عبدالرشید بادشاہ مولوی عبداللہ جیسے عالم بے بدل کو کہتے کہ "مولوی جی! جب کبھی یہاں تشریف لانے کا اتفاق ہو تو میرے لئے چرس کی پڑیا کا انتظام کر کے آیا کیجئے"۔ بچارے مولوی صاحب جواب دیتے۔ کہ "بادشاہ صاحب! آخر چرس میں وہ کونسی خوبی ہے جو میں تمہارے لئے لایا کروں؟" اور اس کے جواب میں عبدالرشید بادشاہ یہ کہتے کہ "بھئی مولوی جی! تم ٹھہرے ملا۔ اور ملا لوگوں کی بلا جانے چرس کی تقدیس کو اور ہماری تو کیا بات ہے کیونکہ جب میں چرس پینے کے لئے بیٹھتا ہوں تو اس سے قبل باقاعدہ طہارت اور وضو کا اہتمام کرتا ہوں"۔

اس قسم کی نامعقول اور بے مقصد باتوں کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مولوی صاحبان کے عقائد اور عقیدت میں تنزلزل آ گیا۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محسوس کر رہے تھے کہ حضور بادشاہ جانؒ عبدالرشید بادشاہ کو ایسی گفتگو سے بالکل منع نہیں فرماتے بلکہ ان کا ارشاد تو یہ ہوا کرتا کہ "عبدالرشید بادشاہ تو میری نصف جان ہے"۔

اسٹیشن ملانے دس روپے بچالئے :۔

ایک روز کا واقعہ ہے۔ کہ عبدالرشید بادشاہ نواح اجمیر شریف میں اپنے چیلوں کے پاس گئے تھے۔ اسی روز حضور بادشاہ جانؒ نے ڈیرے کے اخراجات کے لئے ملا خان محمد عرف اسٹیشن ملا کو رقم دی تھی (اسٹیشن ملا کہلانے کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ محکمہ ریلوے میں فائر مین تھے۔ اور معیاد ملازمت پوری کر چکے تھے) بہرحال اسٹیشن ملا نے دن بھر خرچ کیا۔ شام کو عبدالرشید بادشاہ اور اسٹیشن ملا یکے بعد دیگرے حاضر ہوئے۔ اسٹیشن ملا نے اٹھ کر مبلغ دس روپے حضور بادشاہ جانؒ کو واپس کرتے ہوئے عرض کیا کہ 'حضورؒ! یہ دس روپے آج کے خرچ سے بچ گئے ہیں۔ اور سارا کام صرف پندرہ روپے میں ہوگیا''۔ اب یہ حقیقت کھل گئی۔ اور یہ باور کرنے میں کسی کو شبہ نہ رہا۔ کہ عبدالرشید بادشاہ ہر روز دس روپے کی بچت اپنی جیب کی زینت بناتے رہے۔ اسی بنا پر وہ سیخ پا ہوگئے۔ اور سٹیشن ملا کو برا بھلا کہنے لگے۔ مگر سٹیشن ملا برابر خاموش رہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی عبدالرشید بادشاہ برا بھلا کہتے رہے۔ تاہم حضور بادشاہ جانؒ نے اس موقعہ پر بھی عبدالرشید بادشاہ کو کچھ بھی نہ فرمایا۔

ایک انتہائی ناخوش گوار واقعہ :۔

ایک اور موقعہ پر کسی عقیدتمند نے ہمیں محلہ اندر کوٹ میں دعوت پر بلایا۔ حضور بادشاہ جانؒ کے ہمراہ ہم بھی تھے۔ اب وہاں پر صورت حال یہ تھی۔ کہ کھانا بالکل پکا پکایا اور تیار تھا۔ لیکن حضور بادشاہ جانؒ فرما رہے تھے کہ عبدالرشید بادشاہ پہنچیں گے۔ تو کھانا شروع کرینگے۔ ادھر عبدالرشید بادشاہ اپنے چیلوں کے ہاں تشریف لے گئے تھے۔ کیونکہ اسی دن انہوں نے تنخواہیں لی تھیں۔ چنانچہ ایک آدمی تو ان کے پیچھے دوڑا دیا گیا۔ مگر وہ جو گیا سو گیا۔ لہذا دوسرا آدمی دوڑانا پڑا۔ حتیٰ کہ بات بارہ بجے سے دو بجے تک پہنچ گئی۔ اتنے میں عبدالرشید بادشاہ لنگڑاتے اور بھدکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ مگر اس حال میں کہ آپے سے باہر تھے۔ قہر وغضب سے بھرپور اور غصہ سے آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ بے شک اس وقت ان کی ہیبت کذائی عجوبۂ روزگار تھی۔ اور دیکھنے کے قابل! وجہ یہ ہے کہ پہلے ہی ایک ٹانگ سے لنگڑے اور اسی طرح ایک ہاتھ سے ٹنڈے تھے۔ ٹخنوں تک لمبی چوڑی قمیص اس کے اوپر تھی۔ اور سر کے بال بھی خاصے لمبے تھے۔ گویا غصے کے مارے بھوت ہو کر اندر داخل ہوئے اور پوری برہمی سے حضور بادشاہ جانؒ سے یوں مخاطب ہوئے کہ'' خدا تمہاری بزرگی سولہ کھمبے کے ملنگوں کے حوالے کرے تم نے پورے ایک سو روپے میرے ہاتھ سے جانے دیئے۔ بتا اب وہ کون دے گا؟'' محفل میں بیٹھے ہوئے تمام حاضرین دم بخود اور ہکے

بکے رہ گئے۔ اور کچھ دیر کے لئے اتھاہ خاموش رہے۔ ہر ایک اسی انتظار میں تھا کہ دیکھئے کہ حضور بادشاہ جانؒ اب کیا ارشاد فرمائیں گے؟ مگر وہ قطعی خاموش رہے اور ایک حرف بھی زبان مبارک پر نہ لائے۔

ویسے تو عبدالرشید بادشاہ کی اس گستاخی پر حضور بادشاہ جانؒ کے وہ مرید جو موقعہ پر موجود تھے۔ بھی برہم ہو رہے تھے۔ مگر بولا کوئی نہیں۔ البتہ یہ بدنصیبی اور بیوقوفی میری قسمت میں ہوگی۔ کہ میں نے عبدالرشید بادشاہ کو جواب دیا۔ اور جواب کیا تھا؟ بس گالی! سخت ترین اور فحش قسم کی گالیاں جو تحریر میں لانے کے قابل نہیں۔ ہاں ایک بات ان میں سے یہ بھی تھی۔ کہ ''اٹھ کر آ جاؤں۔ اور توڑ دوں تیری دوسری ٹانگ بھی؟''

بہر حال میری گفتگو سن کر بھی سب خاموش رہے۔ اور حضور بادشاہ جانؒ نے مجھے بھی کچھ نہ فرمایا۔ بارے کھانا کھایا گیا۔ اور سب رخصت ہو گئے۔ لیکن عبدالرشید بادشاہ تا زیست میرے مخالف ہو گئے اور بعد ازیں میری مخالفت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔ مدعا یہ کہ اجمیر شریف کے مولوی صاحبان حضور بادشاہ جانؒ سے برگشتہ ہو کر جدا ہو گئے اور سچی بات یہ ہے کہ ان حالات میں ان کو قصوروار بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

اولیاء اللہ کی محفل میں ایسے لوگوں کی موجودگی:۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ میں درگاہ شریف میں حاضری دینے کے لئے چلا گیا تھا۔ مولوی عبداللہ صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان کے قریب میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ درحقیقت وہ بڑے بااخلاق اور بامروت انسان تھے۔ ان سے باتیں شروع ہوئیں تو باتوں باتوں میں میں نے ان سے پوچھا کہ ''مولوی صاحب! آپ حضور بادشاہ جانؒ سے کیوں جدا ہو گئے؟'' انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ کہ ''سچی بات کہہ دوں تو برا لگے گا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ حضور بادشاہ جانؒ اپنے مریدوں کو مکمل طور پر قابو میں نہیں رکھ سکتے؟'' میں نے کہا کہ ''مولوی صاحب! بات یہ نہیں اور آپ سے مخفی نہ ہوگا۔ کہ ایسے بزرگ حضرات کے ہاں اس قسم کے بے تکے لوگ ضرور ہوا کرتے ہیں۔ جن سے شیطان کا کام لیا جاتا ہے۔ نیز آپ کو اس بات کا بھی علم ہوگا۔ کہ یہ سب، کچھ طالبان حق کے لئے آزمائش کے طور پر ہوا کرتا ہے۔ خیر اس بات کو چھوڑ دیئے۔ اور یہ بتا دیجئے کہ کیا وہ خود آپ نہ تھے۔ جو حضور بادشاہ جانؒ کو امام مہدی علیہ السلام تصور کرتے تھے؟'' یہ سن کر مولوی صاحب بولے کہ ''ہاں درست ہے پہلے میرا یہی خیال تھا لیکن اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر میرا یہ خیال تھا تو یہ یکسر غلط تھا''۔ میں نے مولوی صاحب سے مزید کہا۔ کہ ''مولوی صاحب! برا نہ مانئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کی طلب میں فتور تھا اور بالیقین اس میں اخلاص

کی جنس نہ دارد تھی۔ ورنہ آپ جیسا عالم کیونکر جذبات کی رو میں بہتا؟''۔
تاہم بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی میری بات حقیقت پر مبنی تھی۔ کیونکہ کسی موقعہ پر میں نے حضور بادشاہ جانؒ سے گزارش کی تھی۔ کہ'' حضورؒ! آپ کے ساتھ انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود مولوی عبد اللہ صاحب آپ سے کیوں کنارہ ہو گئے؟۔

مولوی عبداللہ کے بارے میں حضورؒ کا ارشاد:۔

میری گزارش سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔
''بات یہ تھی کہ مولوی عبداللہ تھا مجرد۔ اور اس کی خواہش تھی کہ مولوی عبدالحئی کی صاحبزادی سے اس کا بیاہ ہو جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں اس نے کہا تھا۔ کہ میں اس کی سفارش کروں۔ مگر میں نے سمجھا دیا تھا کہ مولوی صاحب! یہ آپ لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ اور آپس ہی میں اسے طے کر لو۔ اس بات پر مولوی عبداللہ مجھ سے روٹھ گیا۔ اور بعد میں کسی کو یہ بھی کہا تھا کہ بادشاہ صاحب نے میرا ایک معمولی سا دنیائی کام نہ کیا تو کل کلاں آخرت میں میرے کس کام آجائینگے؟''
بہر کیف صرف مولوی صاحب ہی نہیں بلکہ دیگر مولوی صاحبان بھی حضور بادشاہ جانؒ سے الگ ہو گئے...... ان میں صرف عبدالحی صاحب کبھی کبھی رسماً حاضر ہوتا۔ ورنہ اس کی نسبت بھی ختم ہو چکی تھی۔

جب حضورؒ شگفتہ خاطر اور مسرور ہوتے تھے:۔

گاہے گاہے جب مرشد پاکؒ شگفتہ خاطر ہوتے تھے۔ تو میں ان سے بعض امور کے متعلق دریافت کرتا۔ چنانچہ ایک روز جب ان کی طبیعت پاک فرحت آگین تھی۔ تو میں نے خدمت اقدس میں نے گزارش کر دی۔ کہ'' حضور! آپ کی بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن کی کوئی تاویل نہیں بن پڑتی''۔

لاکھوں میں ایک کی تلاش:۔

مرشد دل آگاہ میرے مطلب کو سمجھ گئے ۔ اور مندرجہ بالا گزارش کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:۔'' صحیح اور موزون ترین آدمی کی تلاش میں ہوں ۔ مگر افسوس کہ تاحال ایسا کوئی آدمی بھی ہاتھ نہ آیا۔ ویسے بھی لاکھوں میں ایک ہی صحیح آدمی پیدا ہوتا ہے۔''

حضرت شیخ سائیں صاحبؒ کے ارشاد کا احترام:۔

ایک دوسرے موقعہ پر میں نے یہاں تک عرض کیا تھا۔ کہ ”حضور! ہمارے سارے گروہ میں تو ایک بھی ایسا آدمی نظر نہیں آتا۔ جو صاحب علم ہو۔ اور علمیت تو بڑی بات ہوئی یہاں تو محض معقول قسم کے انسان کا ملنا بھی محال ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے۔ کہ آپ ان خالی تلوں میں تیل دریافت کرنے کی جستجو فرما رہے ہیں“۔

حضور بادشاہ جانؒ نے تبسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

”تمہیں حقیقت انسانیہ کا کیا علم ہے؟ کیونکہ انہی لوگوں میں سے جو بظاہر نرے نامعقول نظر آتے ہیں۔ ایسے ایسے بیش بہا نگینے دستیاب ہوتے ہیں۔ جو تاج خسروانہ میں جڑ لینے کی پوری اہلیت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔ اور ہر انسان میں حق تعالیٰ جل وعلا کے مجمل صفات کا خاکہ موجود ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ مجھے حضور سائیں صاحبؒ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ”تمہارے شاگردوں میں سے ایک شاگرد ابدالیت کے مرتبہ پر فائز ہوگا۔ لہذا اس کا بڑا خیال رکھنا“۔ حضور سائیں صاحب کے اس ارشاد کی روشنی میں میرا خیال تھا کہ یہ شخص فلاں (بیاں پر حضور بادشاہ جانؒ نے اپنے ایک مرید کا نام لے لیا) ہوگا مگر۔ اب سوچتا ہوں تو کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا“۔

ایک اور غضبناک ابتلا:۔

اگر حضور بادشاہ جانؒ کو کوئی تکلیف ہو جاتی تو مجھ سے ضرور اس کا ذکر فرماتے۔ اور ابتلا وغیرہ کے موقعوں پر تو خصوصی طور پر ارشاد ہوتا۔ چنانچہ ۱۹۳۴ء میں جیسا کہ مذکورہ ہو چکا ہے میں اجمیر شریف میں موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ کمزوری حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی اس لئے میں ڈیرے سے کمتر ہی نکلتا۔ انہی ایام میں حضور بادشاہ جانؒ کے ڈیرے میں ایک نوجوان دوشیزہ آ گئی۔ اتنی خوب صورت تو نہ تھی۔ مگر شباب بجائے خود ایک دلکش اور دلفریب حسن ہے اور پھر کیا بات ہے۔ اس کنواری دوشیزہ کی جس کا لباس عصمت صحیح وسلامت ہو۔ ایسی دوشیزہ میں تو غضب کی دلربائی اور جاذبیت ہوتی ہے۔ یہ لڑکی (جیسا کہ پہلے بھی میں ذکر کر چکا ہوں) الائی ضلع ہزارہ کی رہنے والی تھی۔ لوگ کہتے تھے۔ کہ سیدزادی ہے۔ لمبے لمبے سنہری بال۔ میانہ۔ قد رعنا بھرا بھرا پر گوشت جسم رکھتی تھی۔ جب سماع سنتی تو وجد میں آ جایا کرتی تھی۔ پہلی بار جب وہ حضور بادشاہ جانؒ کے ڈیرے میں آئی تو بلا تأمل حضور بادشاہ جانؒ کے ہاتھ چوم لئے اور معاً وجد میں آ گئی۔ تھوڑی دیر بیٹھی رہی پھر اٹھ کر درگاہ شریف کی طرف چل دی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی وہ حضور بادشاہ جانؒ کو ایک نظر دیکھ لیتی۔ تو فوراً وجد میں آ جاتی تھی۔ پھر تو اس نے گاہے گاہے آنا بھی شروع کر دیا۔

یادر ہے کہ درگاہ شریف میں حضور بادشاہ جاںؒ کا ڈیرہ ہی تھا جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ میں اکثر اس کے باہر برآمدے میں فرش پر دراز ہوتا۔ ویسے بھی درگاہ شریف میں چارپائیاں نہ ہوتی تھیں۔ اور سبھی لوگ فرش پر سوتے۔ یہ فرش پتھر سے بنایا گیا تھا۔ اس کے اوپر کمبل بچھا کر میں لیٹ جایا کرتا تھا۔ اور جب کبھی بھی مجھے اجمیر شریف میں حاضری دینے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ تو کسی بار بھی بستر ہ لیکر نہیں گیا ہوں۔ بہر حال ایک روز دوپہر کے وقت میں سو رہا تھا۔ کہ اسی دوران میں کسی کی آہٹ سنائی دی۔ بیدار ہو گیا۔ کان لگا کر سنا تو معلوم ہوا۔ کہ آہٹ حضور بادشاہ جاںؒ کے کمرے سے سنائی دے رہی ہے۔ مڑ کر جھانکا تو دیکھا کہ وہ لڑکی حضور بادشاہ جاںؒ کے روبرو بیٹھی ہوئی وجد ہے اسوقت اس کے لمبے لمبے بال دائیں بائیں کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ عبد الرشید بادشاہ بھی قریب ہی بیٹھے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ حضور بادشاہ جاںؒ اس لڑکی کو وجد کی حالت میں چھوڑ کر درگاہ مبارک کی طرف تشریف لے گئے۔ چنانچہ میں دوبارہ لیٹ گیا۔ اور جلد ہی نیند کے آغوش میں چلا گیا۔

حضورؒ کا قیلولہ نہ فرمانے کی وجہ:۔

دوسرے روز دوپہر کو حضور بادشاہ جاںؒ نہ سو سکے۔ ان کو نیند ہی نہ آئی۔ حالانکہ عادت مبارک تھی۔ کہ قیلولہ ضرور فرماتے اس لئے کہ رات کو دس بجے سے لیکر بارہ بجے تک سماع سماعت فرماتے۔ بعد میں نماز تہجد کے لئے اٹھتے۔ اور سورج کے طلوع ہونے تک ورد و اوراد میں مصروف رہتے۔ گویا اس کے بعد آرام فرمانے کا وقت ہی نہ ملتا۔ البتہ قیلولہ کا وقت آرام فرمانے کے لئے مقرر تھا اور بس!

خیر تو اسی دوپہر کو مجھے اشارہ سے اپنے حضور میں طلب فرمایا۔ جب میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو ارشاد فرمایا کہ۔

''ویسے ذرا باہر چلتے ہیں''۔

سروقد کھڑے ہو گئے اور روانہ ہو گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے جا رہا تھا۔ جاتے جاتے ہم بلند دروازہ سے نکل کر درگاہ بازار میں داخل ہو گئے۔ وہاں پر حضور بادشاہ جاںؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''امیر حمزہ! میں اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کو رسول اکرم ﷺ اور بابا صاحب (خواجہ خواجگانؒ) کو بھی بہ ہزار منت التجائیں کیں، مگر میری فریاد کی شنوائی نہیں ہوئی''۔

''حضور! خیریت تو ہے؟'' میں نے حیرت و استعجاب سے پوچھا اور پریشان بھی ہوا۔ سوچ رہا تھا۔ کہ خدانخواستہ کونسا واقعہ پیش آ گیا ہے۔؟ تب حضور بادشاہ جاںؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''تم نے وہ سید لڑکی نہیں دیکھی؟''

میں سمجھ گیا۔اور دوبارہ عرض کیا۔کہ حضور! تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ کیونکہ محبت تو ایک بڑا پاکیزہ جذبہ ہے۔اور پاک ہی دلوں میں جنم لیا کرتی ہے۔ حضور بادشاہ جانؒ نے میری بات سماعت فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''تمہارا خیال صحیح ہے۔لیکن محبت آدمی کو اپنے منصبی فرض سے غافل کر دیا کرتی ہے۔ چنانچہ حالت یہ ہے۔کہ نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں۔تو سامنے اس لڑکی کی تصویر ہوتی ہے۔درگاہ شریف جاتا ہوں۔تو بھی یہی صورت ہوتی ہے۔روز و شب حق سبحانہ وتعالیٰ سے سوال کرتا ہوں۔مگر ابھی تک اس بلا سے خلاصی نہیں ہوئی''۔

باتوں باتوں میں ہم خواجہ غریب النوازؒ کے چلہ خانے تک پہنچ گئے۔اور یہاں پر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''چلو اب واپس چلیں۔کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ساتھی انتظار میں ہوں گے''۔

اسی طرح ہم واپس چلے آئے۔

عازم سندھ ہونے سے قبل حضورؒ کی ہدایت:۔

غرض یہ کہ کبھی کبھی یہ لڑکی آتی۔لیکن جس وقت حضور بادشاہ جانؒ سندھ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے۔تو اسی موقعہ پر مجھے بھی گاؤں جانے کا مشورہ دیا۔اور جیسا کہ آپ نے پڑھا ہوگا۔میں نے عرض کیا تھا کہ ''حضور! ویسے بھی مر رہا ہوں۔سو یہی بہتر ہے کہ یہاں فوت ہو جاؤں۔اور گور غریباں میں دفن ہو جاؤں۔اسی موقعہ پر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

''یہ تمہارا وہم ہے۔ویسے اب نہیں مرو گے۔لیکن خیر! اگر تمہارا یہاں رہنے کا پختہ ارادہ ہو.تو چندن اور ٹھہر جاؤ۔ساتھ ہی اس سید لڑکی کا بھی خیال رکھنا۔کہیں گڈ مڈ نہ ہو جائے۔اور ہاں اگر تمہاری تکلیف بہت بڑھ جائے۔تو بلند دروازہ میں جو سفید ریش مجذوب بیٹھا ہے۔اس کے پاس جاتے رہا کرنا۔کیونکہ یہ مجذوب حضور خواجہ غریب النوازؒ کا کوتوال ہے۔

سید لڑکی محلّہ اندر کوٹ میں رہتی تھی:۔

حضور بادشاہ جانؒ تو سندھ تشریف لے گئے۔اور میں وہیں درگہ غریب النوازؒ میں رہ گیا.وہ لڑکی اکثر ہمارے ساتھ رہتی۔مگر رات محلّہ اندر کوٹ میں بسر کرتی۔اس کا کہنا تھا کہ اسی محلّہ میں اس کی منہ بولتی ماں ہے اور اسی کے ہاں رہتی ہے۔

جالندھر کی درویش عورت :۔

یاد ہوگا کہ۔ میں نے پچھلے صفحات میں جالندھر کی ایک درویش عورت کا بھی ذکر کیا تھا۔ انہی دنوں میں وہ بھی برآمدے میں رہتی تھی۔ عاملہ تھی۔ کسی قدر تعلیم یافتہ بھی تھی۔ ایک مرید بھی ہمراہ تھا۔ یہ وہی عورت ہے جس کو ہمارے محترم کوہاٹ بادشاہ نے توجہ دے کر اپنے حلقہ ارادت میں داخل کیا تھا۔

کوہاٹ بادشاہ کی نسلی گردش :۔

رہے کوہاٹ بادشاہ۔ تو یہ وہی صاحب ہیں جن کا کچھ نہ کچھ ذکر میں گزشتہ اوراق میں بھی کر چکا ہوں۔ بہرحال آپ حضرت شیخ رحمکار عرف کا کا صاحب قدس سرہٗ کی نسل سے ہیں۔ اور یہ چند سطور تحریر کرنے کی ضرورت مجھے اس وجہ سے پیش آئی۔ کہ کوہاٹ بادشاہ نے خود بھی اپنی ایک کتاب میں اپنا سلسلہ نسب حضرت کا کا صاحب قدس سرہٗ تک پہنچا دیا ہے۔ مگر تعجب ہے۔ کہ ایک روز اسی ذیل میں (غالباً 1933ء میں) انہوں نے حضور بادشاہ جانؒ سے تو تو میں میں بھی کی تھی۔ اور یہ حادثہ اس وقت ظہور میں آیا تھا۔ جبکہ حضور بادشاہ جانؒ نے کوہاٹ بادشاہ سے مخاطب ہوکر ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

''کوہاٹ بادشاہ! تمہارے فلاں فلاں کاکاخیل عزیز واقارب بھی اجمیر شریف آ گئے ہیں''۔

آتش فشاں حسینی سید تھے :۔

بات محض اسی قدر تھی۔ لیکن کوہاٹ بادشاہ نے گرم ہوکر جواب دیا۔ کہ ''حضورؒ! میں کاکاخیل نہیں۔ بلکہ حسینی سید ہوں۔ کوہاٹ بادشاہ کی اس بات کو سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ کچھ غمگین ہوئے اور چند ایک تلخ باتیں بھی سنائیں۔ نیز پورے تیقن سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''تم۔ یقیناً کاکاخیل ہو!''

لیکن اپنے مرشد کو جواب دینے کے باوصف کوہاٹ بادشاہ نے مزید بھی کسی امر کو خاطر میں لائے بغیر یہاں تک کہہ دیا۔ کہ'' اچھا! تو کل بروز محشر رسول ﷺ کے روبرو میری اور آپ کی بات کا فیصلہ ہوگا''۔

روز حشر سے قبل ہی کا کا خیل ہو گئے:۔

لیکن حضور بادشاہ جانؒ کا وصال فرمانے کے بعد جب کوہاٹ بادشاہ اپنی ۔تالیف زیور طبع سے آراستہ کر کے منصۂ شہود پر لے آئے ۔اور میری نظر سے بھی گزری تو اس میں لکھا پایا کہ محترم نے اپنا سلسلۂ نسب حضرت شیخ رحمکار کا کا صاحب قدس سرہٗ تک پہنچا دیا ہے۔
اب حیرت صرف اسی بات پر آتی ہے کہ باوجود یکہ یہ بات کوہاٹ بادشاہ کے علم میں تھی ۔کہ مرشد پاکؒ حضرت کا کا صاحب قدس سرہٗ کو سید تسلیم فرماتے تھے ۔لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان دنوں کوہاٹ بادشاہ کو بذات خود حضرت رحمکار قدس سرہٗ کے سید ہونے میں کچھ شبہ تھا۔

دوآتشہ تعارف:۔

بہر حال جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کوہاٹ بادشاہ کو جالندھر کی مائی کی اس بات پر کہ ''جی ہاں! ایسے کئی پیر یہاں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ پر بیحد غصہ آیا۔ اور مجھ سے توجہ دینے کی ترکیب سیکھنے کی التجا کی۔ میں نے بھی مذاق مذاق میں کچھ بتا ہی دیا.مگر میرا خیال تھا کہ کوہاٹ بادشاہ اس سے کام نہ لیں گے۔مگر حق یہ ہے۔ کہ ہمارے کوہاٹ بادشاہ بڑے ہی سادہ مزاج آدمی واقع ہوئے ہیں.اور صنف لطیف میں تو ان کے لئے خاصی کشش بھی موجود ہے۔ تاہم بڑے مزے کے طرحدار آدمی ہیں.اب تو داڑھی سفید ہو گئی ہے۔مگر یہ الگ بات ہے۔ کہ جوانی کی شوخیاں تا ہنوز بحال ہیں.اور میری تو ان کے ساتھ پوری آزادی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں کا آپس میں رشتہ طریقت کی برادری کے ساتھ علیحدہ طور پر بھی بھائی چارے کا قول و اقرار ہوا ہے۔ خیر! تو برادرم کوہاٹ بادشاہ نے جالندھر کی مائی کو توجہ دی.اور دس منٹ کے بعد جب مجھے کمرے کے اندر بلایا تو میں نے دیکھا کہ ابھی تک وہ طائر نو گرفتار کوہاٹ بادشاہ کے قدموں میں بسمل پڑی ہوئی ہے ۔اور حد یہ کہ اس کو اپنے حلقہ ارادت میں بھی شامل کر لیا ہے۔

اس واقعہ نفس امری کے بعد:۔

غرض یہ کہ اس واقعہ نفس الامری کے بعد مائی نے اچانک اپنی فریاد و فغان سے کچھ ایسی ہلچل مچا دی.کہ اس کی آہ آتشین سے گردبیوں کے کان گنگ ہو گئے ۔وہ برابر آہ و نالہ کر رہی تھی۔ کہ ''ہائے میں ڈوب گئی'' بالآخر میں نے قریب جا کر پوچھا کہ ''مائی کے دشمنوں کو کونسی تکلیف پہنچی ہے۔اور نیز ماجرا کیا ہے؟'' اس نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا کہ ''غضب یہ ہو گیا کہ میری ساری عاملیت سلب ہو گئی ہے اور اس سے کوئی کام نہیں نکلتا''۔قریب بیٹھے ہوئے مائی کے مرید نے اس

کی وضاحت اور تشریح یوں بیان کی۔ کہ "مائی کو جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو کسی درخت کے پتہ پر کچھ پھونک دیتی تھی۔ بعد ازیں مذکورہ پتہ کسی کپڑے میں لپیٹ کر میرے حوالے کر دیتی اور مجھے کہہ دیتی کہ بازار جا کر ایک روپیہ کی فلاں چیز لے آنا۔ میں بازار چلا جاتا۔ اور جب اس پتہ کو کھول کر دیکھتا تو اس کی جگہ کپڑ میں ایک روپیہ نقد دستیاب ہوتا"۔

یہ کرشمہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا البتہ پنجابن مائی بڑی بے چین تھی۔ اور بیحد گریہ وزاری میں مبتلا! تو اس کی اس قسم کی بیقراری کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے۔ کہ شاید اس عاملیت میں کچھ صداقت موجود ہو؟

بہر تقدیر جالندھر کی مائی نے کوہاٹ بادشاہ سے التجائیں کیں۔ اور درخواستیں گزاریں کہ عاملیت واپس لوٹا دے۔ ادہر کوہاٹ بادشاہ اس کی تسلی کے لئے کہتے کہ "رنجیدہ ہونے کی کوئی بات نہیں چند دنوں کے بعد عاملیت دوبارہ عود کر آئے گی۔ اور نیز یہ کہ یہ اس یاوہ گوئی کی سزا ہے جو تم نے حضور بادشاہ جانؒ کی شان مبارک میں کی تھی"۔

مختصر یہ کہ جب میں اور کوہاٹ بادشاہ پشاور آرہے تھے تو پنجابن مائی بھی ہمارے شریک سفر تھی۔ اور جالندھر کے اسٹیشن پر اتر گئی۔ اس کے بعد آج تک اسے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

ظلم عظیم :۔

جہاں تک سیدہ بی بی کا تعلق ہے۔ تو اس بارے میں حضور بادشاہ جانؒ کا ایک نامۂ مبارک سندھ سے آ پہنچا تحریر فرمایا گیا تھا:۔

"تصور تو ابھی تک اس کا آتا ہے۔ مگر اس میں روز بروز کمی واقع ہو رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اب وہ عفیفہ نہیں رہی۔ جو پہلے تھی۔ اس بات کا یقین مجھے بھی آ گیا تھا۔ کیونکہ حضور بادشاہ جانؒ کے عازم سندھ ہونے کے چند دنوں کے بعد جب ایک موقعہ پر میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو اس کے چہرے سے پہلے جیسی نورانی دلکشی عنقا ہو گئی تھی۔

تجرد کی آفتیں :۔

حضور بادشاہ جانؒ سندھ سے تشریف لے آئے۔ تو اسی بارے میں ایک روز یوں ارشاد فرمایا کہ:۔

"مجھے کبھی کبھی غوث علی شاہ قلندر پانی پتی" کا وہ واقعہ یاد آ جاتا جو ان کا ایک ہندو عورت پر عاشق ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ غوث علی شاہ (رحمتہ اللہ علیہ) کو اس کی محبت نے اس قدر بے چین کر دیا کہ ایک مقام پر بیٹھ گئے۔ اور ہندو عورت کو توجہ دی۔ توجہ کا اثر تھا کہ عورت کھچ کر ان کے قدموں

میں آ گئی۔ بارے انہوں نے محض ایک نظر دیکھ کر واپس جانے کی اجازت دے دی۔
دراصل تجرد کی زندگی میں بے انداز آفتیں ہوتی ہیں۔ اور وہ طائفہ جو مجرد ہو کر باعصمت اور پاک دامن رہتا ہے وہ تو اکثر اوقات ایسے واقعات سے دوچار ہوتا رہتا ہے"۔

مزدو عورت:۔

ہندوستان میں ٹھیکیداری کے دوران حضور بادشاہ جانؒ سے اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ اسی بارے میں حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔
"مزدوروں میں ایک شکیل عورت بھی تھی۔ جو غربت وافلاس کے باوصف بڑی حسین وجمیل تھی۔ یہ عورت اس لئے بھی قابل تعریف تھی کہ اس کا شوہر اپاہج تھا۔ اور یہ اس کی باوفا رفیقۂ حیات تھی۔ بس محنت مزدور کرتی۔ اپنا اور اپنے اپاہج شوہر کا پیٹ پالتی۔ مگر سوء اتفاق سے ایک روز میرے جمعدار نے بری نیت لیکر اس عورت سے چھیڑ چھاڑ کی۔ دوسری جانب عورت تھی پاکدامن! کام چھوڑ کر سیدھی میرے پاس آ گئی۔ اور ان الفاظ میں جمعدار کی شکایت کی کہ" جمعدار نے مجھے بری نیت سے چھیڑا ہے۔ اور دیکھو۔ بادشاہ صاحب آپ ہوتے تو میں کچھ نہ کہتی۔ لیکن جمعدار نے ایسی بری حرکت کیوں کی؟" میں نے یہ سن کر اس کو تسلی دی۔ اور کہا کہ واقعی جمعدار نے برا کیا ہے۔ اور میں ابھی اس کو کام سے الگ کر دیتا ہوں۔ باقی رہا میں؟ تو میری طرف سے خاطر جمع رکھو میں ان معاملوں سے دور ہی بہتر ہوں۔ بہرحال جمعدار کو میں نے ہٹا دیا"۔

کوتوال مجذوب بابا:۔

چونکہ حضور بادشاہ جانؒ نے سندھ تشریف لے جاتے وقت مجھے اس مجذوب کے پاس آنے جانے کا ارشاد فرمایا تھا۔ جو بلند دروازہ میں بیٹھا تھا۔ سو ایک روز جبکہ مجھے شدت کی تکلیف ہو رہی تھی۔ تو اسی کوتوال مجذوب بابا کے پاس چلا گیا۔ انکی داڑھی بالکل سفید تھی۔ اس وقت کتے کا ایک بچہ پہلو میں بٹھایا تھا۔ اور چند اور زمین پر ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ عوام الناس مجذوب بابا کے لئے بھر بھر کر چاء کی پیالیاں لاتے۔ وہ ان میں سے ایک گھونٹ پی کر باقی کو زمین پر گرا دیتے تھے۔ وہ مجذوب محض نہ تھے۔ بلکہ سالک مجذوب تھے۔ مجھے دیکھا تو مسکرائے اور پوچھا" کیوں پٹھان! تکلیف ہو رہی ہے؟" کوتوال بابا دوبارہ بولے۔" تو پھر ہٹا دوں ساری تکلیف؟"۔ میں نے کہا۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں بابا بڑی تکلیف میں ہوں۔ نیکی اور پوچھ پوچھ؟" یہ سن کر کوتوال بابا سربہ گریبان ہو گئے۔ اور مجھے توجہ دینی شروع کی تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنے پاؤں کے تلوؤں میں بجلی کی سی کرنٹ محسوس کی۔ اور یہ برقی رو آہستہ آہستہ میرے سارے بدن میں

سرایت کر رہی تھی۔ان برقی لہروں کے دوران۔میں زبردست خوشی اور مستی کے آغوش میں چلا گیا تھا۔جونہی برقی رو میری کھوپڑی میں داخل ہوگئی تو فوراً صحت و تندرستی اور اچھی خاصی طاقت میرے بدن میں آ گئی۔اور میں بالکل سیدھا کھڑا ہوگیا کوتوال بابا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔اور کہا "ہاں! تندرست ہوگئے ہو۔اب جا کر سیر و تفریح کر سکتے ہو"۔

ظاہر ہے کہ ان دنوں میں بہت کمزور ہوگیا تھا۔اور بڑی مشکل سے سو دو سو قدم چل پھر سکتا تھا۔لیکن اس روز میں نے دو تین گھنٹے گھوم پھر کر سیر کی۔لیکن تھکاوٹ نام کو بھی محسوس نہ ہوئی۔

اس کے بعد کوتوال بابا کے پاس ہر روز جانا میرا معمول ہوگیا۔یہاں تک کہ ایک [illegible]ز اس نے مجھ سے پوچھا کہ "تم سے رخصت ہوتے وقت تمہارے پیر نے تم سے کچھ کہا تھا؟" [illegible]یں نے جواب دیا۔کہ "ہاں! انہوں نے فقط اسی قدر ارشاد فرمایا تھا۔کہ اگر تکلیف نا قابل برداشت حد تک بڑھ جائے۔تو کوتوال بابا کے پاس چلے جانا۔کوتوال بابا بولے کہ "تم جانتے ہو تمہارے پیر کا ایسا کہنے سے اصلی مطلب کیا تھا؟" میں نے کہا کہ " بابا مطلب کا تو مجھے علم نہیں " اب بابا " مطلب " سمجھاتے ہوئے بولے کہ " مطلب یہ تھا۔کہ اب تمہارا مزید کام اس کے ہاں ختم ہوگیا ہے اور آگے تمہارا کام میرے ذمے ہوگا" کوتوال بابا کا یہ کلام سن کر مجھے رنج ہوا۔اور عرض کیا۔کہ بلاشبہ میرے مرشد پاکؒ نے مجھے آپ کے ساتھ کبھی کبھی ملاقات کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔مگر اس سے زیادہ مجھے آپ کی تربیت قبول نہیں۔یہ سن کر کوتوال بابا کو تاؤ آ گیا۔اور طیش میں آ کر بولے کہ "اچھا۔تو یہ بات ہے۔۔اے لو جو تکلیف میں نے تم سے دور کی ہے دوبارہ تم پر مسلط کی گئی! یہ کہا اور سر بہ گریباں ہوگیا۔ایک لمحہ نہ گزرا ہوگا۔کہ پہلے سے بھی زیادہ کئی گنا تکلیف میں گرفتار ہوگیا ابتری اور سراسیمگی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اور جب میری بدحواسی بہت بڑھ گئی۔تو حضور خواجہ خواجگانؒ کے روضۂ اطہر کی طرف دوڑ پڑا۔مگر غضب یہ کہ میرے ہاتھ پاؤں سے دم نکل گیا تھا۔وہ تو جواب ہی دے چکے تھے تاہم گرتا پڑتا بمشکل تمام جنتی دروازے تک پہنچ ہی گیا۔اور وہاں پر چیخ چیخ کر بلند آواز سے پکارنا شروع کیا۔

"یا غریب نواز! ایک نظر دیکھو یہ ظالم کیا کر رہا ہے"؟

تکلیف بے پناہ تھی۔اور رینگتے رینگتے میں قدم مبارک کے دروازے سے ہوتا ہوا صندلی دروازے تک پہنچ گیا۔مگر یہاں پر رہی سہی طاقت بھی جواب دے چکی۔اور مجھے پختہ یقین ہوگیا۔کہ اب میری زندگی کے صرف ..... چند ایک آخری سانس باقی رہ گئے ہیں۔کوتوال بابا کا تصور برابر میرا پیچھا کر رہا تھا۔اضطراب و اضطرار کی اس ہولناک گھڑی میں میرے حواس نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔اور میں بے ہوش ہوگیا۔مگر یہ بات بڑی حیرت انگیز تھی۔کہ عالم بے خودی میں بھی کوتوال بابا کا وجود مثالی میرے سامنے کھڑا تھا۔اور غضبناک نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔اسی لمحہ

مجھے خیال آیا کہ نہ تو خواجہ غریب النوازؒ نے اور نہ ہی میرے اپنے مرشد پاکؒ نے کچھ دستگیری فرمائی۔تو کیا یہ بہتر نہ ہوگا۔کہ بقول کوتوال بابا اسی کی تربیت قبول کرلوں؟ مگر اس کے فوراً بعد یہ خیال بھی آ گیا۔کہ ایک بار تو ویسے بھی تجھے مرنا ہے تو جان دے دو۔مگر بے غیرتی کا ارتکاب نہ کرو۔کیونکہ یہ اپنے مرشد پاکؒ سے کتنی بڑی بے وفائی ہوگی۔کہ انہوں نے تو اجازت نہ دی ہو۔ اور میں کسی اور کے آستانے پر سر جھکا دوں۔دوسرے یہ کہ اس راہ میں تو سر کی قربانی دینا اور زندگی میں موت سے ہمکنار ہونا لازمی امور ہیں۔

اسی طرح میں کسی خاص اور حتمی فیصلے پر نہ پہنچنے پایا تھا۔کہ اس لمحے میں میرے مرحوم ومغفور والد محترمؒ کا وجود مثالی ظاہر ہوا۔اور ٹھیک میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ان کے حاضر ہوتے ہی کوتوال بابا کا تصور کچھ دھندلا سا ہوگیا۔اور مجھے کامل یقین آ گیا کہ میرے سامنے میرے والد محترمؒ کی روح کھڑی ہے۔

والدمؒ کے بارے میں حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد:۔

کبھی کبھی حضور بادشاہ جانؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔کہ ”لنڈی کوتل کے سارے مقبرے میں کسی اور کی روح ملک بابا کی روح کے مقابلے میں قوی معلوم نہیں ہوتی۔باوجودیکہ میرے والد محترم نے عبادت وریاضت نہ کی تھی۔مگر ان کی نیت بڑی صاف تھی۔صلئہ رحمی اور ہمدردی کا جذبہ ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

بہر نوع جو روح اس وقت میرے روبرو تھی۔ہوسکتا ہے کہ والد محترمؒ کی صورت میں میرے مرشد پاکؒ یا حضور خواجہ خواجگانؒ نے دستگیری فرمائی ہو۔بہر حال مذکورہ روح نے تاکیدی طور پر مجھے مندرجہ ذیل کلمات فرمادیئے۔

”بیٹا۔۔!بیوفائی نہ کرنا۔۔خبردار۔۔!اپنے آپ کو میری طرح پختون ثابت کرنا“۔

روحانی تلقین کا اثر:۔

اور یہ اس روحانی تلقین کا اثر تھا۔کہ اسی وقت میرے حوصلے اور ہمت میں تازگی آ گئی۔چنانچہ سیدھا کھڑا ہوگیا اور اب میں نے کوتوال بابا کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔اور کچھ ایسے نو ایجاد اور غلیظ قسم کے الفاظ کے ”تحفے“ اس کی طرف بھیجے۔جو وزن اور مزے میں گالیوں سے کم نہ تھے۔بارے کوتوال بابا کا تصور معدوم ہوگیا۔ساتھ ہی مجھ سے اذیت ناک تکلیف بھی دور ہوگئی۔اور میں مکمل طور پر ہوش میں بھی آ گیا۔خداوند عالم کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس امتحان میں ثابت قدم رکھا۔

سالک کا برزخ حادثات کا محل ہوتا ہے:۔

ملحوظ خاطر رہے کہ سالک کا برزخ حادثات کا محل ہوتا ہے۔یعنی جس وقت اس کا برزخ بن جائے۔تو اس پر حوادثات اور آفات کے علاوہ آفاقی واردات کے پرتو بھی پڑتے رہتے ہیں۔اور برزخ بن جانے کے بعد سالک کسی صورت میں بھی تندرست وتوانا یا بہ الفاظ دیگر اپنی فطری طبیعت پر نہیں رہ سکتا۔کیونکہ اس وقت اس کی اپنی ہستی من حیث المجموعی ختم ہوئی ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ شاذ ہی اپنی طبیعت کیمطابق کام کرسکتا ہے۔اور یہی وہ دور ہے جس میں تمام شیطانی قوتیں خصوصی طور پر اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔اس لئے کہ سالک کا وجود ایک ایسے مقناطیس کی طرح کشش رکھتا ہے۔جس میں کوئی برائی پروان نہیں چڑھ سکتی۔مثال کے طور پر اگر وطن پر کوئی مرض یا کوئی اور حادثہ آنے والا ہو تو اس کا پرتو سب سے پہلے سالک کے برزخ پر پڑتا ہے۔گویا ہر پیش آنے والا واقعہ خارج میں ظہور پذیر ہونے سے قبل سالک پر وارد ہوتا ہے۔اب اگر سالک کامل اور صاحب مقام ہو تو وہ اس واقعہ کو اپنے برزخ میں جذب کرلیتا ہے۔اور سارے وطن کو آنے والی مصیبت سے چھٹکارہ حاصل ہو جاتا ہے۔لیکن اگر اس واقع کا ظہور وطن کے لئے لازمی ہو تو پھر وہ اس کو اپنے برزخ سے خارج کر دیتا ہے۔اور ایسا کرتے ہی فوراً وہ واقعہ یا حادثہ اسی ماحول میں عملی طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔یہ باتیں میرے تجربے میں آچکی ہیں۔اور مجھے ان پر ایسا پختہ یقین جیسے دو اور دو چار ہونے میں کوئی شک نہیں۔

حضور بادشاہ جانؒ کا روشن برزخ:۔

میرے مرشد پاکؒ ایک روشن برزخ کے مالک تھے اور بلند ترین اور ارفع مقام پر فائز تھے۔یہی وجہ ہے کہ عالم ناسوت کی تمام تر شیطانی طاقتیں ان کے مقابل تھیں۔
ہر انسان میں کچھ کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔اور ان کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ بعض انسانوں کی فطرت میں بعض اوصاف یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں۔اور یا اگر ہوں بھی تو دوسرے اوصاف کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں۔تو جب ایسے شخص کو کسی ایسے واقعہ سے سابقہ پڑ جائے جس کا مقابلہ کرنے کیلئے اس کے اندر مطلوبہ اوصاف موجود نہ ہوں۔تو سالک کا تکلیف میں مبتلا ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔اور کوئی شک نہیں کہ ایسے کمزور مقامات ہی نفسانی اور شیطانی طاقتوں کا ہدف آفت ہوتی ہیں۔
اس قسم کے خطرات سے محفوظ اور مامون رہنے کے لئے اول ترین امر اور اہم ترین چیز سالک کا صاحب استقامت ہونا ہے۔پھر وہ حیات دنیاوی ہی میں مرمٹا ہوتا ہے۔اور اس موت کے

بعد اس میں بعض صفات کی کمی سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ اسی قدر ضرور ہوتا ہے۔ کہ کوفت اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مولوی عبداللہ صاحب سے میری گفتگو:۔

تو اجمیر شریف کے علماء خصوصی طور پر مولوی عبداللہ کی رجعت کے بارے میں تذکرہ ہو چکا ہے۔ اور آپ پڑھ آئے ہوں گے کہ میں اکثر اوقات ان کا ہمنشین ہوتا تھا۔ جب کبھی وہ درگاہ شریف میں حاضری دیتے تو شاہجہانی مسجد کے قریب ہی بیٹھتے۔ ایک موقعہ پر اسی جگہ میں نے ان سے دریافت کیا تھا۔ کہ ''مولوی صاحب! یہ بڑا سانحہ ہے۔ کہ آپ نے حضور بادشاہ جانؒ سے جدائی اختیار کی۔ کیونکہ آپ کو تو معلوم ہے کہ اہل اللہ کے ارد گرد ایسے شیاطین ضرور موجود ہوتے ہیں۔ جو خدا کے نیک بندوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتے۔ میرے خیال میں آپ کے لئے لازم تھا۔ کہ صبر و تحمل سے کام لیتے۔ اس لئے کہ میں نے خود حضور بادشاہ جان سے سنا ہے۔ کہ اہل ترین آدمی کا متلاشی ہوں۔ لیکن تا حال ہاتھ نہیں آیا۔ اور یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب ان کی طرف سے امتحانات ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ ایک ایسے موزون شخص کی تلاش میں ہیں جو ہر لحاظ سے اہل ہو''۔ مولوی صاحب نے میری باتیں سن کر جواب دیا کہ ''میں حضور بادشاہ جانؒ کے اس رویہ کی کوئی تاویل نہیں کر سکتا۔ کہ لوگ جو کچھ بھی ان کے گوش گزار کر دیں تو وہ فوراً مان لیتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ ان کے ہم نشین اور یہاں تک کہ ان کے ڈیرے کے منتظمین اور مختار کل سبھی جاہلان مرکب ہیں۔ جو صحیح طور پر مسلمان بھی نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن طرفہ یہ کہ کرتے ہیں۔ پیشین گوئیاں''۔ میں نے مولوی صاحب کو بتایا کہ ''قبلہ! آپ کو ان جاہلان بسیط سے کیا غرض؟ کیونکہ آپ کا مطلب تو صرف حضور بادشاہ جانؒ سے ہے!'' یہ سن کر مولوی صاحب فرمانے لگے۔ کہ ''واقعی آپ نے حق فرمایا اور سچی بات یہ ہے کہ اگر میں ایک سو برس کے بعد بھی حضور (بادشاہ جانؒ) کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو جاؤں تو یقیناً وہ مجھے خوش آمدید کہیں گے۔ اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا یہ خاصہ ہے۔ کہ عفو درگزر سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے جو میرے دل میں بری طرح کھٹکتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میرا دل بادشاہ جانؒ سے اچاٹ ہو گیا ہے۔'' میں نے وہ بات معلوم کرنا چاہی تو مولوی صاحب فرمانے لگے۔ کہ ''بات یہ ہے کہ بادشاہ جانؒ نے مجھے ایک ورد کی اجازت دی تھی اور مجھے جو مشکل کام بھی درپیش ہوتا تو اس ورد کو جمعہ شریف کی رات سے شروع کرتا اور اگلے جمعہ سے قبل ہی وہ کام ہو گیا ہوتا۔ مگر چند دن ہوئے کہ ایک مشکل اور لاینحل مسئلہ کے لئے اسی ورد کو شروع کیا تو نہ ہوا۔ چنانچہ میں نے حضور خواجہ غریب النوازؒ سے درخواست کی۔ رات کو خواب میں بادشاہ جانؒ کو دیکھا۔ فرما رہے

تھے۔ کہ ''عبداللہ! ورد میں نے دیا تھا کہ بابا صاحبؒ نے؟ خواہ تم جو کچھ بھی کرو کام نہیں ہونے کا اب امیر حمزہ آپ انصاف کریں۔ کہ یہ ظلم عظیم نہیں تو اور کیا ہے؟'' یہ سن کر مجھے بے تحاشا ہنسی آ گئی۔ اور اسی اثناء میں کوہاٹ بادشاہ بھی آ کر شامل مجلس ہو گئے۔

پنکھے والا ملنگ اور بوڑھی عورت کا سجدہ:۔

اس سے قبل ایک قوی ہیکل پختون ملنگ بھی ہمارے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ وارثی چشتیوں کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اور باقی ڈیل ڈول سے خاصہ خواجہ خضر معلوم ہوتا تھا۔ سفید لمبی داڑھی تھی۔ سر کے بال کندھوں پر آویزاں تھے۔ اور قدبت سے بلند و بالا تھا۔ ثقہ خوب تھا۔ لوگ اس کو پنکھے والا'' کہا کرتے تھے وجہ یہ تھی کہ گرمیوں میں ہر وقت اس کے ہاتھ میں پنکھا ہوا کرتا تھا۔ خیر تو اسی وقت ایک بوڑھی عورت آ گئی۔ اور پنکھے والے کو سجدہ کر دیا۔ مولوی عبداللہ صاحب نے یہ دیکھا تو غصہ ہو گئے۔ اور پنکھے والے پر برس پڑے۔ کہا کہ ''تم نے بوڑھی کو اس حرکت سے باز کیوں نہ رکھا؟'' کوہاٹ بادشاہ نے ہنستے ہوئے مولوی صاحب سے کہا۔ کہ'' کیوں مولوی صاحب! فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا تھا؟'' مولوی صاحب نے جواب دیا کہ ''ہاں! مگر بعثت رسول کریم ﷺ کے بعد اس قسم کے سارے احکام منسوخ ہو چکے ہیں'' کوہاٹ بادشاہ نے دوبارہ کہا کہ ''تب تو اس میں کوئی حرج نہیں''۔ تاہم میں نے مداخلت کرتے ہوئے بات کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔ اور اسی طرح یہ معارضہ ختم ہو گیا۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند:۔

جہاں تک میرا اپنا خیال ہے تو یہ ضرور ان علماء حضرات کی بدنصیبی تھی۔ اور وہ اس قابل نہ تھے۔ کہ حقیقت و معرفت کی نعمت عظمٰے سے مستفید ہوتے۔ وہ تو ابتدائی امتحان میں رہ گئے۔ اور اس ناکامی نے ان کو نیچے گرا دیا۔ اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ قاطعوں کے زمرے میں آ گئے (اللہ تعالیٰ ہر سالک کو اس معاملہ سے محفوظ رکھے)۔

جہاں تک امتحان میں ناکامی کا تعلق ہے تو اس سے اور تو کچھ نہیں ہوتا البتہ آگے ترقی رک جاتی ہے۔ لیکن اگر ایک مستقل مزاج شخص پورے عزم اور استقلال سے دوبارہ کوشش شروع کر دے۔ بشرطیکہ راستہ چھوڑ کر بھٹک نہ جائے۔ تو کامیابی یقینی طور پر ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ حضرات جو معمولی سی ناکامی پر کھلے اور واضح راستے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان کی تخلیق ہی اس کام کے لئے نہیں ہوئی ہوتی ہے۔

مہر برلب زدہ خوں میخورم وخاموشم:۔

میرے مرشد پاکؒ کا سلسلہ دیگر سلسلوں کی طرح زور شور سے نہ چلا۔ اوران کا وصال فرمانے کے بعد کچھ نفسا نفسی قسم کا ماحول پیدا ہوگیا۔ جس کا ذکر کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ ویسے بھی میں ان واقعات کو بیان کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔ جن کا تعلق میرے مرشد پاکؒ کی حیات طیبہ سے ہو. یا وہ امور جو اس سے متعلق ہوں۔

حضرت شیخ علی ترمذی قدس سرہٗ کا سلسلہ:۔

بہر کیف اس ضمن میں اس قدر ضرور عرض کروں گا۔ حضرت پیر بابا (شیخ علی ترمذی قدس سرہٗ) کے سلسلے سے بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ اور جب انہوں نے وصال فرمایا۔ تو سلسلے کی ابتری کا سبب اخوند درویزہ ثابت ہوئے۔ بات یہ تھی کہ جس وقت ملازنگی نے اخوند درویزہ (جو ان کے شاگرد تھے) کو حضرت پیر بابا قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں پیش کیا۔ تو ساتھ ہی یہ سفارش بھی کر دی۔ کہ "براہ کرم اس کو اپنا مرید بنالیں دو وجوہات کی بناء پر۔ اولاً یہ کہ اخوند درویزہ ملا ہے اور ثانیاً یہ کہ اس کام کا شوق بھی رکھتا ہے۔ ملازنگی نے یہ گزارش بھی کی تھی۔ کہ "ویسے تو میرے شاگردوں میں اخوند درویزہ سب سے زیادہ لائق ہے۔ لیکن اس میں ایک نقص بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ پیشن گوئیاں کرتا رہتا ہے۔" اس آخری جملے کو سماعت فرما کر حضرت پیر بابا قدس سرہٗ کے چہرہ مبارک سے ناراضگی کا اظہار ہونے لگا۔ اور ارشاد فرمایا۔ کہ "میں ایسے شخص کو بیعت نہیں کرتا جو پیشن گوئیاں کر کے اپنے آپ کو عالم الغیب ثابت کرتا پھرے۔ لہذا اس ملا صاحب کو قسمت آزمائی کے لئے کہیں اور چلا جانا چاہیئے"۔ تھوڑا سا وقفہ گزارنے کے بعد پیر بابا قدس سرہٗ متبسم ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ "ہاں! کیوں نہ ہو. پختون لوگ ایسے پیر کو کب مانیں گے۔ جب تک کہ وہ پیش گوئیاں نہ کرے۔ ملازنگی دوبارہ عرض پرواز ہوا۔ کہ "حضرت! ملا درویزہ سے میں وعدہ لیتا ہوں کہ وہ آئندہ ایسا نہ کرے گا"۔ حضرت پیر بابا قدس سرہٗ نے یہ سماعت فرما کر ارشاد فرمایا۔ کہ "البتہ اس شرط پر میں اسے بیعت کرلوں گا"۔

غرضیکہ اس کے بعد بیعت کی اجازت مرحمت ہوئی۔ مگر اخوند درویزہ نے نہ صرف یہ کہ بدستور پیش گوئیاں کرتے رہے بلکہ ستم بالائے ستم یہ کہ بات بات پر اپنے مرشد کو ٹوکتے اور تو اور حضرت پیر بابا قدس سرہٗ کے سامنے تین خلفائے راشدہؓ کی تعریف کچھ اس پیرائے میں کرتے جس سے واضح طور پر امام الائمہ حضرت شیر خدا علی علیہ السلام کی توہین اور تحقیر ثابت ہوتی۔ حضرت پیر بابا قدس سرہٗ کو اخوند درویزہ کے اس فعل سے کوفت ہوتی۔ باوجود یہ کہ وہ سنی الحنفی عقیدہ رکھتے تھے۔ اور اگرچہ

سنی عقیدہ کے رو سے حضرت شیر خدا علیہ السلام کا چوتھا درجہ تسلیم شدہ ہے۔ لیکن اخوند درویزہ نے ایسا رویہ اختیار کیا تھا کہ اپنی تقریروں میں حضرت علی اسد اللہ علیہ السلام کو چوتھے درجے سے بھی گرا کر اور بھی کم ثابت کرتے۔ اس لحاظ سے گویا وہ ناصبین کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ بہر حال اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت پیر بابا قدس سرہٗ نے ان کی تکمیل سے دامن تہی فرمالیا۔ اس طرح اخوند درویزہ حد تکمیل تک نہ پہنچ سکے۔ اور ان کے بعد سارا سلسلہ ختم ہو گیا۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب:۔

اب ایک وسواسی آدمی یہ شبہ کر سکتا ہے کہ اتنے بلند اور عظیم الشان مرتبے اور بڑی شخصیت رکھنے کے باوجود حضرت پیر بابا قدس سرہٗ نے محض اخوند درویزہ کی خاطر اپنا سلسلہ کیوں پریشان کر دیا؟ کیونکہ وہ اخوند درویزہ کو ہٹا کر دوسرے علماء کو بھی ان کا قائم مقام بنا سکتے تھے۔ لیکن اس قسم کا اعتراض صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو اولیاء اللہ کے مسلک اور اخلاق سے کلی طور پر بے خبر ہوں۔ بلکہ میں تو کہوں گا۔ کہ ایسے اصحاب اخلاق نبوی ﷺ سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ رسالت پناہ ﷺ تو منافقین کے ساتھ بھی مسلمانوں کی طرح سلوک فرماتے اور کسی کو بھی اپنے ماحول سے نہ ہٹاتے نہ دھتکارتے۔

حضور فخر العلماء الاولیاءؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ "اگر کوئی آجائے تو مجھے خوشی نہیں ہوتی۔ اور اگر کوئی چلا جائے تو مجھے رنج نہیں ہوتا۔ تعلق باللہ کی ضرورت ہے اور اگر کسی کا کچھ نصیبا ہوگا۔ تو لیکر چلا جائیگا ورنہ مجبوری ہے"۔

للہ فی اللہ تعلق رکھنے کی تاکید:۔

فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ نے وصال فرمانے سے تین ماہ پہلے مجھے مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا تھا کہ۔" دیکھو یاد رکھو۔ جس کسی سے تعلق رکھو یا لین دین کرو تو یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ کے لئے کرنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ کوئی شخص بھی تم سے خفہ ہو کر نہ جائے گا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھو۔ کہ اگر تم نے اپنی نفس کی خواہش سے کچھ کیا تو آگاہ رہو۔ کہ کوئی بھی شخص تم سے خوش ہو کر نہ جائے گا"۔

مراجعت وطن:۔

ابتدائی طور پر جب حضور بادشاہ جانؒ اپنے گھر سے نکلے تو مخاصمت رکھنے والے چچیرے بھائیوں نے ان کے برادر خوردؒ اور ہمشیرگان کے خلاف ظلم کیشی اختیار کی۔ انہوں نے

حضور بادشاہ جانؒ کی ایک بڑی جائیداد پر قبضہ جمالیا۔ مگر جب حضور بادشاہ جانؒ نے بیعت اور ارشاد کا سلسلہ شروع فرمایا۔ تو ان کے ماموں سید غلام حیدر شاہ صاحب ان کے پاس تشریف لے آئے۔ اور یہ مشورہ دے دیا۔ کہ وطن آ کر اپنی جائیداد کا فیصلہ کر لیں۔ اس واقعہ کے تھوڑے دنوں کے بعد حضور بادشاہ جانؒ اپنے وطن تشریف لے گئے۔

زرین خان کو طلب فرمایا:۔

چند دنوں کے بعد اپنے ایک مرید زرین خان (مرحوم) کے نام ایک خط ارسال فرمایا۔ جس میں ان کو اگر ور آنے کے علاوہ ایک عد پستول لانے کا بھی تحریر فرمایا گیا تھا۔ وجہ یہ بھی کہ وہاں حضور بادشاہ جانؒ کو خاصی مخاصمت سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ زرین خان نے حضور بادشاہ جانؒ کے ایک اور مرید جان ولی (مرحوم) اور بموجب ارشاد ایک پستول ہمراہ لے کر اگر ور چلے گئے۔

زرین خان کا کہنا ہے کہ ''اگر ور پہنچ کر ہمیں حضور بادشاہ جانؒ کی جلالت شان کا پورا پتہ لگ گیا۔ کیونکہ حضور بادشاہ جانؒ سے مخاصمت رکھنے والا چچیرا بھائی اکبر سید ان کی موجوگی میں چارپائی پر بھی نہ بیٹھ سکتا تھا۔ مزید برآں حضور بادشاہ جانؒ نے اکبر سید سے خطاب فرمایا کہ۔

''اکبر سید! میری موت تمہارے ہاتھ سے ہرگز واقع نہ ہوگی۔ اور اگر اس بات کا تمہیں یقین نہ آتا ہو۔ تو اٹھا بندوق۔ اور کر لو آزمائش۔ ! میں یہاں محض اس لئے آیا ہوں کہ تمہیں اس ظلم ایجادی سے روک لوں۔ جو تمہاری عاقبت کے لئے مضر ہے۔ تم ذرا سوچ لو۔ کہ میری غیر موجودگی میں تم نے میرے بھائی بہنوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے؟ باقی رہی جائیداد! تو وہ میں گٹھڑی میں باندھ کر اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا۔ بلکہ اس سے اپنی بہنوں کا شرعی حصہ الگ کر کے ان کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ اور مابقایا کو کسی کی نگرانی میں دے دوں گا۔ اس کے علاوہ اگر تمہارے دل میں کچھ ایسا ویسا خیال ہو تو وہ اپنے دل سے نکال دینا۔ کیونکہ میری زندگی میں تم اپنے کسی ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتے''۔

پانچواں مذہب:۔

زرین خان کہا کرتے تھے۔ کہ ''اکبر سید حضور بادشاہ جانؒ سے اس قدر مرعوب ہو گیا تھا کہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا۔ خیر۔۔ بعد میں جب کسی موقعہ پر میں نے ہنسی ہنسی میں حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور! آپ کا رعب اور دبدبہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی مگر اس کے باوجود پستول منگوانے کی کیا ضرورت تھی۔ تو ارشاد فرمایا کہ:۔

''یہاں پر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو چاروں مذاہب میں تو کسی ایک کو بھی خاطر میں نہیں لاتے لیکن پانچویں مذہب کو تسلیم کر لیتے ہیں۔''
(یاد رہے کہ پختون معاشرے میں اصطلاحی طور پر اسلحہ کے استعمال کو ''پانچویں مذہب'' کہا جاتا ہے)۔

احکام شرعی کی بجا آوری:۔

بعد ازیں حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی ہمشیرگان متحرمات کو ان کا شرعی حصہ دے دیا۔اور اپنی چھوٹی ہمشیرہ محترمہ اپنے ماموں زاد بھائی محترم عثمان سید سے بیاہ دی (محترم عثمان سید قبلہ سید غلام حیدر شاہ صاحب کے فرزند ہیں) رہی جائیداد تو وہ اپنے ماموں صاحب قبلہ کی نگرانی میں دے دی۔

حضور بادشاہ جانؒ کے برادر خورد کی حسرت ناک شہادت:۔

حضور بادشاہ جانؒ کے برادر خورد کو اسی مخاصمت رکھنے والے عنصر نے زہر کھلا دیا تھا اور وہ اس واقعہ سے قبل ہی شہادت پا چکے تھے۔

وطن کو آخری سلام:۔

ان امور کو سلجھانے کے بعد حضور بادشاہ جانؒ واپس پشاور تشریف لے آئے۔اور اس کے بعد تا حیات ایک دو بار کے علاوہ اپنے وطن تشریف نہ لے گئے۔

ہمشیرہ کی والہانہ محبت:۔

وطن میں ان کی ہمشیرہ محترمہ اپنے عزیز بھائی کو بہت بہت یاد فرماتیں وہ اس قدر روتیں کہ کثرت گریہ سے نگاہ بھی کمزور ہوگئی۔اور اگر پشاور سے کوئی فرد وہاں چلا جاتا۔تو یہ بی بی اس سے اپنے بھائی کی خیریت اور حال معلوم فرماتیں۔وہ اپنے نامور بھائی کی شہرت اور عزت کا سن کر خوش ہوتیں۔لیکن اس کے باوصف بھائی کی جدائی تڑپا دیتی۔اور وفور جذبات سے آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے۔

سب ترک:۔

الغرض۔۔جائیداد کو چھوڑ دینا۔ خویش و اقارب سے مستقل مفارقت اور اپنے وطن مالوف کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا وعلی ہذا القیاس سب ایسے امور ہیں جن کو مرشد پاکؒ نے ایک کبیر الشان مجاہد اور غیور مسلمان کی طرح پوری ہمت اور مردانگی سے برداشت کرلیا۔اور یہ ان کے آہنی عزم واستقلال کی ایک ادنےٰ جھلک ہے۔

عظیم الشان استقلال کا مظاہرہ:۔

دراصل مرشد پاکؒ کی بے پناہ استقامت کا عالم ہی اور تھا۔اور حق تو یہ ہے کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان کے سامنے نہ ٹھہر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ بھی دیکھ لیا۔ کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام کا مضبوط پنجہ بھی حضور بادشاہ جانؒ کے بے قیاس اطمینان اور بے انتہا استقامت میں کوئی تغیر نہ لا سکا۔

وصال فرمانے کی رات سے قبل دن کے وقت ساری نمازیں باقاعدہ طور پر کھڑے ہوکر ادا فرمائیں نماز عشاء کے وقت جب کسی نے عرض کیا کہ ''حضور! آپ کی بدنی نقاہت بہت بڑھ گئی ہے اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ بیٹھ کر نماز ادا فرمالیں''۔مرشد پاک نے اس مشورہ کو قبول نہ فرمایا۔ چنانچہ کھڑے ہو گئے۔اور نیت باندھ کر نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔

سکرات کی ابتداء:۔

اگرچہ سکرات کی حالت نماز ظہر کے وقت سے شروع ہو گئی تھی۔لیکن حضور بادشاہ جانؒ کی مثالی استقامت میں کوئی فرق نہ آنا تھا نہ آیا۔ بہر حال عشاء کی نماز کھڑے ہو کر ادا فرما رہے تھے۔اور دیکھنے والے دیکھ رہے تھے۔کہ مرشد پاکؒ کی ٹانگوں میں لرزہ محسوس ہو رہا ہے۔

معمول میں فرق نہ آنے دیا:۔

اور پھر وہ سماں ہی اور تھا۔ جب کھانا کھایا گیا۔تو تمام حاضرین مجلس مجسم سوالیہ نشان بن گئے۔وجہ یہ تھی کہ عادت مبارک تھی کہ طعام تناول فرمانے کے بعد سماع سماعت فرماتے (البتہ بارہ وفات کے بارہ دن اور محرم الحرام کے ابتدائی دنوں میں ساز نہ ہوتا تھا) چنانچہ اسی رات کو بھی حالات کے پیش نظر حضور بادشاہ جانؒ کے مرید نہ چاہتے تھے کہ ساز لے آئیں۔کیونکہ ہر ایک صاف طور پر سمجھ سکتا تھا۔کہ مرشد پاکؒ سکرات میں مبتلا ہیں۔ادھر معمول مبارک کا بھی خیال تھا۔

اس لئے سب حیران تھے۔ کہ یکایک۔ خود حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"دلاور کو کہا جائے کہ اپنا کام شروع کر دے"

اور اس کے بعد رستم خان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

"ایک آخری پانی تو دینا"

اس ارشاد عالی کو سنتے ہی۔ ساز اور سازندے حاضر ہو گئے۔ کوئی نصف گھنٹے کے اندر اندر رفیق قوال نے دو تین نعتیں سنا دیں۔ اور اس کے بعد حضور بادشاہ جانؒ نے سب اہل مجلس کو آرام کرنے کی ہدایت فرما دی۔

حضور بادشاہ جانؒ اپنے پلنگ میں پڑے تھے۔ مگر ہمہ تن ذکر میں مصروف تھے۔ اور جوں جوں سکرات میں شدت آتی رہی۔ توں توں مرشد پاکؒ کے ذکر میں بھی جوش اور خروش آتا رہا۔

آخری ارشاد:۔

بالآخر خادم رفیق سے بھی ارشاد فرمایا کہ:۔

"اب چادر میرے اوپر ڈال دو۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں اور تم بھی جا کر سو جاؤ"۔

رفیق خادم نے حسب الارشاد چادر ڈال دی۔ اور ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ اس کے دل میں خدشہ تھا۔ خیر تو جب کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی حضور بادشاہ جانؒ نے کوئی حرکت نہ فرمائی تو وہ حضور بادشاہ جانؒ کے پلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر کھڑا رہا۔ لیکن پھر بھی حضور بادشاہ جانؒ کی جسمانی حرکت محسوس نہ کی۔

زرین خان کو اطلاع دی:۔

چنانچہ وہ خاموشی کے ساتھ بھاگ کر بڑے خادم زرین خان کے پاس چلا گیا۔

اور انہیں اطلاع دی۔ کہ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ...... حضور بادشاہ جانؒ جان بحق تسلیم ہو گئے ہوں۔ ذرا آپ خود جا کر دیکھ لیں"۔

زرین خان نے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ حضور بادشاہ جانؒ پر ہمیشہ کے لئے ایسی تکلیف آتی رہتی ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد حالت معمول پر آ جاتی ہے۔ اور حضور بادشاہ جانؒ کی حالت تو بڑی اچھی ہے۔ وہ آرام فرما رہے ہیں"۔

(حضورؒ!):۔

زرین خان کی یقین دہانی کے باوجود بھی خادم کو خلش رہی۔ چنانچہ وہ دوبارہ گیا اور

اطمینان کے ساتھ حضور بادشاہ جانؒ کو دیکھا۔ بارے حضور بادشاہ جانؒ کا طائر روح ناسوتی جسم سے روحِ کُل کی طرف پرواز کر گیا تھا۔ یہ سانحہ دیکھ کر خادم دوبارہ زرین خان کے پاس چلا گیا۔ اور انہیں اطلاع دی۔ خادم کا کہنا ہے کہ تب ہم حضور بادشاہ جانؒ کا پلنگ کمرے کے اندر لے گئے اور بعدازیں لوگوں کو اس حادثہ جانکاہ کی خبر دی۔

ایک اور مرید کا بیان:۔

حضور بادشاہ جانؒ کے ایک اور مرید عبدالحنان شنواری کا کہنا ہے۔ کہ میں سو رہا تھا کہ اتنے میں نیچے بازار کی طرف سے میرے ڈیرے میں ایک اینٹ پھینک دی گئی۔ نیند سے بیدار ہوا۔ باہر نکلا تو روح بلا دینے والی یہ خبر سن لی۔ اور سنتے ہی حضور بادشاہ جانؒ کے بالا خانے چلا گیا۔ حضور کی زیارت کی تو دیکھا ان کے بال شیر ببر کی مانند کھڑے تھے اور رخ انور پر کچھ ایسا جلال دکھائی دے رہا تھا جیسے حضور بادشاہ جانؒ کی عزوشان کے سامنے حضرت عزرائیل علیہ السلام کی جلالت ہیچ ثابت ہوئی ہو۔

شاہ ولایتؑ کی صلبی وروحانی ذریت اور آفات:۔

میں کہتا ہوں کہ یعسوب المومنین امام آلائمہ حضرت علی المرتضیٰ مشکل کشا کے فرزندان صلبی خصوصی طور پر۔ اور اسد اللہ الغالبؑ کی روحانی اولاد عمومی طور پر ہر خوف وخطر سے آزاد ہوتے ہیں۔ ہر آفت ان کی استقامت سے پناہ مانگتی ہے۔ ان لوگوں کے سامنے موت کے ہونٹوں پر بھی کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حین حیات میں انہوں نے موت کا مزہ چکھا ہوتا ہے۔ البتہ جسم ظاہری کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ یہی حال حضور بادشاہ جانؒ کا تھا۔ انہوں نے جسم ظاہری کو چھوڑ دیا۔

پو پھٹتے ہی سینکڑوں مرد وزن حضور بادشاہ جانؒ کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے آ جمع ہوئے۔ اور اگر ان سب کو پہلے سے یہ اطلاع نہ دی گئی ہوتی۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ پردہ فرما گئے ہیں۔ تو ان کو یہ باور کرنے میں تامل ہوتا۔ کہ گویا واقعی حضور بادشاہ جانؒ کو دیکھ لینے کے بعد قطعاً یہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے میٹھی نیند سو رہے ہوں۔ ان کے چہرۂ اقدس پر مکمل اطمینان کے آثار اور گالوں میں ویسی ہی سرخی جھلک رہی تھی۔ جیسے وہ حیات میں ہوتے تھے۔

تاریخ وصال:۔

حضور بادشاہ جانؒ نے ۲۱ ذی القعد ۱۳۷۳ھ اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے فرمائی۔
میں نے ایک مرثیہ میں تاریخ وفات کہی تھی۔ ماہ تاریخ اس مصرع سے نکلتا ہے۔

دفخر علم شوبام

۱۳ ھ ۷۳

باب ۵

مقامات

مرتبۂ احدیت ذات :۔

حق سبحانہٗ وتعالیٰ مرتبہ احدیت میں ہر قسم کے تعین وادراک سے منزہ ومبرا ہے۔ مرتبہ احدیت ایک ایسا مقام ہے۔ جس کو نہ مرتبہ....... کہا جاسکتا ہے۔ اور نہ مقام۔ اور باقی مقامات بھی محض افہام وتفہیم کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ بہرحال احدیت وہ مرتبہ ہے جس کا تصور فرمالینے سے اشرف الناس الانبیاء مظہر اتم واکمل صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ۔(**ماعرفنک حق معرفتک۔ ماعبدنک حق معرفتک**)
وجہ یہ ہے کہ جب تک معرفت حاصل نہ ہو تو کس کی عبادت کی جائے گی؟ اس مقام میں انسان کی معرفت جہل کے مترادف ہے۔ اس کی ثنا گوئی غیر ثنا گوئی اور اس کا ادراک ماسویٰ کا ادراک ہو جاتا ہے۔ اس مقام میں احد اپنی احدیت کو بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ اور ہم اس مقام کو اس لئے مقامِ احدیت کہتے ہیں کہ یہ مقام دوئی سے یکسر خالی ہے۔ وہاں احد اور احدیت ہر دو ایک ہیں۔ احدیت صرف ہمارے تصور کا چراغ روشن کرتی ہے۔ اور ہم کو اس ادراک کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

لیکن ہمیں اس وقت حیرت ہوتی ہے جب ہم حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی تحریرات میں یہ عبارت دیکھ لیتے ہیں۔ کہ ''میں نے حق کے کنہہ کا ادراک کرلیا ہے۔'' اور یہاں پر حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول نقل فرماتے ہیں۔ کہ انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ ''جہاں تک **ماعبدنک حق عبادتک** ۔ تو شک نہیں کہ میں نے اس کی عبادت کا حق پورا نہیں کیا۔ لیکن جہاں تک **ماعرفتک حق معرفتک** کا سوال ہے تو میں نے اس کی معرفت کا حق پورا کردیا ہے۔''
اب اگر ان دونوں بزرگوں کے یہ اقوال سکر کی طرف منسوب نہ کئے جائیں تو کہنا پڑے گا۔ کہ دونوں نے بڑی سخت غلطی اور بے جا تعلّی کی ہے۔ بلکہ انہوں نے تو اپنے حوصلہ اور ظرف کو رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بالاتر دکھانے کی کوشش کی ہے۔

مرتبہ وحدت :۔

دوسرا مرتبہ وحدت کا ہے۔ اور اسی مرتبہ سے ذات احدیت کے تعین کی ابتداء ہوتی ہے ۔ جو صفت بھی رکھتی ہے۔ اس مقام میں صرف ذات واحد ہی متصور ہے۔ وہ واحد ذات متصف با

لصفت ہے۔ اسی مرتبہ کو عقل کل، نفس کلیہ اور نور محمدی ﷺ بھی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے تیسرے مرتبہ کی ابتداء ہوتی ہے۔ مرتبہ وحدت کو ہم رسالت کے مرتبہ سے منسوب کرتے ہیں۔

مرتبہ واحدیت یا روح اعظم اور اس کی نیرنگیاں :۔

تیسرے مرتبہ کو واحدیت کہتے ہیں۔ اسی مقام میں صفات الٰہیہ عزوجل آپس میں متحد ہوجاتے ہیں۔ اور کارخانہ ہستی کے کل پرزے کام شروع کردیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کو ہم امامت، ولایت اور خلافت کے مقامات سے یاد کرتے ہیں۔ جہاں تک اس مرتبے کا تعلق ہے۔ تو درحقیقت یہی مرتبہ کثرت کا سرچشمہ ہے۔ اور یہی واحدیت یا روح اعظم ہی ہے۔ جو مختلف اشیاء کے مراتب میں ظہور کرتی ہے۔ اور حقیقت صرف ایک ہی ہے۔ لیکن اس کے مظاہرے سارے شیون ہیں۔ **و کل یوم ھو فی شان** (ہر روز اس کو ایک دھندا ہے)۔ یہی روح اعظم ہے۔ جس کی لاتعداد کرنیں نت نئی اشیاء وایجادات کے تعارف۔ اور اظہار کا سبب بنتی ہے۔ اور اسی روح اعظم کا اولین پرتو عالم امر کا ظہور ہے۔ ملحدین و مادئین اس مرتبہ کو مادے کی لطیف حالت سے موسوم کرتے ہیں۔ مگر آج کل کی ایٹمی تحقیق کے رو سے اسی کو انرجی یا محض طاقت اور توانائی فہم کیا گیا ہے۔ اور جس طرح صوفیائے اسلام رحمہم اللہ مادے کو لاشئی کہتے تھے۔ بالکل اسی طرح زمانہ حال کے سائنس دان بھی مادہ کو لاشئے سمجھنے لگے ہیں۔ گویا اب یہ بات ان کے علم میں آ گئی۔ کہ جس چیز کو ہم مادہ کہتے ہیں۔ وہ ماسوائے "شعور" کے اور کچھ بھی نہیں۔
دراصل یہ تمام اشیاء صفات کے آپس میں متحد ہونے سے ظاہر ہوگئے ہیں۔ اور جس وقت یہ صفات منفصل ہوجاتے ہیں۔ شئے کا وجود نہیں رہتا۔ یاد رہے کہ صفات کا مسلسل اتحاد ہی نئی نئی چیزوں کو ظہور میں لاتا ہے۔ اور جس قدر بھی زمانہ گزرتا جاتا ہے۔ اشیاء کثافت سے لطافت کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم صرف دودھ ہی کا تجزیہ کرلیں۔ تو ہمیں معلوم ہوجائے گا۔ کہ اس میں گھی، مکھن، پنیر، دہی اور لسی وغیرہ اقسام وانواع کے اجزاء موجود ہیں۔ پھر جب انفرادی طور پر ہر جزو کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تو صرف اسی ایک جزو میں کئی دوسری چیزیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ اور آخر کار یہ کثافت لطافت تک پہنچ جاتی ہے۔ اور صفات کے انفصال کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔

اگر ہم ایک پتھر کی تعریف کرنا چاہیں تو یہی کہیں گے۔ کہ جو چیز خاکی رنگ، ثقل، ٹھوس پن اور ایک خاص شکل رکھتی ہو۔ اسے پتھر کہتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب صفات ہیں۔ بجائے خود پتھر کی اپنی مستقل کوئی ذات نہیں۔ اور نہ ہی مذکورہ صفات کے انفصال کے بعد پتھر کا وجود باقی رہ سکتا

ہے۔
یہی تھا وہ تصور۔ جس نے دنیا کے بڑے بڑے دانشوروں کو مختلف قسم کے عقائد کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں سے کسی نے کچھ عقیدہ قائم کرلیا۔ اور کسی نے کچھ! کسی نے کہہ دیا کہ عالم اور اشیائے عالم کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ بلکہ یہ سارا گورکھ دھندا وہم وخیال کی اختراع ہے۔ کیونکہ اشیاء کا وجود خود انائے انسانی کے اپنے اعتبار سے عبارت ہے۔ اس لئے کہ اگر انسانی انا کسی شئے کے وجود کو تسلیم نہ کرے۔ تو وہ نہ ہوگا۔ اسی طرح دوسرے طبقے کا کہنا تھا۔ کہ ذاتی طور پر اشیاء میں کوئی تاثیر نہیں ہے۔ البتہ ان کو استعمال میں لاتے وقت حق سبحانہٗ وتعالیٰ ان کے اندر تاثیر پیدا فرما دیتا ہے۔ کوئی تناسخ کے چکر میں پھنس گیا۔ کسی نے مادہ ہی کو سب کچھ جان لیا۔ اور خالق حقیقی کے وجود برحق سے انکار کر دیا۔ دراصل یہ تمام نظریات اور تصورات ایسے لوگوں کے لئے مقامات کا درجہ رکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا تصور اور ان کی عقل ان مقامات سے آگے نہ جا سکی۔

عین انسانی:۔

وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کا ایک ''عین'' ہوتا ہے۔ اور وہ اسی ''عین'' کے منشاء کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ نیز وہ انسان اپنے ''عین'' کے دائرہ سے ہرگز باہر نہیں نکل سکتا۔ لیکن یہاں پر ایک بات یہ بھی ہے۔ کہ جس انسان کا ''عین'' اس سے مختلف ہو۔ تو وہ یقیناً اس مقام سے نکل سکتا ہے اور آگے چل کر جان لیتا ہے کہ اس کا پچھلا تصور محدود تھا۔ مثال کے طور پر امام اشعریؒ ہی کو لے لیجئے۔ جو ابتداء میں اشیاء کی تاثیر کے منکر تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اپنے اسی نظریہ کی تردید کر دی۔ ظاہری طور پر اس کا مطلب یہی ہوا۔ کہ پہلے مقام میں امام اشعریؒ کی منزل ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ اور تا حال وہ اپنے ''عین'' کے منشاء تک نہ پہنچ پائے تھے۔ بلکہ راستہ طے کر رہے تھے کہ اسی دوران میں انہیں کچھ وقفہ کے لئے اضافات کے تقابل کی وجہ سے اپنے ''عین'' کے خلاف چلنا پڑا۔ لیکن بالآخر انہیں مجبور ہونا پڑا۔ کہ اپنے ''عین'' کی منشاء کے مطابق منزل طے کریں۔ اب رہے وہ لوگ جو ہمیشہ کے لئے ایک ہی منزل میں رہ گئے ہوں۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے آگے ان کی منزل تھی ہی نہیں اور ختم تھی۔ اس لئے وہ آگے نہ چل سکتے تھے نہ گئے۔ اور یہی ان کے ''اعیان'' کا منشاء بھی تھا۔

حال ومقام میں فرق:۔

حال ومقام میں فرق معلوم ومشہور ہے۔ بہر دستور جب سالک کی منزل جاری نہ رہے یا اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس کی منزل ختم ہو جاتی ہے۔ تو یہیؔ مقام ہے۔ مگر جب تک منزل ختم نہ ہو تو اس دوران میں مقام بھی حال ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ وہ مقام چند دنوں یا چند برسوں ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مستقل مقام تو ممکن ہی نہیں۔ اس لئے کہ بعد از مرگ بھی منزل جاری رہتی ہے۔ تا آنکہ جزوی روح روح اعظم تک نہ پہنچ پائے۔ تو مستقل قرار اور مکمل سکون کا حاصل ہونا امر محال ہے۔

البتہ اس قدر ضرور ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے ایک خاص ''حال'' میں قیام اور اطمینان بھی ''مقام'' کو ثابت کرتا ہے۔ اور بلاشبہ جب تک یہ مقام رہے تلون اور اضطراب مفقود ہو جاتا ہے۔ لیکن جس وقت سالک کو اس ''مقام'' کی پوری پوری معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ تو ساتھ ہی آگے جانے کی امنگ بھی ابھر آتی ہے۔ اور لامحالہ سالک آگے چل پڑتا ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر گویا سالک کا پچھلا مقام حال کہلایا جائے گا۔ اور جس طرح ایک حال دوسرے حال کے درود کے لئے بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ایک مقام بھی دوسرے مقام کے لئے ایک زینہ ثابت ہوتا ہے۔ جب تک ایک سالک اوتاد نہ ہو جائے ابدال نہیں بن سکتا۔ اور یہی حال سارے مقامات کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقام ناسوت میں انسان کی عقلی اور مثالی حواس مادی حواس کے پنجہ میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور مادی حواس بالطبع سرکشی اور برائی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ابتدائی طور پر انسانی کشتی کا ناخدا یہی حیوانیت ہی ہوتی ہے۔ مگر حیوانیت سے یہ توقع رکھنا بھی فضول ہوتا ہے۔ کہ وہ اس کشتی کو انسانیت کے گھاٹ اتار دے گی۔

جوئے شیر لانا:۔

اس لئے ایسے حالات میں جب تک کوئی ناخدا موجود نہ ہو جس کی حیوانیت بہر انداز مغلوب اور اس کی انسانیت بہر طور غالب نہ ہو تو بات نہیں بننے کی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اول تو ایسے رہبر کامل کا ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ ایک تو اس کو صحیح طور پر پہچاننا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ اور دوسرے اگر پہچان بھی لیا جائے تو اس کی مکمل رفاقت اس سے بھی زیادہ دشوار ترین کام ہوتا ہے۔

سالک کی ذاتی استعداد اور اس کی اہمیت :۔

یہاں پر یہ بھی ذہن نشین رہے۔ کہ ابتدائی طور پر سالک کے ہاں سب حیوانیت ہوتی ہے۔ اور حیوانیت کی از حد کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ کسی صورت بھی انسانیت کی بہار میں سانس نہ لے۔ بدیں وجہ سالک کے لئے لازمی ہے۔ کہ اس میں اپنی استعداد بھی موجود ہو۔ نیز اس کی فطرت میں مجاہدہ کرنے کی پوری قوت بھی موجود ہو۔ تو کہیں اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ ناسوت کی بھیانک تاریکیوں سے نکل کر ملکوت کے نورانی اجالوں کی سمت محو پرواز ہو جائے۔

بایں ہمہ اس کے شہپروں میں بھی اتنی قوت ہونی چاہیئے کہ اس کو ان اقسام وانواع کے حادثات اور رنگارنگ دام ہائے فریب سے بھی بخیریت نکال سکیں۔ جو سالک کو راستے میں بندوشوں کے طور پر پیش آتے ہیں۔ نیز یہ بھی بے حد ضروری ہے کہ سالک میں یہ طاقت بھی موجود ہو۔ کہ وہ آئندہ پیش آنے والے ہر قسم کے حادثات اور ابتلاؤں کا بخوبی مقابلہ کر سکتا ہو۔ مزید برآں ان کو شکست بھی دے سکتا ہو۔ جو قدم قدم پر سالک سامنے رکاوٹوں کے طور پر سر اٹھاتے رہتے ہیں۔

اس منزل میں کامیابی کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے فنا کا تقدس مآب مقام! اور یہی **موتوا قبل ان تموتوا** کی تفسیر ہے۔ یعنی فنا کی وہ سرمستی اور کیف آور نشہ آجائے جو وصال یار کے حصول تک کسی چیز سے بھی۔ کسی صورت میں نہ اتر سکے۔ مطلب یہ کہ مقام ناسوت سے نکلنے کے لئے سالک کو اپنی فطری طبیعت میں انقلابی تبدیلی لانا ہوگی۔

مگر یاد رہے کہ یہ انتہائی مشکل کام اور کٹھن مرحلہ ہے۔ ہر چند اگرچہ انسان فطرت کی طاقت پر فتح حاصل کر سکتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ انسان تبھی عام آدمی سے انسانیت کے درجہ تک پہنچتا ہے۔ جبکہ وہ فطرت پر غلبہ حاصل کر لے اور معلوم ہو کہ یہی وہ مقام ہے جہاں دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں کے سر چکرا گئے ہیں۔

مقامات اربعہ :۔

مخفی نہ رہے کہ اس راہ میں ناسوت کے چار مقامات سے سابقہ کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ یعنی (۱) ناسوت کے ناسوت۔ (۲) ناسوت کے ملکوت۔ (۳) ناسوت کے جبروت اور (۴) ناسوت کے لاہوت سے جب ایک سالک گزر جاتا ہے اور ان چاروں مقامات کو طے کر لیتا ہے۔ تو اس کے بعد ملکوت میں داخل ہونے کی نوبت آتی ہے۔ بعد ازاں اسی طرح ملکوت میں بھی ایسے ہی چار مقامات کو طے کرنا پڑتا ہے۔

منازل:۔

اکثراولیاء اللہ اسی ناسوت کے مقام میں رہ گئے ہیں۔قاعدہ یہ ہوتا ہے۔کہ جب تک ان کے برزخ کی زندگی نہ شروع ہوجائے۔آگے منزل کرنے سے رکے ہوتے ہیں۔یہاں پر یہ امر واضح رہے کہ برزخ میں نفس کی طاقت نصف ہوکررہ جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آگے منزل کرنا دشوار نہیں ہوتا۔باقی ناسوت کا مقام فنافی الوجود سے تعلق رکھتا ہے۔اس مقام میں سالک اپنے وجود کی مملکت سے تصرف کا کام لیتا ہے۔اور اسی میں یہ ہمہ وجود منہمک ہوتا ہے۔حیوانیت اور انسانیت باہم گربر سرپیکار ہوتے ہیں۔اور یہ اس لئے کہ نفس امارہ کو سنوار کر لوامہ ملہمہ اور کہیں جا کر مطمعنہ کا خوشنما اور مکمل روپ دینا ہوتا ہے۔اس ضمن میں سالک کو اپنی وجودی مملکت کی جس قدر بھی زیادہ معرفت حاصل ہوگی۔اسی قدر اس کے تصرف میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔اسی طرح ایک سالک کو اپنی وجودی دنیا پر جس قدر تصرف حاصل ہوگا اسی نسبت سے ناسوت کے خارج میں بھی اس کا تصرف زیادہ تر دخل انداز ہوگا۔سالک ہر شئے کی حقیقت اپنے وجود میں تلاش کرتا ہے۔اور ہر وہ چیز جو اسے اپنے وجود سے حاصل ہوجائے۔بعینہٖ وہی چیز خارج میں بھی حاصل کر لیتا ہے۔

فقراء کے مقامات:۔

رہے کاملین فقراء اور ان کے مقامات تو اس بارے میں میرے مرشد پاکؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔''کہ آخری بار جب میں اپنے مرشد حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کی خدمت پاک میں حاضر ہوا تو میں نے ان سے فقراء کے مقامات کے بارے میں استفسار کیا۔جواب میں میرے شیخ حضرت سائیں محمد عظیمؒ نے ارشاد فرمایا کہ غوث قطب اور ابدال وغیرہ بڑے کام کی ہستیاں ہوتی ہیں۔اور یہ سب حق سبحانہ کی فوج کے سپاہی ہوتے ہیں۔ان میں غوث ساری دنیا کا متصرف ہوتا ہے۔لیکن بایں جلالت شان وہ بھی اس مدرسہ کا طالب علم ہوتا ہے اور بلا شبہ اس مدرسے کے ایسے ایسے مدرس بھی ہوتے ہیں جو غوث اور قطب سے بدر جہا بلند ہوتے ہیں۔مگر بڑی حیرت ہوتی ہے۔کہ ایسے دریگانہ اور کامل واکمل ہستیوں سے لوگ قطعاً نابلد اور بے خبر ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ نہ تو ان کے ٹھکانے کا علم نہ ان کی دریافت ممکن! یہاں تک کہ ان کی قبور بھی لوگوں کے خواب وخیال میں نہیں آتیں۔

باقی طریقت میں بڑے درجے اور اعلیٰ مقام کا مالک وہ فقیر ہوتا ہے۔جو اس راہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا ہو۔اور نیز اپنے زمانے کے مطابق عمل کا ایک مکمل ضابطہ اور لائحہ کار لے آئے''۔

حضرت شیخنا سائیں محمد عظیمؒ مجتہد طریقت تھے:۔

اس کے بعد حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی یہ تھا کہ:۔ ''میرے مرشد حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ راہ طریقت کے مجتہد دہر تھے۔ کیونکہ ان کو زمانے کے مطابق ایک بالکل نئے انداز کا لائحہ عمل سپرد کیا گیا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ رسالت پناہ محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اقدس سے لیکر ہمارے دور تک مسلمانان عالم پر ظلمت اور تاریکی کا اتنا شدید ترین دور کبھی نہ آیا تھا۔ مانا کہ الحاد سے کوئی زمانہ بھی خالی نہیں رہا۔ لیکن حق یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں یہ بلا جس تیزی سے پھل پھول رہی ہے پچھلے تیرہ سو برسوں میں یہ حالت کسی دور میں بھی نہیں رہی۔ یہ ایک ایسا دور ہے۔ جس میں الحاد کے مہیب عفریت نے تمام تر مذہبی خیالات اور افکار پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ یہاں کہ مسلمانوں میں بھی اپنا دین رسمی طور پر رہ گیا اور ۔۔ کہیں کہیں ۔۔ تو رسماً بھی دیکھنے میں نہیں آتا. اور تو اور اس دور کے علماء بھی الحاد کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔ باقی رہے فقراء اور سالکین تو وہ بھی یقیناً اس سے متاثر ہیں''۔

جو کوئی ملکوت تک پہنچ جائے:۔

ایک روز میں نے حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں عرض کیا۔ کہ'' ضور! بعض سالک ایسے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ جن کا ظاہری لباس شریعت درست نظر نہیں آتا۔ اور اسی بناء پر علماء کرام ان پر کفر و زندقہ کے ہولناک فتوے صادر کرتے ہیں''۔ میری بات سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''میرے مرشد حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ کہ جو کوئی ملکوت پہنچ گیا۔ لوٹ کر ناسوت کی طرف نہیں آیا''۔

رجعت کا اصول:۔

یہ ارشاد سن کر میں نے دوبارہ عرض کیا۔ کہ ''حضورؒ! تو پھر رجعت کا اصول کہاں رہا؟''

حضور بادشاہ جانؒ نے تبسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کا مطلب یہ تھا۔ کہ جو سالک ناسوت سے نکلتا ہے تو یہ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب اس نے مکمل طور سے ناسوتی طبیعت پر فتح حاصل کر لی ہو۔ اور جونہی وہ اس نعمت سے ظفریاب ہو جاتا ہے۔ تو پھر اس کی ملکیت اس کے وجود کی متصرف ہو جاتی ہے۔ گویا تب اس کے حواس ملکی روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ناسوتی حواس نام کو بھی نہیں رہتے۔

مثلاً ایک درخت کی جڑیں، شاخیں، پتے اور پھل بحیثیت مجموعی درخت کہلاتا ہے۔لیکن ہر گاہ جب اس میں پھل آ جائے۔تو ناممکن ہے کہ یہی پھل واپس لوٹ کر پتہ بن جائے۔اسی طرح پتے کے لئے بھی یہ محال ہے کہ واپس شاخ بن جائے۔

رہی یہ بات کہ رجعت کا اصول کیونکر ہو۔تو سمجھ لینا چاہئے۔کہ جو سالک فنا فی اللہ کے مرتبہ عالیہ سے نوازا جائے۔تو مشیت حق سبحانہ وتعالیٰ کو یہ امر منظور ہوجاتا ہے کہ اس کو اپنی مخلوق کی طرف صحو کی دنیا میں واپس بھیج دے۔اور چونکہ ایسے سالک نے اپنی فطرت پر غلبہ پالیا ہوتا ہے۔تو یہی وجہ ہے کہ وہ عالم ناسوت میں یہاں کی ناسوتی مخلوق سے بھی گزارا کر سکتا ہے۔معاً حق سبحانہ وتعالیٰ سے بھی تعلق استوار رہتا ہے۔اور اسی مقام کو جمع الجمع کہتے ہیں''۔

دور ہی ایسا ہے:۔

الحاد کے بارے میں حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد بالکل بجا ہے اور اس کا اندازہ کم از کم میں تو بخوبی لگا سکتا ہوں۔کیونکہ میں مسلسل پانچ برس اسی کی ظلمت کا شکار رہا ہوں۔اس حالت میں جب کبھی کبھی میں حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں اپنے خیالات وافکار کا اظہار کرتا تو تبسم فرما کر ارشاد فرماتے کہ:۔

''یہ دور ہی کچھ ایسا ہے''۔

تب میں دوبارہ گزارش کرتا کہ ''حضورؒ! اچھی بات یہ ہے کہ میں بڑی سخت ذہنی کوفت میں مبتلا ہوں۔کیونکہ میں اپنے قلب کی گہرائیوں میں الحاد کی آفت کو نہیں پاتا۔لیکن میرے خیالات بری طرح اس طرف مائل ہو گئے ہیں۔سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

زمانے کا ذہن:۔

میری مندرجہ بالا گزارش کو سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''دائمی طور پر ہر دور میں زمانے کا ذہن ایک نظریہ قبول کر کے اپناتا ہے۔اس اصول کی روشنی میں جہاں تک عصر حاضر کا تعلق ہے۔تو زمانے کے ذہن نے زیادہ طور پر الحاد کو قبول کر لیا ہے۔نکتہ یہ ہے کہ ذہن یا بہ الفاظ دیگر روح اعظم ایک ہی ہے۔اور ہمارے اذہان اس کے اجزاء ہیں۔مگر اب جبکہ امر واقع یہ ہو کہ کل نے ایک چیز قبول کی ہے۔تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس کا اثر اجزاء میں بھی لازماً سرایت کرے گا''۔

ایک انتہائی باریک نکتہ:۔

مندرجہ بالا ارشاد سن لینے کے بعد میں نے عرض کیا۔ کہ ''حضورؒ! یہ بات بڑی حیران کن ہے کیونکہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ روح اعظم الحاد کے خیال کو قبول کر لے؟'' میری گزارش کے جواب میں حضور بادشاہ جاؒن کا ارشاد گرامی یہ تھا کہ:۔

''دراصل یہاں پر ایک انتہائی باریک نکتہ اور بیحد نازک مسئلہ ہے۔ جس کو پوری طرح سمجھ لینا تو ذرا مشکل ہے البتہ میں صرف اسی قدر کہنے پر اتفاق کروں گا۔ کہ فی زمانہ روح اعظم غیریت سے عینیت کی طرف مائل ہے مابقایا تم خود سمجھ لو''۔

اور اسی وقت مجھے یاد آ گیا۔ کہ ایک مرتبہ پہلے بھی کسی موقعہ پر حضور بادشاہ جاؒن نے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔ ''وحدت اور واحدیت باہم گروا صل ہو گئے ہیں''۔

حقیقت حال:۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جبکہ حضور بادشاہ جاؒن کی شہرت عروج پر تھی۔ اور ان کے تمام مریدوں کا خیال تھا کہ خدا کی ساری خدائی انہی کے اختیار میں ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حضور بادشاہ جاؒن کی عادت مبارک تھی کہ وہ ہر شخص سے اس کی عقل اور استعداد کے مطابق کلام فرمایا کرتے تھے۔ اور جہاں تک اس قسم کے باریک نکات اور ادق افکار و آراء کا تعلق ہے تو اس قسم کے ارشادات سے مجھے مخاطب فرماتے۔ اور دوسروں سے ان کا تذکرہ نہ فرماتے۔ بلکہ ان سے ان کی ذہنی استعداد کے مطابق ارشاد ہوتا کہ:۔

''وقت کے سارے متصرف ہمارے مخالف ہیں''۔

کسی کو یوں ٹالتے کہ:۔

''آج کل فلاں بزرگ کا تصرف ہے''۔

اور حق یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں سے حضور بادشاہ جاؒن محض وقت گزارتے۔

روح اعظم کی حقیقت اور اس کے اثرات:۔

بہر حال میں نے روح اعظم کی غیرت اور عینیت کے بارے میں بھی خوب سوچ بچار کیا۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے اس ادق نکتے کی فہم وفراست عطا فرمادی۔ کہ بلا شبہ روح اعظم ولایت، خلافت اور امانت کی حقیقت کا دوسرا نام ہے۔ اور اسی کو مقام و احدیت کہا جاتا ہے۔ یہی مرتبہ مقام وحدت یا نور محمد ﷺ کا دروازہ ہے۔

لہذا جب واحدیت وحدت سے متحد ہو جاتی ہے۔تو اس کے ساتھ ہی غیریت ختم ہو جاتی ہے۔اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔کہ عینیت ہوتا ہے۔اس حال میں کائنات پر انائے واحد کا پرتو پڑتا ہے۔اور یہی وہ مرحلہ ہے۔جس میں روح اعظم بھی اپنے تئیں سبھی کچھ بلکہ کل سمجھنے لگ جاتا ہے۔بعد ازیں جب اس کا پرتو انسانی آئینہ پر پڑتا ہے۔تو وہ بھی اپنے کو کل سمجھ لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی ہستی اور اپنے تصور کے علاوہ باقی کچھ بھی تسلیم نہیں کرتا۔

اسی تاثر اور اس کے ردعمل کے طور پر حیوانیت یا ناسوتی دماغ میں الحاد کا نظریہ جنم لیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کل سیاست پر بھی فردیت کا نظریہ غالب آ گیا ہے۔اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک قوم ملک سے ایک گاؤں قوم سے۔ایک گھر گاؤں سے۔اور ایک فرد گھر سے بحیثیت کلی آزاد ہونا پسند کرتا ہے۔گویا ہر فرد بشر کا یہی دعویٰ ہے۔کہ ہمچو ما دیگرے نیست یعنی سب کچھ وہی ہے اور بس۔۔!!

فقراء پر ردعمل:۔

اسی چیز سے فقراء بھی یقیناً متاثر ہوتے ہیں۔لیکن چونکہ ان کی نسبت فقر سے ہوتی ہے اور سخت مجاہدہ بھی کیا ہوتا ہے۔بنابریں وہ عملی طور پر الحاد کو قبول نہیں کرتے اور جب کبھی ان پر اس کا پرتو پڑ جاتا ہے تو فوراً اس کو کوئی دوسرا متبادل خیال یا صورت پیش کر دیتے ہیں۔وہ ایسا کرنے میں تو اس لئے کامیاب ہوتے ہیں۔کہ ان کی حیوانیت بہر حال مغلوب ہوئی ہوتی ہے۔اگرچہ ان کی حیوانیت بھی برابر اسی کوشش میں لگی ہوئی ہوتی ہے۔کہ ان کو بھی الحاد کی طرف مائل کر دے۔لیکن ان لوگوں کے مضبوط ارادے کے مقابلہ میں ایسا کوئی تصور جم نہیں سکتا نہ قائم رہ سکتا ہے۔البتہ یہ بات الگ ہے کہ مضطرب ضرور ہوتے ہیں۔یعنی ہمیشہ قبض کی حالت میں رہتے ہیں اور بسط کی حالت بہت کم ہوتی ہے۔

کلام الملوک ملوک الکلام:۔

بہر حال مذکورہ بالا ارشاد کے بعد حضور بادشاہ جانؒ نے مندرجہ ذیل تصریحات بھی ارشاد فرمائیں:۔

''سالکین میں اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں۔جو امارہ سے گزر کر لوامہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔لیکن اس سے آگے منزل کرنے سے رک جاتے ہیں۔یہ لوگ نجبا اور نقبا کہلاتے ہیں۔یہ طائفہ دائماً مجاہدہ میں رہ کر قائم بحق ہوتا ہے۔منجملہ وہ لوگ جو لوامہ سے نکل کر ملہمہ تک پہنچ جاتے ہیں۔اور اسی مقام پر ان کی منزل بھی تمام ہو جائے تو اولیاء کی اس جماعت کو اوتاد کہا جاتا ہے۔یہ حضرات

اپنے کام اور اپنے مقام سے بطریق احسن واقف اور باخبر ہوتے ہیں۔اور یہ طائفہ اسی راہ کے مایہ ناز عساکر اور بہادر سپاہیوں میں شمار ہوتا ہے۔علاوہ ازیں وہ طبقہ جوملہمہ سے مطمئنہ تک رسائی حاصل کر لے اور اسی مطمئنہ ہی پر ان کی منزل بھی ختم ہو جائے۔تو یہ ابدال ہوتے ہیں۔مابقایا وہ ہستیاں جو مطمئنہ سے بھی گزر کر نفس مرضیہ تک پہنچ جاتے ہیں تو وہ غوث کہلاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ لوگ (یعنی غوث) نجابت،نقابت،اوتادیت،ابدالیت،قطبیت اور غوثیت کے حقدار ہوتے ہیں۔مگر یاد رہے کہ کوئی لازمی امر نہیں کہ لازماً سبھی مذکورہ بالا مراتب سے نوازے جائیں۔مثال کے طور پر ویسے تو مدرسہ سے فارغ التحصیل لوگ بے شمار ہوتے ہیں۔مگر ظاہر ہے کہ کلیدی آسامیوں پر چند ایک نفر تعینات ہوتے ہیں۔

بہر کیف ان حضرات کرام سے قطع نظر کبیر الشان اور مبارک ہستیاں نفس کاملہ کی مالک ہوتی ہیں۔ اور وہ صرف انبیاء علیہم السلام ہیں۔!البتہ اتنی بات ضرور ہے۔کہ ہر زمانے میں مجتہد ولی اللہ پر نفس کاملہ کا پرتو پڑتا ہے۔

اور فی الاصل یہ انبیاء علیہ السلام کی مکمل پیروی اور کامل متابعت کا انعام ہوتا ہے۔گویا یہی ولی اللہ مجازی طور پر نفس کاملہ کا بھی مالک ہوتا ہے۔کیونکہ اسی متبرک ہستی کو زمانے کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عمل کا نیا لائحہ عمل اور نئے نئے حقائق مرحمت ہوتے ہیں۔لہذا لازمی ہے کہ نفس کاملہ کا پرتو اس کے نفس کو اس امر کے لئے پوری طرح تیار اور مستعد کر لے۔کیونکہ جب تک اس کے اوپر نفس کاملہ کا پرتو نہ پڑے گا۔تو اس کی روحانیت نہ تو کسی نئے علم کو سہار سکے گی اور نہ ہی اس کا ادراک کر سکے گی؟

حضور بادشاہ جانؒ قطب الاقطاب تھے:۔

قیام لنڈی کوتل کے دوران ایک روز میں نے حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں عرض کیا تھا۔کہ ''حضور!جب ہمارے شیخ حضرت سائیں محمد عظیمؒ اس عصر کے مجتہد ولی اللہ تھے۔تو ان کے جانشین کا مرتبہ کیا ہوگا؟میری گزارش سماعت فرما لینے کے بعد حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''ان کا جانشین۔۔قطب الاقطاب ہوگا۔کیونکہ اس سے کمتر درجہ رکھنے والا کوئی صاحب بھی اس بارگراں کا متحمل نہیں ہوسکتا''۔

اس کے ساتھ ہی حضور بادشاہ جانؒ نے تبسم فرما کر خاموشی اختیار فرمائی۔

قبل ازیں محترمہ و معظمہ مائی صاحبہؒ نے بھی مجھے فرمایا تھا۔کہ حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ نے وصال فرماتے وقت یہی ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

"میں نے اپنے فرزند محمد اکبرؒ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ البتہ جہاں تک خاص الخاص امانت کا تعلق ہے۔ تو وہ پشاور کے شاہ صاحب (حضور بادشاہ جانؒ) کے حوالے کی گئی۔ جو فی الاصل انہی کے لئے مخصوص تھی"۔

حضورؒ اپنی تعریف سے برہم ہوتے تھے:۔

جو کچھ بھی تھا میں سمجھ گیا۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ بہ لحاظ مرتبہ قطب الاقطاب ہیں۔ لیکن ان کا قاعدہ مبارک تھا۔ کہ اپنی تعریف و توصیف سے خوش نہ ہوتے تھے۔ اور ایسے موقعوں پر بڑی حیاد امنگیر ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کے روبرو ان کی تعریف کرتا تو حضور بادشاہ جانؒ کے روئے مباک پر پسینہ آجاتا۔ اور روئے مبارک پر برہمی کے آثار نمودار ہوتے۔ تاہم میرے اس خیال کی تصدیق اسی سال اجمیر شریف میں بھی ہوگئی۔ اور وہ اس طرح سے کہ عرس مبارک کے اختتام پر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"اس سال حضرت خواجہ خواجگانؒ کی جگہ ہم کام کر رہے تھے"۔

امانت کی تفویض اور رشد و ہدایت کی ابتداء:۔

حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

"جس روز میرے شیخ حضرت سائیں محمد عظیمؒ کا وصال ہوگیا۔ تو میں بمبئی تھا۔ اور ان کا وصال فرماتے ہی وہ امانت میرے سپرد کی گئی۔ تب میں جان گیا۔ کہ میرے مرشدؒ کا وصال ہوگیا ہے۔ چنانچہ میں فوراً بمبئی سے اجمیر شریف آ گیا اور خواجہ خواجگان غریب النوازؒ کے دربار میں حاضری دی۔ اسی بارگاہ عالیہ سے پشاور جانے کا حکم صادر ہوا۔ ساتھ ہی پشاور میں ارشاد کی ابتداء کرنے کی بھی ہدایت فرما دی گئی۔ گویا اس کی ابتداء سرزمین افاغنہ سے ہونی طے پائی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ فطری طور پر اسلامی عقائد کی طرف بہت مائل ہیں۔ اور غلبۂ اسلام اور اس کی نشاط ثانیہ کی زیادہ تر توقع پختونوں ہی سے کی جا سکتی ہے"۔

حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کی پختونوں سے محبت:۔

اسی ضمن میں حضور بادشاہ جانؒ نے کسی اور موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

"میرے شیخ حضرت سائیں محمد عظیمؒ کی بھی پختون لوگوں سے بڑی محبت تھی۔ اور اکثر ایسا بھی ہوا کہ حضرت شیخ یکایک عالم محویت سے سر اٹھا کر یک بارگی ارشاد فرماتے کہ "پٹھان آ گئے کیا؟" چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک روز میں نے ان سے دریافت کیا۔ کہ حضور! کبھی کبھی آپ یہ

ارشاد فرما دیتے ہیں۔ کہ پٹھان آ گئے کیا؟ تو اس کا مطلب کیا ہے؟ حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا۔ کہ گویا میں دیکھ رہا ہوں۔ کہ پٹھانوں کی تکبیروں کی آوازیں کشمیر کے پہاڑوں میں گونج رہی ہیں۔ اور ان کے علم بڑی شان وشوکت سے آگے بڑھ رہے ہیں"۔

حضرت شیخ سائیں صاحبؒ کا کشف اور پختون غلامان اسلام:۔

میں کہتا ہوں۔ کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کے کشف کا اہم پہلو تو صحیح ثابت ہو گیا۔ اور اس کی مکمل صورت ابھی باقی ہے۔ اس کے علاوہ یہی پختون لوگ ہیں جو اس شریف قوم کے اولیاء اللہ نے کفرستان ہند میں اسلام کی شمع روشن کی۔ اور اس دور میں جبکہ سرزمین عرب میں اسلام اور اس کی محبت کے جذبے پر جمود طاری ہو گیا۔ عباسی خلفاء سر بہ فلک محلات شاہی میں داد عیش ونشاط دینے اور لہو ولعب میں کھو گئے تو اسی اثناء میں اسلام کی روشنی نے ملت افاغنہ کے افق سے تازہ انگڑائی لی۔ اور پورے ایک ہزار برس تک باقاعدہ تبلیغ اسلام کا اہتمام کیا۔ گویا پختون قوم کا فطری مقام ہی یہی ہے۔ کہ خدانخواستہ اگر اسلام کے اصولوں کے قلعہ پر کوئی طاغوتی طاقت حملہ آور ہو تو اس مایہ ناز قوم کے فرزند ایسے نازک موقعوں پر میدان عمل میں کودنے سے ذرہ برابر نہیں ہچکچاتے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی اصول اس قوم کی سرشت۔ اس کی قومی روایات اور تشخصات میں کچھ ایسے گھل مل گئے ہیں کہ دونوں میں کوئی تصادم اور غیریت یکسر بعید از قیاس ہے۔ اور میں فخریہ طور پر کہتا ہوں کہ میری پختون ملت دین اسلام سے قبل بھی معنوی طور پر مسلمان تھی۔ اس لئے کہ اس قوم کے فطری اور قومی صفات وروایات اکثر وبیشتر دین اسلام کے اصولوں سے متحد ہیں۔ بنا بریں مجھے اس غیور قوم کا مستقبل بڑا درخشندہ اور تابناک معلوم ہوتا ہے۔

لاہور کے نامی فیلسوف علامہ اقبالؒ بھی اسلامی غلبے کے سلسلے میں اس قوم سے بڑے پر امید تھے۔ اب اگر ہم غور کر لیں تو معلوم ہوگا۔ کہ حضرت سائیں محمد عظیمؒ کے عالیشان مرتبہ کو سنبھالنے کے لئے حق سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے ہی سے حضور بادشاہ جانؒ کا انتخاب فرما لیا تھا۔ اور اس ارفع مقام کی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے حضور بادشاہ جانؒ کو حق سبحانہ وتعالیٰ نے ریاضت ومجاہدہ کا ایک وسیع میدان فراہم فرما دیا تھا۔ جس کے بغیر اس بار گراں کو اٹھانا یقیناً مشکل بات ہوتی۔

حضور بادشاہ جانؒ کی ماورائی روحانی فطرت :۔

یہی وجہ ہے۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ کی فطرت کچھ ایسے ماورائی طریقے پر فرمادی گئی تھی۔ جس میں طریقت کے ہر مکتب فکر اور جملہ مشربوں کا امتزاج بدرجہ اتم موجود تھا۔ وہ قادری نقشبندی اور سہروردی طریقوں سے نسبت رکھنے کے علاوہ قلندری سلسلہ میں بھی خلافت رکھتے تھے۔ مدعا یہ کہ مرشد پاکؒ طریقت کے مجمع البحرین تھے۔ اور اسلامی تصوف کے ہر بڑے سے بڑے مدرسے کے طالب علم رہے تھے۔

حضور بادشاہ جانؒ طریقت کے جملہ اسالیب کے استاد کل تھے :۔

مخفی نہ رہے کہ زمانے کے لئے. وقت کے مطابق طریقت کا ایک نیا لائحہ کا آنے والا تھا۔ اور اس کو چلانے کے لئے ایک ایسی بلند پایہ شخصیت کی ضرورت تھی۔ جو سلوک کے جملہ اسالیب وطرق سے کماحقہ واقف ہو۔ نیز اس ہستی میں یہ قوت بھی موجود ہو۔ جو انسانی فطرت میں اس استعداد کو معلوم کر سکتی ہو۔ کہ کوئی شخص خصوصی طور پر طریقت کے کس مشرب کی طرف زیادہ میلان رکھتا ہے؟ مثلاً یہ کہ آیا وہ شخص چشتی طریقہ کی طرف فطری طور پر مائل ہے یا نقشبندی یا قادری سلوک کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت معلوم کر لینے کیبعد لازمی ہے کہ ایسے شخص کی تربیت اس طریقے پر کی جائے جو اس کی فطرت، فطری استعداد طبعی رغبت اور مذاق سے کسی طرح سے متصادم نہ ہو۔

قول کلی اور اصل غایت :۔

یاد رکھنا چاہئے کہ موجودہ زمانے کا اہم ترین تقاضہ یہی ہے۔ کہ اب طریقت کے مختلف انفرادی طریقے ملکر مقام اتصال کے صرف ایک ہی نکتے پر جمع کئے جائیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی نفسا نفسی اور باہمی اختلافات بھی دور ہو جائیں۔ کیونکہ اب وہ زمانہ آن پہنچا ہے جس میں احکام قرآنی کا دوسرا بطن ظاہر ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی مخالفین اسلام کے گمراہ کن حملوں کی مدافعت بھی خود بخود ہو جائے۔

قدیم فقہ، قدیم تصوف اور عصر حاضر :۔

ملحوظ خاطر رہے کہ عصر حاضر میں نہ تو متقدین علمائے کرامؒ کی رائج کردہ فقہ بحیثیت مجموعی چل سکتی ہے۔ اور نہ ہی صدر اول کے صوفیائے عظامؒ کے سارے اصول وضوابط

خلائق کے قلوب میں معرفت کی روشنی پیدا کر سکتے ہیں جس طرح کائنات میں قانون ارتقاء جاری ہے اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکثر قدیم طرق واسالیب وغیرہ بھی مکمل طور پر نشان راہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔

ایسا عرض کرنے سے مراد یہ ہے کہ بنیادی طور پر اساسی اصول تو وہی قدیم ہوں گے اور ہیں۔لیکن اب ان اصولوں کی وضاحت اور تعبیر وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ورنہ مخالفین اسلام کو حربے کے طور پر یہ الزام لگانے کا موقعہ نہ ملتا۔ کہ ''اسلام ختم ہوگیا ہے'' بہرحال اسلام کے جملہ مخالفین کو اچھی طرح سے معلوم ہونا چاہئے۔ کہ یہ دین فطرت ہے اور کسی صورت میں بھی ختم نہیں ہوسکتا۔ مابقیہ قرآن حکیم حق سبحانہ وتعالیٰ کا وہ کلام مبین ہے جو نہ صرف عصر حاضر کو بلکہ آئندہ بھی ہر دور کو نور ہدایت بخشتا رہے گا۔

بطون قرآن حکیم:۔

یہ حقیقت تو سب پر واضح ہے کہ خلاصہ موجودات فخر کائینات۔ آقائے نامدار، خواجہ دو عالم ﷺ نے قرآن حکیم کے بطون کے بارے میں اپنی ایک حدیث پاک میں ارشاد فرمایا کہ:۔ **لها البطن و لها البطن** ساتبار؟ اور بعض کے نزدیک ستر بار! تو مدعا محض یہی ہے کہ قرآن حکیم کے کئی بطون ہیں۔ جو ظاہر ہوں گے۔ اور اگر اس کے بطون نہ ہوتے۔ تو لامحالہ مخالفین اسلام کا مندرجہ بالا بے بنیاد الزام صحیح ہوسکتا تھا۔ مگر ایسے مخالفین کی اس قسم کی الزام تراشی سراسر حقیقت کے خلاف ہے اور اس کی بھی معقول وجہ موجود ہے۔

دنیا ابھی طفل ہے:۔

وہ یہ کہ ابھی تک یہ دنیا ایک کمسن بچہ ہے۔ ابھی شباب کہاں؟ جوانی تک پہنچنا تو ابھی باقی ہے۔ اور عام طور پر مشاہدہ یہی ہے کہ عنفوان شباب ہی میں بغاوت وسرکشی کا احتمال ہوتا ہے۔ مگر اس دور میں دنیا کی حالت بالکل ایسی ہے جس کو ہم بچوں کی ضدم ضدا سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بچے یہ تو نہیں جانتے کہ وہ شرارت کرتے ہیں۔ بلکہ یہ نہ جانتے ہوئے وجہ شرارت کرتے ہیں۔ اور اصلی بغاوت کا وقت تو وہ ہوتا ہے جب ان کو بغاوت اور سرکشی کے مفہوم کا بخوبی علم ہو جائے۔ اور عالم شباب میں والدین سے بغاوت اختیار کرلیں۔ یہی اصلی سرکشی کہلاتی ہے اور یہی حال اس دنیا کا بھی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ موجودہ الحاد اور سرکشی سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ اور دنیا بھی عالم شباب سے ہمکنار ہوا چاہتی ہے۔

نزول رحمت حق کا وقت :۔

لیکن اس میں بھی حق سبحانہ وتعالیٰ کا ایک راز مضمر ہے۔ اور وہ یہ کہ ایسے ہی موقعوں پر اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی بے پایاں رحمت موجزن ہوا کرتی ہے۔ اور اصلاح کار کا ایک نیا اور جدید سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسی دوران میں جوانی کی بہاروں تک پہنچنے والی دنیا کی بغاوت کو روکنے، اصلاح کار اور تادیب سکھانے کے نئے راستے کھل جاتے ہیں۔ اور یہی وقت ہے جس میں قرآن حکیم اپنے دوسرے بطن سے پردہ سرکائے اور دنیا اور دنیا والوں کو اپنا مالک حقیقی یاد دلا کر ان کا سر اسی خالق برحق کے دربار میں جھکا دے۔

بطون قرآن کے عالم لوگوں کی ضرورت :۔

ویسے عقلی طور پر بھی یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ کہ اس دور میں شریعت وطریقت کے اجزاء کی احیاء کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو قرآن حکیم کے اس بطن کے مکمل عالم ہوں۔ نیز ان کی بصیرت ان ادق رموز ونکات پر حاوی ہو۔ جو عصر حاضر کی سرکشی کو اصلاح زنجیروں اور تادیب کی ہتھکڑیوں میں جکڑ سکتے ہوں۔

پُرہیبت ہیئتوں۔ ترک دنیا اور مراقبات وغیرہ کا دور گزر چکا ہے :۔

کیونکہ اب ترک دنیا اور لمبے چوڑے چلوں اور مراقبات کا دور گزر چکا ہے۔ اب تسبیح کی طولانی لڑیاں از کار رفتہ ہو گئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تقاضائے وقت کے مطابق قرآن حکیم جملہ شیاطینی عفریتوں کو پابہ زنجیر کرنے اور تمام نفسانی مئوکلوں کو قابو میں لانے کے لئے نئے طریقے اور نئی ترکیبیں سکھاتا ہے۔ دور ہی بدل گیا ہے۔ اور آجکل مسلسل روزے رکھ کر جسم کو لاغر کرنا۔ مجرد رہنا اور بیویوں سے منہ چھپانا کمزور فطرت لوگوں کے قصے ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج وہ لحیم وشحیم اور پرہیبت داڑھیاں اور لمبی لمبی زلفان گرہ گیر۔ جنگلی مخلوق کا تصور پیش کرتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ نہ تو قرون اولیٰ میں ان سطحی چیزوں پر روحانیت کا مدار تھا۔ اور نہ ہی عصر حاضر میں روحانیت کے لئے ممد ومعاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

دراصل یہ چیزیں زمانہ قدیم میں ان ادوار کے تمدن کی نشانیاں تھیں۔ مگر نئی دنیا ان چیزوں کو جزد ایمان سمجھ کر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر حقیقت کا مدار انہی چیزوں پر ہو۔ تو قرون اولیٰ میں تو ابوجہل جیسے لوگوں کے چہروں پر بھی طویل وعریض داڑھی کی فصل لہلہاتی ہوئی نظر آتی تھی۔

الحذر و تفہم :۔

ظاہر ہے کہ ہر درخت کا پھل اس کی ظاہر شکل وصورت یا چھلکے سے پہچانا جاتا ہے۔ مگر جس وقت میوے کی اپنی صورت مکمل طور پر متحقق ہو جائے۔ تو پوست سے معرفت والی بات بے معنی ہو کررہ جاتی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ بلاشبہ یہ چیزیں ایک دور میں یقیناً طرۂ امتیاز تھیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ کسی دور میں بھی روحانیت کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور اب ایسی چیزوں سے چمٹے رہنا اور پھر ان کو اسلامی روحانیت کا جزو لانیفک جاننا بہت بڑی غلطی ہے۔ ان حالات میں اگر زمانہ اب بھی انہی فروعی چیزوں کو مضبوطی سے تھام لینے پر اصرار کرتا رہے تو دیکھ لیا جائے گا۔ کہ مسلمان ذلت کے عمیق کنوئیں میں گر جائیں گے۔

ملحوظ خاطر رہے۔ کہ بات زمانے کی نئی قدروں کی ہو رہی تھی۔ ورنہ بذات خود نہ تو یہ چیزیں بری ہیں اور نہ معیوب! نہ ہی مدعا یہ ہے کہ ان سے نفرت کی جائے۔ بہر حال اس دور میں ایسے ایسے علمائے کرام اور صوفیائے کرام عظام کی ضرورت ہے جو مختلف اسلامی فرقوں کے مسلمہ اصولوں کو مجتمع کر کے انہی بنیادوں پر ایک جامع فقہ کی ترویج کر لیں۔ نیز ایسے صوفیائے کرام کی ضرورت ہے جو مختلف مسالک کو جمع کر کے ایک ایسا قبول عام راستہ نکال دیں جس سے امت مسلمہ کو کماحقہ فائدہ پہنچ جائے۔

افسوسناک نعرہ زنی :۔

آخر۔۔ یہ کیا ظلم ہے۔ کہ کوئی صاحب تو یہ نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہے۔ کہ ''حق تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے صرف نقشبندی طریقہ آیا ہے۔ اور اگر دوسرے کسی طریقے میں کوئی شخص حق سبحانہٗ وتعالیٰ تک پہنچا بھی ہے تو یہ محض ایک اتفاقی معاملہ ہے'' یا للعجب! کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''قادری سلسلے کا سالک مابقایا ہر سلسلے کے سالک کو سلب کر سکتا ہے مگر قادری سالک سے رابطہ رکھنے والے سالک کو کوئی بھی سلب نہیں کر سکتا''۔ (گویا طریقت نہ ہوئی دنگل بازی ہوئی۔ مترجم)

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسے بڑے بڑے اور ذی مرتبہ بزرگوں نے اس قسم کے متعصبانہ دعوے کس لئے کئے ہیں اور کیوں؟ معلوم نہیں یہ مجنونانہ قسم کی گفتگو ان کی زبانوں پر آ کیسے گئی؟ مگر بقول حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ ''یہ پاگلوں کی باتیں ہیں اور ان کو معاف کر دینا ہی بہتر ہے''۔

سر مخفی کردہ ام با تو بیان :۔

بات نئے دور کی نئی قدروں اور شریعت وطریقت میں تجدید کی ہو رہی تھی ۔ اور اس ضمن میں ہمارے حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی یہ تھا ۔

"حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ اس زمانے کی مقتضیات اور اقدار کے عین مطابق ایک نیا لائحہ عمل لے آئے تھے ۔ بنابریں انشاءاللہ تصوف مستقبل میں بقیہ تمام سالک کے اتحاد کا سبب بنے گی ۔ اور نیز اسی سلسلے کے سپاہی دنیا کو وہ نکات بیان کرینگے جو قرآن حکیم کے اسی بطن سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور اب زمانہ قرآن حکیم کے (الٓرا) میں سے گزر رہا ہے ۔

حروف مقطعات کے سربستہ راز حضورؒ کو بتائے گئے تھے :۔

فخرالعلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ کو اپنے مرشد حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ نے ان تمام حروف کے رازہائے سربستہ بتا دیئے تھے جو اس زمانہ کے لئے ضروری تھے ۔ اور یہی وہ اعلیٰ وارفع مقام تھا ۔ جہاں ہمارے حضور بادشاہ جانؒ لا کھڑے کئے گئے تھے ۔ اور یہ مقام گویا تجدید تصوف کا صدر مقام یا دارالخلافہ تھا ۔

سرواڑ شریف کا واقعہ :۔

اس حقیقت کے ثبوت میں بر سبیل تذکرہ ایک امر واقعہ بھی عرض کروں گا ۔ سید عبد الرشید بادشاہ نے ایک روز ایک موقعہ پر ذکر کیا کہ "میں اور حضور بادشاہ جانؒ سرواڑ شریف گئے تھے ۔ (سرواڑ شریف وہ مقام ہے ۔ جہاں حضرت سلطان الہند خواجہ غریب النوازؒ کے فرزند حضرت خواجہ فخر الدینؒ کا مزار اقدس ہے) اسی جگہ میں نے حضور بادشاہ جانؒ سے پوچھا کہ حضورؒ! حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے ۔ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اہل بیت کو وہ علم عطا فرمایا ہے ۔ جو بنی اسرائیل کے نبیوں کو بھی نہیں دیا گیا تھا ۔ اب اس ارشاد عالی کے پیش نظر لازم آتا ہے کہ ہم میں بھی وہ علم بطور وراثت موجود ہو ۔ تو میری گزارش کے جواب میں حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ :۔

"بلاشبہ ! تم درست کہتے ہو ۔ مگر یاد رکھو ۔ کہ اس خاص علم کی موجودگی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ذریت میں سے ہر نفر کے اندر ضروری نہیں ۔ گو حضرت امام علیہ السلام کی اولاد اس علم سے قطعی طور پر محروم بھی نہیں" ۔

عبدالرشید نے فرمایا کہ "تب میں نے دوبارہ عرض کیا ۔ کہ حضورؒ ! جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق

ہے۔ تو مجھے خود معلوم ہے کہ مجھ میں ایسی کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ البتہ اگر حضورؒ کو یہ علم بطور وراثت ملا ہو۔ تو ارشاد ہو"! میری گزارش سماعت فرما کر حضور بادشاہؒ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:۔

"بہت بہتر۔۔ عبدالرشید بادشاہ! اگر زندگی نے وفا کی اور اگلے سال تمہیں اسی جگہ دوبارہ آ جانے کا اتفاق ہو جائے۔ تو یہ بے برگ و بار خشک شدہ درخت بارآ ور اور سرسبز ہوا ہو گا۔"

عبدالرشید بادشاہ نے بتایا کہ "اسی ارشاد کے ساتھ حضور بادشاہ جانؒ نے اٹھ کر اپنی پشت مبارک اس سوکھے ہوئے درخت سے مس فرمالی۔ اور میں نے بطور نشانی ملنگوں کے حقے کی ایک شکستہ سی چلم وہاں رکھ دی۔ بعد ازاں ہم اجمیر شریف آ گئے۔ اور جب پورے ایک برس کے بعد میں سرواڑ شریف چلا گیا۔ تو مزار اقدس پر فاتحہ پڑھ لینے کے بعد اسی درخت کی تلاش میں بڑی دقت پیش آئی. وجہ یہ تھی کہ وہاں پر سارے درخت سرسبز و شاداب تھے۔ مگر آخر کار اس درخت کی بیخ میں گھاس کے درمیان سے شکستہ چلم ڈھونڈھ نکالی۔ درخت کی شادابی کی یہ حالت تھی۔ کہ کوئی فرد بشر یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ گویا کبھی وہ سوکھ بھی گیا تھا۔

باب (۶)

حضورؒ کی تربیت کا طریقہ

کسی انسان کو تربیت دینا بڑا مشکل کام ہے:۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ کسی کو تربیت دینا کتنا بڑا اور اہم ترین کام ہوتا ہے۔ خصوصی طور پر انسان کی تربیت کا بیڑا اٹھانا تو انتہائی مشکل کام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک انسان مختلف قسم کے حیوانات کی تو ہر قسم کی پرورش کرسکتا ہے۔ لیکن اگر ایک انسان کی تربیت کسی دوسرے انسان کو سونپ دی جائے۔ تو یہ تربیت دہندہ کے لئے ایک انتہائی سنگین اور مشکل ترین کام ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہر دو انسانوں کے وجودی صفات قریباً قریباً ایک سے ہیں۔ اور طبعاً کوئی انسان بھی کسی دوسرے انسان کی اطاعت ومتابعت کو قبول کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہیں ہوتا۔ جب تک کہ وہ انتہائی حد تک مجبور نہ ہو جائے۔

مزید برآں نفس امارہ تو تربیت قبول کرنے کو اپنے لئے ایک جہنمی قید خانہ اور سخت ترین آہنی زنجیریں تصور کرتا ہے۔ وہ مختلف قسم کے حیلوں اور بے دریغ مکروفریب سے کام لیکر تربیت لینے کے چکر سے اپنے آپ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ البتہ اس انسان کی بات الگ ہے جس کی اپنی تربیت اعلیٰ طریقے پر ہوئی ہو۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی نفسیات انسانی عادات اور صفات سے بخوبی واقف ہو۔ تو ایسی شخصیت تربیت دینے کا مشکل ترین کام بری خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی ہے۔

تربیت عامہ کا ذکر:۔

میں یہاں پر کسی مخصوص تربیت کا ذکر نہ کرونگا۔ البتہ تربیت عامہ کے سلسلے میں تحریر کروں گا۔ مثال کے طور پر ایک معلم کا کام محض یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ طالب علم کو سبق پڑھائے۔ والدین بھی بچے کو اس کے بچپن ہی سے اخلاق وکردار کا درس دیتے ہیں۔ لیکن اس قسم کے درس میں بہرحال کوتاہی رہ جایا کرتی ہے۔ اور عموماً اس کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ یا تو خود بچے کے والدین ہی اعلیٰ تربیت سے محروم ہوتے ہیں۔ اور اسی بناء پر بچے کو صرف بات چیت کرنے کی ترکیبیں سکھاتے ہیں۔ بچہ بھی تقلید عرفی کے سبب وہ باتیں یا کچھ اور بھی سیکھ لیتا ہے۔ بہرحال والدین کی تربیت کی ناکامی کی اکثر وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ خود اعلیٰ تربیت یافتہ نہیں ہوتے ساتھ ہی بچے کی نفسیات سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ اور یا پھر والدین ہی کا بے حد لاڈ پیار بچے کو خودسر بنادیتا

ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔کہ بچہ اعلیٰ تربیت کو قبول کرنے سے رہ جاتا ہے۔
اسی طرح دنیا کے باقی علوم وفنون ہیں۔ جو بچے کو پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں۔لیکن اس نوعیت کی تمام تربیتیں جزوی حیثیت رکھتی ہیں۔تاہم دنیائی امور کو سلجھانے کیلئے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔مگر اس کے برعکس ایک کامل مرشد اپنے مرید کو ایسی تربیت دیتا ہے۔جس کے طفیل مسترشد دین اور دنیا کی سعادتوں اور بھلائیوں سے مستفید ہوتا ہے۔
امر واقعہ یہ ہے کہ جب تک ایک انسان کی اچھی طرح سے اخلاقی تربیت کا اہتمام نہ کیا جائے تو ایسا شخص دنیا میں کسی کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔وجہ یہ ہے کہ اصولی طور پر بدفطرت اور بداخلاق آدمی چاہے کتنا ہی نہ بڑھ جائے مگر بالآخر منہ کے بل گر جایا کرتا ہے۔

کامیاب مرشد اور برخوردار مسترشد:۔

تربیت دینے کے سلسلے میں ایک کامیاب استاد کے لئے سب سے پہلے لازمی امور میں سے ایک امر یہ ہے کہ وہ اپنے شاگرد پر پورا قبضہ اور مکمل تسلط جمالے۔اس لئے کہ محکم تنظیم کو قائم رکھنا اچھی طرح سے تسلط جمالینے کے بعد ہی ممکن ہوسکتا ہے البتہ یہ جدا بات ہے کہ اس تسلط کی صورت کیا ہو؟ کیونکہ اس بات کا تعلق متعلقہ امور اور ان کی نوعیت سے ہے۔ہم دیکھتے ہیں۔کہ ایک فوجی جرنیل قوت بازو یا عسکری مہارت کے زور سے تسلط قائم کرتا ہے۔ایک عالم تبحر علمی کی بنا پر تسلط جماتا ہے وعلیٰ ہذا القیاس! مگر ایک کامل مرشد جس طور پر تسلط جماتا ہے اس کی حیثیت مطابق جداگانہ ہوتی ہے۔وہ ایسے کہ اس کی محبت سے بھرپور توجہ سب سے پہلے مسترشد کے قلب کی گہرائیوں میں الفت اور محبت کے سرمدی نغمہ کو جگا دیا کرتی ہے۔اور وہ ایسے دلفریب انداز سے شاگرد کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔کہ خود بخود شاگرد کے دل میں اُنس ومحبت کی اضطراری کیفیت موجزن ہو جاتی ہے۔اسی طرح گویا مسترشد بہ رضا ورغبت اپنا آپ اپنے مرشد کے حوالے کر دیتا ہے۔اور بعد ازاں مرشد کامل کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی کا قافلہ روانہ کر دیتا ہے۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ایک کامل مرشد کی اس قسم کی پرکشش توجہ کسی نفسانی خواہش کے لئے ہرگز نہیں ہوتی۔بلکہ شاگرد کی اعلیٰ پرورش کے لئے ایسا کرنا لابدی ہوتا ہے۔اور مرشد کامل بھی اس کام کے لئے من جانب اللہ مکلف ہوتا ہے۔بہرنوع اس ابتدائی مرحلہ کے بعد شاگرد کی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔اور وہ اپنے اندر ایک عظیم الشان روحانی انقلاب محسوس کر لیتا ہے۔اسی اثناء میں سالک کا اپنے استاد کے ساتھ عشق ومحبت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔کیونکہ اس کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے۔کہ میری زندگی کی تکمیل کا سارا اثاثہ اور سارے اسباب اسی مرشد کے ہاں

موجود اور محفوظ ہیں۔ لیکن شاگردوں میں بھی کئی ایک ایسے صاحبان فطرت ہوا کرتے ہیں۔ جن کے اندر معرفت کی اچھی خاصی استعداد مخفی ہوتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان میں نفسانی اور شیطانی قوتیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ قدم قدم پر استاد کے جال سے نکلنے کی برابر کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اس صورت میں اگر مرشد کامل اور اکمل نہ ہو تو پرورش تو رہی ایک طرف مسترشد پہلے سے بھی زیادہ بگڑ جاتا ہے۔ اور نیم حکیم کے زیر علاج مریض کی طرح لب گور تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانائے رومی قدس سرہٗ نے فرمایا تھا۔

اے بسا ابلیس آدم روئے هست
پس به هر مردے نه باید داد دست

اخوان الشیاطین:۔

دراصل انہی انسانوں کے اندر ایک طبقہ ایسا بھی پایا جاتا ہے۔ جس کا ظاہری لباس اولیاء اللہ کا سا ہوتا ہے۔ لیکن باطن میں یقیناً شیطان لعین کے موکل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ درحقیقت عامل ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طائفہ نے بنی آدم کو مسخر کرنے کے لئے مجاہدہ کیا ہوتا ہے۔ اور اپنے اقتدار کو جمانے اور قائم رکھنے کے لئے مخلوق خداوندی کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اگر ایسے عاملوں سے رابطہ رکھنے والے کسی شاگرد کی تربیتی تشنگی دور نہ ہو اور وہ کسی کامل استاد کو تلاش کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دے۔ تو یہ ایک عامل کے لئے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ اور اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ نہایت روشن فطرت رکھنے والے طالب بھی اس قسم کے عاملوں کے پرفریب داموں میں گرفتار ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر جب ایسے طالب اس دام سے نکلنے کی سعی کرتے ہیں۔ تو نکل نہیں سکتے۔ اور اس قسم کے طالبوں کی مثال ہو بہو اس چراغ کی مانند ہوتی ہے جس کے اندر بتی اور تیل تو موجود ہو لیکن متاسفانہ روشن نہ ہو سکے۔ بہ ایں ہمہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ خوش قسمتی سے ایسے روشن فطرت رکھنے والے طالب عاملوں کے پرفریب داموں کو توڑ کر آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

دہشت زدہ نفس کی حیلہ سازیاں:۔

جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں نفس امارہ کسی کامل استاد کی تربیت سے سخت ہراساں ہو جاتا ہے۔ اسی لئے وہ اس قسم کی تربیت سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر مختلف قسم کے مکر و فریب اور بغاوت کرنے پر اتر آتا ہے۔ لیکن تاہم اگر استاد کامل ہو تو نفس امارہ کے سارے حیلے بہانے محو کرنا اور اس کی شدید بغاوت کو ناکام بنانا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ وہ پہلے ہی سے نفس کے

ہر کید و فریب اور اس کے جملہ حیلہ سامانیوں سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک کامل مرشد اپنے مسترشد کی تربیت کا آغاز الفت و محبت سے کرتا ہے۔ اور جب یہی طالب اپنے مرشد سے مانوس ہو جائے۔ تو پھر اس کے نفس کو بے راہ روی سے روکنے کے لئے پوری شدت سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ گویا خوف و رجاء کے ذریعے شاگرد کو حیوانیت کے نرغے سے نکال کر انسانیت کی پر بہار وادی تک پہنچاتا ہے۔ بہر حال اسی دوران میں مسترشد مچل کر بہت تنگ آ جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اس قسم کی تربیت میں کچھ فائدہ۔ اور کچھ نئی کیفیات محسوس کر لیتا ہے تو لگے ہاتھوں پوری دلجمعی اور ذوق و شوق سے کام شروع کر دیتا ہے۔ اسی ضمن میں مولانائے رومی قدس سرہٗ نے بھی ایک مثال دی ہے۔ کہ ابتدائی طور پر بچہ مکتب سے جی چراتا ہے۔ اور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر جونہی اُسے علم کے فوائد معلوم ہو جاتے ہیں تو بصد شوق مدرسے جاتا ہے۔

حضور بادشاہ جانؒ کی تربیت کا اولین اصول:۔

کامل مرشد خصوصاً فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ کی تربیت دینے کا اولین اصول یہ تھا۔ کہ وہ سب سے پہلے طالب کے ذہن میں صحیح مقصد کا خاکہ نقش فرمادیا کرتے تھے۔ اور جب تک سالک صحیح معنوں میں طالب نہ ہو جاتا تھا۔ اور اس مقصد کے مرکزی نقطے تک رسائی حاصل نہ کرتا تھا۔ تب تک حضور بادشاہ جانؒ اس کی مزید تربیت کی ضرورت محسوس نہ فرماتے۔ البتہ جس وقت سالک اسی مقصد اعلیٰ کا تعین کر لیتا تو معاً طالب کا ارادہ بھی خود بخود مضبوط ہو جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی رجعت کا خطرہ بھی ٹل جاتا۔ اور یہ اس وقت وقوع پذیر ہوتا جبکہ حضور بادشاہ جانؒ طالب حق پر پورا قبضہ اور تسلط حاصل فرمالیتے تھے۔ من بعد حضور بادشاہ جانؒ طالب حق کے غالب رجحان کے پیش نظر تربیت کا سلسلہ شروع فرماتے۔

مرشد کو مسترشد کا بنیادی وصف معلوم ہونا ضروری ہے:۔

یہ امر مسلمات میں سے ہے۔ کہ اگرچہ تمام بنی آدم صفاتی لحاظ سے ایک جیسے ہیں۔ تاہم ہر انسان میں بنیادی طور پر ایک ایسا وصف ضرور موجود ہوتا ہے۔ جو اس کی شخصیت کا مرکز اور محور ہوتا ہے۔ اور اس کے باقی صفات اسی مخصوص بنیادی صفت کے گرد گھومتے ہیں۔ تو جب تک ایک مرشد کو کسی طالب کا وہی بنیادی وصف معلوم نہ ہو۔ اور جب تک مرشد طالب حق کی اس بنیادی صفت کو پوری طرح دریافت نہ کرلے اور پھر اس کے مطابق اس کی تربیت کا بیڑا نہ اٹھائے۔ تب تک کامیابی سے ہمکنار ہونا لایعنی بات ہوتی ہے۔ اسی طرح جو مرشد طالب حق کا یہی بنیادی وصف معلوم نہ کر سکے وہ مرشد کسی طرح سے بھی کامل تربیت دینے کے اہل نہیں ہوتا۔

چہار قسم کے رہبر:۔

یہی وجہ ہے کہ اس راہ میں چار قسم کے رہبر مشہور ہیں جن میں سے ایک کو پیر صحبت دوسرے کو پیر طریقت، تیسرے کو پیر ارادت اور چوتھے کو پیر خلافت کہتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ چاروں صفات صرف ایک ہی شخصیت میں موجود ہوں۔ اور اسی کے ذریعے کوئی سالک پایہ تکمیل تک پہنچ جائے۔ ورنہ انفرادی طور پر ہر چہار قسم کے مرشدوں سے درجہ بدرجہ تکمیل کا کام ہوا کرتا ہے۔ خود ہمارے مرشد پاکؒ نے اپنی تکمیل کے سلسلے میں کئی بزرگوں سے استفادہ کیا تھا۔ جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

حیوانیت کیخلاف طاقت کا استعمال:۔

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔ کہ جہاں پر خواہشات کا زور ہوگا۔ وہاں پر بالضرور روشن ذہن اور اچھے خاصے مجاہدہ کی طاقت بھی موجود ہوگی۔ اگر چہ ابتدائی طور پر ایسے طالبان حق کی تربیت بے حد مشکل ہوتی ہے۔ اور یہ اس لئے کہ ایسے طالب کا نفس امارہ شدید طور پر مدافعت کرتا ہے۔ اس قسم کے طالب کی تربیت رجاء کی بجائے خوف کے ذریعے سے بطور احسن ہوسکتی ہے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ جہاں خواہشات کی کثرت ہوگی وہاں حیوانیت بھی کافی مقدار میں ہو گی۔ اور جہاں تک حیوانیت کو سدھارنے کا تعلق ہے تو معلوم ہے کہ وہ بغیر طاقت کے استعمال کے کسی اور چیز سے زیر نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی وہ اطاعت و فرمانبرداری کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوتی ہے۔

لہذا ایسے افراد کو ابتدائی طور پر **موتوا قبل ان تموتوا** کے مرحلہ کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اگر چہ یہ مرحلہ ہر سالک کے لئے ضروری ہے۔ تاہم جو مرشد توجہ دینے کی قوت رکھتا ہو تو وہ ایسے طالبوں کو خوف کی توجہ دیتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی اتحادی توجہ ہوتی ہے جو نفس امارہ کو سرے سے یہ موقعہ ہی نہیں دیتی کہ وہ مدافعت یا سرکشی کے سلسلے میں ایک مخصوص مرکز قائم کر سکے۔ اس لئے کہ خوف انسانی وجود کے لئے ایک دھنئے کی مانند ہوتا ہے۔ اور خصوصی طور پر وہ طالب کی وجودی صفات کو ایسے دُھنتا ہے۔ کہ خود بخود اس کی فطرت کے عمق میں وہ تمام صفات بیدار ہو جاتی ہیں۔ جو اس کی تکمیل کے لئے لازمی ہوتی ہیں۔ مابقایا جس قدر بھی خوف میں زیادتی آئیگی اسی قدر خواہشات میں بھی کمی وقوع پذیر ہوگی۔ اس لئے کہ حیوانیت مغلوب ہوئی ہوتی ہے۔

حیوانیت تاک میں ہوتی ہے:۔

لیکن ذہن نشین رہے کہ حیوانیت اب تو جاتی ہے۔مگر بحیثیت کلی فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمیشہ کے لئے موقعہ ومحل کی تلاش میں رہتی ہے۔اور جب کبھی استادتربیت سے غافل ہوجاتا ہےتو فوراً دوبارہ سر اٹھا کر سرکشی اور بغاوت کا بازار گرم کردیتی ہے۔یہاں تک کہ اپنے ساتھ انسانیت کو بھی قبضہ میں لے لیتی ہے۔

مختصر یہ کہ جب تک نفس مطمئنہ تک رسائی حاصل نہ ہو تو ہر موقعہ پر بغاوت کا احتمال موجود رہتا ہے۔اور نفس مطمئنہ کا وقت وہ ہوتا ہے جبکہ سالک کی تکمیل انسانیت کے ساتھ ساتھ اس کی ملکیت کا عنصر بھی اس کی انسانیت سے مل جاتا ہے۔اور یہی ملکیت انسانیت کا اہم ترین سہارا ہوا کرتا ہے۔

مرشد کی مستعدی اور چوکسی:۔

کامل مرشد کو دائماً یہ فکر دامنگیر ہوتی ہے۔کہ طالب حق کی ملکیت کا عنصر بھی۔اس کی انسانیت پر غلبہ حاصل نہ کرلے۔بدیں وجہ کہ اگر ایسا واقعہ ہوجائے تو سالک کا مجذوب ہوجانا لازمی ہوجاتا ہے۔لیکن اس کے برعکس اگر حیوانیت غلبہ کرلے۔تو اس صورت میں سالک کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔اور یہ بھی یاد رہے کہ انفرادی طور پر انسانیت بھی محض عقل ہوتی ہے۔اور وہ بھی باغی! اس لئے ایک کامل مرشد کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ سالک کی شخصیت کو ایک ایسے امتزاج کا حامل بنادے جس میں اس کی ملکیت وحیوانیت پر اس کی انسانیت بہرانداز غالب رہے۔اور اول الذکر ہردو عناصر اس کی انسانیت کے ماتحت ہوں۔ نیز اسی انسانیت کے عنصر کو بھی پوری طرح آگاہ کردیا جاتا ہے۔اگر اس نے اسی امتزاج سے ذرہ برابر بھی تجاوز یا سرکشی اختیار کی۔تو ایسا کرنے میں اس کے زوال کا شدید خطرہ ہے۔

امر واقعہ بھی یہی ہے کہ اس قسم کے حالات سے دوچار ہونے کے بعد سالک کی انسانیت پر یقینی طور سے حیوانیت یا ملکیت کا پورا قبضہ ہوجائے گا۔اور ظاہر ہے کہ مؤخر الذکر (حیوانیت یا ملکیت) ہردو حالات مقصد اعلیٰ کے حصول کے سلسلے میں بہت بڑی رکاوٹیں ہیں۔

پہلے محبت اور پھر خوف کی توجہ:۔

جب میرے مرشد پاکؒ نے میری تربیت شروع فرمائی تو سب سے پہلے انہوں نے مجھے محبت کی توجہ فرما کر اپنی طرف کھینچ لیا۔من بعد انہوں نے ارادہ فرمالیا۔کہ مجھے اپنے سلسلہ میں بھی شامل

فرمالیں۔تو خوف کی توجہ فرمائی۔اور یہ خوف اس حد تک مسلسل اور ہولناک تھا کہ ہر گھڑی میں یہ محسوس کرتا کہ ابھی۔اور بس ابھی میرا دم نکل جائے گا۔چنانچہ اس خوف کو مٹانے اور اس سے یکسر چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے۔میں نے حتی المقدور بڑی تگ ودو اور خوب کدو کاوش کی۔جن میں ادویات کا استعمال اور علاج معالجہ بھی شامل ہیں۔مگر کسی طرح سے کسی چیز نے اثر نہ دکھایا۔نہ مجھے افاقہ ہوا۔تاہم اسی دوران میں یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔کہ یہ سبھی کچھ حضور بادشاہ جانؒ کی زبردست توجہ کا اثر ہے۔اور کچھ بھی نہیں۔

لہذا اس کے بعد میں نے بارہا حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں گزارش کی۔کہ براہ کرم گستری مجھے اس پر ہیبت اور دہشتناک حالت سے نکال دیں۔مگر دوسری طرف حضور بادشاہ جانؒ تھے کہ سنی ان سنی فرما دیتے تھے۔

بارے ایک روز تبسم فرما کر ارشاد ہوا کہ:۔

ثو ئبے خپلـه مـدعـا تـر سـره نـه وی
مـهـویـان سـودا د خضرؑ پـه خولـه نـه کـه

(جب تک حسین لوگ اپنا مدعا حاصل نہ کرلیں۔تو خضرؑ کے کہنے سے سودا بازی سے باز رہتے ہیں۔)

حضور بادشاہ جانؒ میری غزل کی اصلاح فرماتے:۔

اسی دوران کبھی کبھی جب میں کوئی غزل لکھتا۔تو بغرض اصلاح حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت مبارک میں پیش کر دیتا۔تب وہ اصلاح فرما دیتے تھے۔اور جب خوف حد سے بڑھ جاتا تو محبت کی ایک ایسا مسیحائی توجہ فرماتے کہ میں یکدم تازہ اور ولولہ انگیز صحت سے ہمکنار ہوتا۔آہستہ آہستہ صوفیانہ افکار کے ساتھ ساتھ میرے فلسفیانہ افکار نے بھی کروٹ لے لی۔متصل میرے علم الیقین میں بھی مشت وگریبانی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔اور یہ ایک طویل داستان ہے۔جس کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔تاہم میری اپنی سوانح حیات میں اس کا تذکرہ مفصل طور پر آ جائے گا۔چونکہ یہ حضور بادشاہ جانؒ کا مبارک تذکرہ ہے اس لئے میری انتہائی کوشش یہ ہو گی۔کہ جہاں تک ممکن ہو سکے۔انہی کی سوانح قلمبند کروں۔

فساد نفس اور فلسفی افکار کا ردعمل:۔

غرض یہ کہ کچھ عرصہ کے بعد حضور بادشاہ جانؒ کی تربیت سے میری تسلی نہ ہوتی تھی۔اسی دوران اگر وہ میری غزل کی اصلاح فرماتے تو یہ اصلاح بھی مجھے وزن دار معلوم نہ ہوتی تھی۔اسی طرح

میرے دیگر علمی امور کی بھی یہی حالت ہوگئی ۔ اور فی الاصل یہ سب کچھ میرے نفس امارہ کا زبردست فساد تھا۔ اور یہی اس کے کامیاب اور تباہ کن حربے تھے۔
علاوہ ازیں میرے ان فلسفیانہ افکار کا بھی اثر اور ردعمل تھا۔ جو ایک ہولناک طوفان کی طرح میرے ذہن میں بس گئے تھے ۔ وجہ یہ تھی کہ خوف کے دھنئے نے منجملہ دیگر صلاحیتوں کے میری فلسفیانہ صلاحیت کو بھی جگا دیا تھا۔ اگرچہ قبل ازیں مجھے اس کا مطلق احساس نہ تھا۔ ان وجوہات کی بناء پر میرے علم الیقین اور اطمینان میں تزلزل آ گیا۔

حضور بادشاہ جانؒ کی تشویش :۔

ادھر حضور بادشاہ جانؒ کو میری اس حالت سے تشویش ہونی تھی ۔ کیونکہ ان کو کسی طور پر یہ منظور نہ تھا۔ کہ میں نرا فلسفی بن جاؤں ۔ چنانچہ وہ خوف کی توجہ دیتے میں روز بروز مزید در مزید اضافہ فرماتے ۔ مگر تماشہ یہ کہ جس قدر میرے خوف میں شدت آتی اسی قدر میرا نفس امارہ حضور بادشاہ جانؒ کی مخالفت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا۔ بلا شبہ یہ میری تربیت کا وہ انتہائی سنگین دور تھا۔ جو انتہائی پیچیدہ اور نازک تھا۔ اسی دور میں میری منزل ملہمہ تک پہنچ گئی تھی ۔ لیکن ظاہر میں میرے فلسفیانہ افکار و آراء سے نفس امارہ کے ازسرنو غلبے کا گمان ہوتا تھا ورنہ منزل تک بس ایک گام کا فاصلہ تھا۔ اور معاً نفس مطمئنہ کا پورا عالم میرے سامنے ہوتا۔

اگر ایسا ہوتا :۔

حقا کہ اس وقت مجھے ایک خاص علمی تربیت کی ضرورت تھی ۔ اس کے ساتھ ہی محبت کی اکسیر توجہ سونے پر سہاگے کا کام دیتی ۔ اسوجہ سے کہ ان دنوں میرا نفس بالک نہ تھا۔ بلکہ بالغ ہو کر جوان ہو گیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ نوجوانوں پر زجر و توبیخ الٹا اثر کرتی ہے ۔ سو میری بھی یہی حالت تھی ۔ حتیٰ کہ میں نے بزعم خویش یہ رائے قائم کر لی تھی کہ لاریب باوجود یہ کہ حضور بادشاہ جانؒ تربیت عامہ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ۔ لیکن شاید مجھ جیسے وسواسی اور منطقی ذہن رکھنے والے شخص کی تسلی نہیں کر سکتے ۔
بہر حال اگر حضور بادشاہ جانؒ میرے حسب حال محبت کی توجہ جاری فرماتے اور نیز میرے فلسفیانہ اوٹ پٹانگ آراء و افکار کو یونہی بے لگام چھوڑ دیتے ۔ تو یقینی بات ہے کہ میری منزل کمال سرعت سے بڑے شاندار طریقے پر اختتام پذیر ہوتی ۔ مگر متاسفانہ پے در پے خوف کا نتیجہ یہ نکل آیا کہ بالآخر میرا نفس امارہ پورے طمطراق سے بیدار ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میرے فلسفیانہ دلائل نے جلتی پر تیل کے مصداق لوامہ اور ملہمہ ہر دو کو قطعی طور پر لاجواب کر دیا۔

الحاد کا دور اور تجدید بیعت:۔

اس کا نتیجہ یہ نکل آیا کہ مجھ پر الحاد نے دھاوا بول دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ 1941ء میں قیام اجمیر شریف کے دوران مجھے حضور بادشاہ جانؒ سے بیعت کی تجدید کرنا پڑی۔ تب الحاد کا طوفانی حملہ پسپا ہو گیا۔ پھر بھی اسی سال دہلی کے حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کی توجہ سے الحاد کے باقی ماندہ اثرات کا بھی مکمل طور پر صفایا ہو گیا۔ اور اس کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ فلسفیانہ شکوک و شبہات سے نبٹ کر ان کا سدباب کر سکوں۔

حضور بادشاہ جانؒ اسم بامسمےٰ تھے:۔

تربیت کے سلسلے میں حضور بادشاہ جانؒ ''پردہ پوشی'' کی اہم اور خصوصی صفت سے بھی بدرجہء اولیٰ متصف تھے۔ حقا! کہ مرشد پاکؒ صحیح معنوں میں ستار تھے۔ وہ کسی بھی شخص کا عیب ظاہر نہ فرماتے۔ بعض اوقات ان کے اکثر مرید کسی ناکارہ کام اور ناگوار فعل سے منفعل ہو کر مارے شرم کے خدمت عالیہ میں حاضر ہونے سے کھچے کھچے اور پوشیدہ رہنے کی کوشش کرتے لیکن آخر کار جب کبھی اس شہباز ملک قدسؒ کی خدمتیں حاضر ہوتے تو حضور بادشاہ جانؒ قطعی انجان بن کر اس طرح کلام فرماتے۔ کہ گویا حضور بادشاہ جانؒ کو ان مریدوں کی بداعمالیوں کا کوئی علم نہیں اور اسی طرح منفعل مریدوں کو بھی اسی بات کا پختہ یقین آ جاتا کہ حضور بادشاہ جانؒ کو ان کے ناگوار افعال کا قطعی علم نہیں ہے۔

الغرض کسی کو بھی اس کا عیب انگشت نمانہ فرماتے۔ اور یہی حضور بادشاہ جانؒ کی علم النفسیات سے پوری پوری واقفیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ بلاشبہ وہ معائب و معاصی سے محفوظ رہنے کی تلقین فرماتے۔ مگر اس حکمت عملی سے جیسا کہ حضرت مولانائے رومی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

وعظ سے پیر کی توہین اور مرید کا خسارہ:۔

فخر العلماء الاولیاءؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

''ایک کامل مرشد یا پیر کے لئے مناسب نہیں کہ واعظین کی طرح اپنے مرید کو نصیحت دینا شروع کر دے۔ اس لئے کہ اگر وہ حقیقی معنوں میں مرشد یا پیر ہو اور رسول کریم ﷺ کے مقدس و متبرک انوار سے بھی کچھ نہ کچھ فیض یاب ہوا ہو۔ تو وہ بذات خود اپنی توجہ کے ذریعے کسی مرید کا رجحان

ایک کام کی طرف دلاتا ہے۔ دوسری جانب اگر وہ اپنی زبان سے وعظ و نصیحت کے ذریعے اپنے کسی مرید کو کسی برے فعل سے روکے اور اس کے باوجود مرید اس برے فعل سے باز نہ آئے تو اس صورت میں ایک طرف خود پیر کی توہین ہوگی اور دوسری طرف مرید کو خسارہ ہوگا"۔

ہمارے پیر!

ان حقائق کے پیش نظر مقابلتاً جس قسم کے پیر صاحبان ہمارے قبائلی علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ تو وہ انسانی نفسیات کو مطلق خاطر میں نہیں لاتے۔ بفرض محال اگر کوئی داڑھی منڈا ان کے پاس بغرض ملاقات چلا جائے۔ تو فی الفور حکم صادر فرما دیتے ہیں۔ کہ "پہلے داڑھی رکھ لو پھر آ جاؤ۔ اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو بار دگر صفاچٹ چہرہ دکھانے کی کوئی حاجت نہیں"۔
اس قسم کے طرز سلوک کا نتیجہ یہ نکل آتا ہے۔ کہ ملاقاتی حضرت دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے بھول کر بھی پیر جی کی گلی کا رخ نہیں کرتا۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ایسے پیروں کا یہ طرز عمل اس آیت قرآنی کے کس قدر خلاف ہے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ
(اللہ کے راستے (راہ ہدایت) کی طرف لوگوں کو دانائی اور اچھی اچھی نصیحتوں کے ساتھ دعوت دے۔)

سید احمد بریلویؒ کی ناکامی کے اسباب:۔

یہی وجہ تھی کہ سید احمد بریلویؒ کی تحریک سرحد میں ناکام ہوگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شریعت کے مطابق ایک صحیح اسلامی معاشرہ بروئے کار لانا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی طرف سے شرعی نظام بھی قائم کر دیا تھا۔ لیکن متاسفانہ انہوں نے پختون قوم کی روایات اور رسم ورواج کو کوئی اہمیت نہ دی۔ یہاں تک کہ ایک آدمی کی بالغ لڑکی اس کی رضا حاصل کئے بغیر ہی دوسرے شخص کو نکاح میں دیدی جاتی تھی۔
اس ضمن میں جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ مذہب انسانوں کے لئے ایک ایسے قالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کو نفس فطری طور پر ناپسند کرتا ہے۔ حالانکہ اس میں خود انسان ہی کا فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ دوسری طرف رواج ہے تو یہ ایک ایسی چیز ہے۔ جس کا قالب انسان اپنی مرضی سے اپنے لئے خود تراشتا ہے۔ خواہ اس میں انسان کو نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ لیکن پھر بھی انسان اس قسم کے نقصان کو بخوشی برداشت کرتا ہے۔ اور کچھ اندوہگین نہیں ہوتا۔
مدعا یہ ہے کہ اگر سید صاحب مذکور سب سے پہلے کچھ عرصہ کے لئے پختونوں کی ملی روایات اور رسم ورواج کی اصلاح کو مصلحت تقاضائے وقت سمجھ کر حکیمانہ تبلیغ کا اہتمام کرتے تو ہوسکتا تھا کہ ان کی

تحریک کو بھرپور تقویت پہنچتی۔ ان کے لئے یہ بھی ناگزیر تھا۔ کہ سکھوں کا مکمل صفایا کرتے۔ اور جب یہ مہم سر ہو جاتی تو اصلاح کی تحریک چلاتے۔ یہ اس وجہ سے لازمی تھا۔ کہ سکھوں کے خلاف ساری پختون قوم بلاتفریق ان کے ساتھ تھی۔ مگر ہوا یہ کہ سید صاحب نے سکھوں کا مقابلہ کرتے ہوئے قانون شریعت بھی جاری کر دیا۔ درآں حالیکہ ابھی سرگشتۂ رسوم و قیود پختون قوم اس کے لئے تیار نہ تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ سید صاحب کی تحریک کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

آزردہ خاطر مرید:۔

کبھی کبھی اگر کوئی مرید حضور بادشاہ جانؒ سے روٹھ جاتا اور پھر خدمت اقدس میں حاضری دینا ترک کر دیتا تو حضور بادشاہ جانؒ بھی ایسے شخص کے متعلق کچھ گفتگو نہ فرماتے۔ اور اگر شرکائے محفل میں کوئی اور شخص اس رنجیدہ مرید کا تذکرہ چھیڑتا کہ "حضور! آج کل فلاں مرید یہاں نہیں آتا" تو حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد یہ ہوتا کہ:۔

"میاں! یہ دنیا ہے اور دنیا میں انسان کے ذمے اور بھی کئی کام کرنے کو ہوتے ہیں۔ شاید ایسے ہی امور ضروریہ سے اس کو بھی فرصت کے لمحات میسر نہ آتے ہوں"۔

حکیمانہ وضع:۔

حد یہ ہے کہ حضور بادشاہ جانؒ کو اچھی طرح سے علم ہوتا کہ وہ مرید کبیدہ خاطر ہے۔ اور بر بنائے آزردگی یہاں نہیں آتا۔ لیکن پھر بھی جب کبھی یہ ناراض مرید خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو حضور بادشاہ جانؒ ایسے حکیمانہ وضع سے پیش آتے کہ اس شخص کو قطعی طور پر یقین آ جاتا۔ کہ گویا حضور بادشاہ جانؒ کو واقعہ ناراضگی کا یکسر کوئی علم نہیں۔ اس قسم کے طرز سلوک اور حسن عمل کا اثر یہ ہوتا کہ ایسے مرید کو انفعالی جذبات کے غلبہ سے سابقہ پڑ جاتا اور ساتھ ہی اس کی شکر رنجی بھی خود بخود رفع ہو جاتی۔

انجان کی پہچان:۔

مریدوں کے ساتھ حسن سلوک سے قطع نظر عوام کے ساتھ بھی حضور بادشاہ جانؒ کا رویہ اس قدر قابل تعریف تھا۔ کہ بجا طور پر آدمی کو حیرت ہوتی ہے۔ اگر کسی ملاقاتی صاحب سے پہلی ملاقات میں اس کے حسب حال جس قسم کا سلوک شروع ہوتا تو آخر تک اس میں کوئی فرق نہیں آنے دیا جاتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور بادشاہ جانؒ ایک انجان شخص کو کس حد تک اور کس خوبی سے بیک نگاہ پرکھ کر پہچان لیا کرتے تھے۔ یہ ان کا کمال تھا کہ ایسے شخص کو دیکھتے ہی فوراً اس کے طور واطوار اور اس کی باطنی خوخصلت کا اندازہ بخوبی لگا لیتے تھے۔ ایسا عرض کرنے سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضور بادشاہ جانؒ محض قیافہ شناس تھے۔ بلاشبہ قیافہ شناس بھی تھے۔ لیکن انسان کے ظاہری طور و اطوار میں روح کی صفات کا جو پرتو ہوتا ہے۔ تو وہ یقیناً ان کی نظر کیمیا اثر سے پوشیدہ نہ ہوتا تھا۔ اسی ضمن میں ایک خضر صورت پیر کا واقعہ آپ گزشتہ اوراق میں پڑھ آئے ہوں گے۔

انسانی روحانیت کا سم قاتل:۔

دوران تربیت میں حضور بادشاہ جانؒ اصولی طور پر اپنے شاگردوں کو سب سے پہلے زنا کی آفت سے بچانے کا خاص خیال رکھتے۔ یہ اس لئے کہ وہ اس فحش فعل کو روحانیت کے لئے سم قاتل جانتے تھے۔ کبھی کبھی وہ یہ ارشاد فرماتے کہ:۔
''قتل و غارت گری، جواء بازی، شراب نوشی، غیبت گوئی اور ہمچنیں دیگر بھی کئی عظیم گناہ ہیں۔ جو روحانیت کے لئے بے حد مضر ہیں۔ لیکن جو خسارہ اور ہلاکت آفرینی زنا کاری میں ہے۔ مقابلتاً کسی دوسرے گناہ میں بہت کم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ فعل شنیع انسان میں بے حیائی کے مادہ کو ترقی دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حیا نصف ایمان ہے۔ پھر اگر کوئی شخص اس بد فعلی کو دائمی طور پر اختیار کرلے تو مکمل طور پر نعمت ایمانی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔''

فواحشات سے حسنات کی طرف رغبت دلانا:۔

رسول کریم ﷺ کی سیرت اقدس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلے بموجب حکم خداوندی عزوجل اپنے مخاطبین کو فواحشات سے نکال کر حسنات کی طرف راغب کرنا پسند فرمایا تھا۔ رسول کریم ﷺ سب سے پہلے عربوں کے ان خصائل کو دور فرمانا چاہتے تھے۔ جو ان کے اخلاقی اور نفسانی امراض کا باعث بن گئے تھے۔ اور جیسے ہی بد اخلاقی سرزمین عرب سے رخصت ہو رہی تھی اور اخلاق حسنہ اور نیکیاں ان کی جگہ لے رہی تھیں۔ تو اس کے ساتھ ساتھ ان کو آہستہ آہستہ عبادات کے احکام بھی ملنا شروع ہو گئے۔ ظاہر ہے۔ کہ میلے کچیلے اور ناپاک برتن میں پاکیزہ چیز بھی نجس اور ناپاک ہی نظر آتی ہے اور کسی طرح بھی اس کے استعمال کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

حضور بادشاہ جانؒ روش اور حکمت عملی:۔

حضور بادشاہ جانؒ کی بھی یہی روش تھی۔ وہ ابتداءً اپنے شاگردوں کے تزکیہ نفس کی طرف زیادہ توجہ دیتے۔ اور جس وقت ان کا شاگرد اصولی طور پر اپنے آپ کو مرات تزکیہ میں دیکھ لیتا تو بے اختیار ہوکر خود بخود عبادات و مجاہدات میں مصروف ہو جاتا۔

بفرض محال کسی وقت اگر کوئی شاگرد زیادہ مجاہدہ کی وجہ سے ترک دنیا کی طرف مائل ہو جاتا تو حضور بادشاہ جانؒ اس کو بہ شدت تمام منع فرماتے۔ کیونکہ ان کا طریقہ جذب کا نہیں بلکہ سلوک کا تھا۔ نیز اگر کوئی شاگرد قنوطیت میں کھو کر اتنا آگے بڑھ جاتا جس کے لئے واپس آنا دشوار ہو جاتا تو ایسے شاگرد کو حضور بادشاہ جانؒ بذریعہ توجہ یا کسی دوسرے حسب حال حکمت عملی سے دنیا کی طرف واپس لوٹا دیتے تھے۔ پھر جب وہ شخص کچھ عرصہ کے لئے دنیائی کاروبار میں منہمک ہو جاتا تو دوبارہ اصلی منزل کی طرف واپس لے آتے تھے۔

انسان اضافات کے ہاتھوں کھلونا نہ بنا رہے:۔

وجہ یہ تھی کہ حضور بادشاہ جانؒ کو ہرگز یہ منظور نہ تھا کہ ان کا کوئی شاگرد اضافات کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ جائے جن کو حق سبحانہ وتعالیٰ نے انسانی وجود کے ساتھ معرفت کے لئے شامل کیا ہے۔ اور معلوم ہے کہ جب تک اضافات کا اسقاط نہ ہو جائے۔ تو توحید خالص نہ حاصل ہو سکتی ہے اور نہ قائم رہ سکتی ہے۔ البتہ جب توحید خالص ہو جاتی ہے تو تمام اضافات اسی کے زیر اثر ہو کر بلا وجہ مغالطہ میں ڈالنے اور بے جا طور پر بہکانے کے فعل سے رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ اب وہ انسانیت کے زیر تسلط ہوتے ہیں۔ اور یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جب تک ایک انسان اپنی عادات کا محکوم ہوتا ہے۔ تو کسی طرح سے بھی انسان کامل بننے کا اہل نہیں ہو سکتا نہ بن سکتا ہے اس لئے لازمی ہے کہ آدمی برائے نام بھی عادت کا محکوم نہ رہے۔

عبادات اسلامی کی غایت:۔

غالباً اسلامی عبادات کی اصل غایت بھی یہی ہے کہ وہ انسان کو عادت پر فوقیت اور غلبہ حاصل کرنے کا سلیقہ سمجھاتی ہیں۔ اگر چہ یہ عبادات بھی ایک قسم کی عادت بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن ان میں فرق یہ ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی عادت انسانیت کی موید و معاون بن جاتی ہے۔ مزید برآں اس عادت کو بروئے کار لانے میں اور ادا کرنے میں ہمیشہ تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

غور فرمائیے کہ انسان میں دو قسم کی عادتیں ہوتی ہیں۔ منجملہ ایک تو ان میں سے وہ عادت ہے۔ جسے

وہ اپنی مرضی سے قبول کر کے اپناتا ہے۔ مثلاً ملکی یا علاقائی رسوم و قیود ہوئے اور یا پھر نفسیاتی خواہشات کے مطابق مختلف قسم کے مطالبات وغیرھم! تو اس نوعیت کی عادتوں اور تقاضوں کو انسان بڑی خوشی اور خندہ روئی سے پورا کرتا ہے۔ اور کسی قسم کی نفسیاتی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ لیکن ان سے قطع نظر دوسری جانب وہ فرائض اور احکام ہیں۔ جو خاص من جانب اللہ انسان پر عائد کئے گئے ہیں۔ اور پھر ان پر مسلسل عمل پیرا ہونے سے وہ بھی عادت کے زمرے میں آ گئے ہیں۔ تو اس قسم کی عادتوں یا احکام کو بجالانے میں انسان تکلیف محسوس کرتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اگر نماز کا وقت آ جائے تو نفس فریضہ نماز کی ادائیگی کو پسند نہیں کرتا۔ رمضان شریف کا مہینہ آ جائے تو نفس انسانی پر ملال کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور اگر زکوٰۃ دینے کے روز شب پورے ہو جائیں تو دولت کے انبار کے باوجود انسانی نفس بخل کے اسلحہ خانہ میں مورچہ سنبھال لیتا ہے۔ بہر حال اس کی عادت جاریہ اس کو ان تمام امور کو عملی شکل دینے پر مجبور کرتی ہے۔ لہذا ان حقائق کے پیش نظر صاف طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کہ مئوخر الذکر قسم کی عادتیں مجازاً تو عادتیں ہوتی ہیں۔ یعنی بہ ظاہر عادت ہی نظر آتی ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ عادت نہیں بلکہ ملکی عنصر کا پرتو ہوتا ہے۔ جس کو حیوانیت پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اور انسانیت کا معاون ہوتا ہے۔

عادت بد کا توڑ ملکی عنصر ہی سے ممکن ہے:۔

یہ بھی واضح ہے کہ یہ امر انسانی نفسیات کے بالکل خلاف ہے۔ جبکہ ایک بار نفس کسی چیز کا عادی ہو جائے۔ اور پھر اسے ترک کر دے۔ یہ بات سوائے خارجی پرتو کے بالکل ناممکنات میں سے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک چیز ہمیشہ کے لئے اپنی ضد کی طاقت سے شکست کھاتی ہے۔ مثلاً آگ اس مقدار کے پانی سے بجھے گی جو اس کی طاقت سے زیادہ قوت رکھتا ہو۔ اب اگر کوئی بری عادت پسپا ہو کر شکست خوردہ ہو گئی تو یہ لازمی طور پر کسی ایسے نیک عمل کے ردعمل سے ہوگا۔ جو بہر کیف اس بری عادت پر غالب ہوگا۔

غور فرمائیے کہ ایسے حالات میں جبکہ نفس امارہ نے انسانی وجود پر قبضہ جما لیا ہو۔ تو یہی نفس کس طرح ایسی بری عادت کو چھوڑنے پر آمادہ ہوگا۔ جس کو اس نے خود طبعاً، اصولاً یا فطرتاً اپنے لئے قبول کیا ہو؟ لامحالہ اس کے لئے ایک اور ایسی طاقت کی ضرورت ہوگی جو نفس امارہ کی بری عادت بزور اور پوری شدت کے ساتھ محو کرادے۔ اور فی الحقیقت طاقت کی یہ قسم یقیناً نفس امارہ کی ضد ہو گی۔ اور شک نہیں کہ یہ ملکی عنصر کی وہ بے مثال طاقت ہے۔ جو انسانی عنصر کے اتحاد سے مصروف کار ہوتی ہے۔

خصوصی وصف:۔

اسی ذیل میں حضور بادشاہ جانؒ نے اپنے شاگرد کی تربیت کے سلسلے میں یہ بات پسند فرمائی تھی۔کہ وہ نفس کی کسی عادت کا تابع نہ رہے۔اور اس کی قوت ارادی کمال کے اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ اپنے ہی مجاہدہ کے بل بوتے پر خود کو اضافات کے جال سے نکال سکے۔اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی تکمیل کے بعد وہ بھی اپنے شاگردوں کو اسی راستہ کی نشان دہی اور رہنمائی کر سکے۔

حضور بادشاہ جانؒ کا عزیز ترین شاگرد سے طرز سلوک:۔

حضور بادشاہ جانؒ کا قاعدہ مبارک تھا۔کہ وہ جس شاگرد کو بہت عزیز رکھتے تھے۔اور یہی شاگردان کی نگاہ مبارک میں قابل اور اہل بھی ہوتا۔تو ایسے شاگرد کیساتھ آزاد ہو کر کلام نہ فرماتے۔نیز شاگرد کو بھی اس جرات کا موقعہ نہ دیتے کہ وہ ان کی طبیعت میں دخیل ہو جائے۔اس طرز سلوک میں مصلحت یہ تھی۔کہ اگر حضور بادشاہ جانؒ ایسے شاگرد کو ذرا ڈھیل دیتے۔تو بالفعل ایسا کرنے میں شاگرد کی تربیت میں فتور آ جاتا۔حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

''بسا اوقات میرا امن پسند شخص یا تو میرا مخالف ہو جاتا ہے یا انواع واقسام کی اذیتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے''۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ میرے برادر بزرگ ملک باور خان مرحومؒ کو حضور بادشاہ جانؒ بے حد عزیز رکھتے تھے۔مگر حق یہ ہے کہ برادرم کی ساری زندگی مسلسل بحران اور مشکلات میں بسر ہوئی۔رہا میں۔؟ تو میں اپنے متعلق چپ ہی رہوں تو بہتر ہے۔کیونکہ تادم تحریر میرے دنیوی حالات سدھرے نہیں۔اور آگے خدا معلوم کیا ہوگا؟

حضور بادشاہ جانؒ نے میری تربیت بڑی محنت سے کی:۔

ان حقائق سے قطع نظر جہاں تک سلوک میں میری تربیت کا تعلق ہے تو اس ضمن میں میرے مرشد پاکؒ نے از راہ کرم گستری جو سعی اور ان تھک محنت فرمائی اس کا اندازہ بھی صرف میں خود ہی لگا سکتا ہوں۔بات یہ تھی کہ میری فطرت میں کچھ حصہ فلسفے کے لئے بھی وقف تھا۔اور یہی فلسفیانہ شعور مجھے اکسا کر بغاوت پر آمادہ کر دیتا تھا۔میری مثال بھی بقول علامہ اقبال مرحوم ''نطشے کی طرح تھی جس کے متعلق انہوں نے کہا تھا کہ قلب او مومن دماغش کافر است۔لیکن حق یہ ہے کہ حضور بادشاہ جانؒ نے پل بھر کے لئے بھی مجھے اپنی کیمیا اثر توجہ سے باہر نہ ہونے دیا۔

میری بے جا کوشش:۔

باوجود یہ کہ میری انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ چاہے کچھ ہی پیش آئے میں بہر صورت حضور بادشاہ جاںؒ کے تسلط سے آزاد ہو جاؤں۔ مگر میں ہر طرح سے ناکام ہی رہتا۔ کبھی کبھی حضور بادشاہ جاںؒ متبسم ہو کر ارشاد فرماتے کہ:۔

''میاں! ہمارے جادو سے کوئی بھی رہائی نہیں پا سکتا''۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ میں بہت اکتا گیا تھا۔ چنانچہ ایک روز خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ کہ ''حضورؒ! مجھے اپنی بیعت سے آزاد فرما دیجئے! یہ سماعت فرماتے ہی حضور بادشاہ جان نے جلدی سے استفسار فرمایا کہ:۔

''کیوں۔۔۔۔۔۔۔۔؟''

میں نے دوبارہ عرض کیا کہ ''حضورؒ! میں ان پیہم مشکلات اور تلے اوپر آلام و مصائب کی مزید طاقت نہیں رکھتا''۔ براہ کرم یا تو آپ ان مصائب کو دور فرما دیجئے اور یا بصورت دیگر مجھے آزادی بخش دیجئے۔ مرشد پاکؒ نے یہ سلسلہ کلام سماعت فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ:۔

''یہ دوسرا موقعہ ہے کہ تم مجھ سے ایسی بات کہتے ہو۔ اور اگر تمہیں یاد ہو تو پہلی بار بھی میں نے تم سے کہا تھا کہ ان شداید و مصائب میں خود تمہارا اپنا فائدہ ہے۔ چنانچہ اب کی بار بھی میں اپنے یہی الفاظ دہراؤں گا''۔

یہ کیا کہہ گئے؟:۔

مگر میں اسی لمحہ میں مچل کر طیش میں آ گیا تھا۔ اور سمجھ بوجھ سے عاری ہو کر مجھے یہ سوچنے کی فکر ہی نہ تھی۔ کہ میں کہہ کیا رہا ہوں؟ بارے بے دھڑک عرض کر دیا کہ ''مجھے اس فائدے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہی فائدہ ہی مجھے لے ڈوبا۔ اور اسی کے طفیل مجھے مسلمانی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ اور پختون ولی سے بھی!!''

میرے اس طرز تکلم کے باوجود حضور بادشاہ جاںؒ کے رخ انور پر کسی قسم کے تغیر کے خطوط محسوس نہ ہوئے۔ اور بدستور میرے ساتھ ایک شفیق باپ کی طرح محو گفتگو تھے۔ جو ایک سرکش اور نافرمان بیٹے کے ساتھ مکمل شفقت اور مہربانی سے محو کلام ہو۔ حضور بادشاہ جاںؒ نے میری بات کے جواب میں یہ جملہ ارشاد فرمایا''

''یہ کیا کہہ گئے۔۔؟''

میں نے عرض کیا کہ ''حضورؒ لازمی طور پر ایک پختون مسلمان کو زیادہ سے زیادہ قوی القلب ہونا

چاہئے۔اس لئے کہ وہ اصلاً اور نسلاً مجاہد ہوتا ہے۔مگر میری حالت ایسی ہے کہ بندوق چلنے سے قبل ہی اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس دیتا ہوں۔اور اگر گاؤں۔محلہ یا بازار میں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھ لوں تو معاً مجھ پر اختلاج القلب کا دورہ شروع ہو جاتا ہے۔آخر یہ بھی کوئی زندگی ہے ؟میں ایسی زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔" میری گزارشات سماعت فرما کر حضور بادشاہ جاںؒ مسکرائے اور ارشاد فرمایا کہ:۔

"بیوقوف!یہ سب وقتی حالات ہیں.ذرا صبر و تحمل سے کام لو گے.تو دیکھ لو گے۔کہ ان کے بڑے مزے کے نتائج برآمد ہوں گے"

دوٹوک الفاظ:۔

مگر پھر بھی میں اپنی ضد پر اڑا رہا۔بالآخر حضور بادشاہ جاںؒ کے چہرۂ مبارک پر مشفقانہ۔مگر تادیبی غصے کے آثار دکھائی دینے لگے۔اور دوٹوک الفاظ میں زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا:۔

"اس سے پہلے بھی میں نے تم سے کہا تھا۔اور اب پھر کہتا ہوں۔کہ چاہے تم بوڑھے ہو جاؤ۔اور تمہاری داڑھی کے بال سفید بھی ہو جائیں تو بھی میں تمہیں ایک معصوم بچہ ہی جانوں گا۔ہر چند اگرچہ تمہارا ذہن نصف پختون قوم کا ذہن ہے۔مگر مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔کہ اس ذہن کا چراغ میں ہوں۔اور معصوم بچہ اگر ماں باپ پر بول و براز بھی کر لے تو اس کے والدین اس کو محسوس نہیں کرتے نہ خفہ ہوتے ہیں۔کان لگا کر سن لو میں آج اپنے الفاظ دہراتا ہوں کہ میں تم کو اپنی تحویل سے ہرگز نہیں جانے دوں گا۔اور چاہے تو مشرق چلے جاؤ یا دور مغرب میں جا بسو۔مگر مجھ سے خلاصی پانے کا خیال عبث ہے۔نہ ہی کوئی دوسرا ماں کا ایسا پوت موجود ہے۔جو تم کو مجھ سے چھین سکے۔"

اس آخری فقرے کے ساتھ ہی حضور بادشاہ جانؒ کے چہرۂ مبارک پر ایسا جلال دکھائی دیا۔جس نے میرے سارے وسوسے اور ساری بیقراری کو ایک پرسکون اور خوشگوار کیفیت میں تبدیل کر دیا۔وجہ یہ تھی۔کہ میرے قلب اور ذہن میں یہ بات سما گئی اور مجھے پختہ یقین آ گیا کہ اب میں کسی صورت سے بھی حضور بادشاہ جاںؒ کے تسلط سے آزاد نہیں ہو سکتا۔اور یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔کہ اس قسم کے تیقن کے ساتھ ہی ایک گونہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔مثال کے طور پر اگر ایک آدمی کو موت کا خطرہ لاحق ہو جائے۔تو یقیناً خوفزدہ ہوتا ہے۔لیکن اگر اسے طوعاً وکرھاً ہر حالت میں موت کا مکمل یقین آ جائے تو سارا خوف و بیم استقلال اور اطمینان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔بہر کیف حضور بادشاہ جاںؒ نے اس شدت اور دباؤ کے سات ایسی صاف اور دوٹوک بات

اس سے پہلے کبھی نہ فرمائی تھی۔ چنانچہ بعدازاں میں نے بھی ان کے تسلط سے آزاد ہونے کی سعی ترک کر دی۔

واقعہ ارمڑ پایان:۔

جیسا کہ سطور بالا میں آپ نے پڑھا ہوگا۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ نے مجھ سے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

''یہ دوسرا موقع ہے کہ تم مجھ سے ایسی بات کہتے ہو''۔

تو وہ واقعہ یہ تھا کہ حضور بادشاہ جانؒ ہر سال موضع ارمڑ کے ارادتمندوں کی دعوت پر وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اسی گاؤں کے دو اشخاص حضور بادشاہ جانؒ کے خاص الخاص مریدوں میں شمار ہوتے تھے۔ جن کو میں حضور بادشاہ جانؒ کے محبِّ قلبی کہوں گا۔ ان میں سے ایک کا نام غریب شاہ تھا۔ اور دوسرے کا اسم گرامی الف خان تھا (حق سبحانہ وتعالیٰ دونوں کو غریق رحمت فرمائے) خیر تو میں بھی حضور بادشاہ جانؒ کی معیت میں ارمڑ پایان جاتا۔ ارمڑ میانہ کا شاعر فرید خان بھی شریک محفل ہوتا۔ اور رات کو مجلس خوب گرم رہتی۔

ارمڑ کے نستعلیق لوگ:۔

مواضعات ارمڑ کے لوگ عموماً اور ارمڑ پایان کے خصوصاً سلف کے سے وہی غیور پختون ہیں۔ سادہ مگر شیرین و نمکین زبان کورے کھدر کا مگر بانکا ستھرا لباس، غریبانہ مگر نستعلیق وضع قطع۔ اور اس پر مستزاد اس قدر مست الست اور رسیلے چھبیلے کہ سبحان اللہ! بڑے ہی قدر شناس اور بذلہ سنج واقعہ ہوئے ہیں۔

ٹھیکیدار روخان مرحوم اور اسی طرح کئی دیگر لوگ بھی آتے۔ رات کو نعت خوانی ہوتی۔ اس کے بعد میدان میں کود پڑتے۔ اور یکے بعد دیگرے سندرے، لوبے اور چاربیتے گاتے یہ لوگ شاعر تو نہ ہوتے تھے۔ لیکن مجلسی (حجروں میں گانے بجانے والے اُمی شاعر) ضرور ہوتے تھے۔ جو اپنے اپنے کلام کے علاوہ دوسرے شاعروں کا کلام بھی سناتے۔ جس کا انداز گانے کی صورت میں ہوتا۔ اسی دوران میں اگر اچانک کسی چاربیتہ میں تعلیٰ (کسر) آجاتی تو فرید جان استاد فرط جوش سے رقص کرتا ہوا۔ بیچ میدان میں نکل آتا۔ اور دوران رقص میں یکایک اس ہیئت سے ساکن ہو جاتا کہ ایک پاؤں زمین پر زور سے مار کر اور دوسرا ذرا ترچھا رکھ لیتا۔ ایک ہاتھ کان پر اور دوسرا پسلیوں کے نیچے پہلو میں رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔ اور فی البدیہہ چاربیتہ کہنا شروع کر دیتا۔ وہ بھی اس مزے کا کہ تعلیٰ (کسر) کا جواب تعلیٰ میں دیتا۔ اگر مجلسی (گانے والا) فرید جان سے پوچھتا کہ ''استاد ! بھلا یہ کون؟'' تو وہ جواب دیتا کہ ''میری موجوگی میں تم نے کسر کیوں کہی تھی؟''

طفلانہ ارادے:۔

غرض یہ کہ روز و شب کی رنگینیوں کا یہ عالم تھا۔ مگر میں نا قابل برداشت تکلیف میں مبتلا تھا۔ او
اندریں حالات میں نے طے کر لیا۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت میں یہ گزارش کر دوں کہ برا
کرم مجھے معاف کر دیں۔ تاکہ دنیا کا کوئی اور دھندا شروع کر دوں۔ اور یہی ارادہ میں نے خوب
مضبوط کر لیا۔ چنانچہ صبح چائے نوش فرمانے کے بعد جب حضور بادشاہ جانؒ قضائے حاجت کے
لئے باہر تشریف لے گئے۔ تو ہم سب پیر بھائی بھی نکل کر ایک کھیت کے کنارے بیٹھ گئے۔ ہم
باتوں میں مصروف ہو گئے۔ مگر جونہی میں نے دور سے حضور بادشاہ جانؒ کو اپنی طرف تشریف
لاتے ہوئے دیکھا۔ تو برادران طریقت سے کہہ دیا۔ کہ آپ لوگ بیٹھے رہیں۔ اور میں ذرا حضور
بادشاہ جانؒ سے کچھ عرض معروض کرنے ان کے پاس جاتا ہوں۔ خیر تو میں روانہ ہوا اور جب ان
کے قریب پہنچا تو ایک بیری کے درخت کے نیچے اپنی چادر بچھا کر ان کو بٹھا دیا۔ اور عرض پرداز ہوا
کہ ''حضورؒ! میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔'' میری گزارش کے ابتدائی کلمات سماعت فرما کر حضور
بادشاہ جانؒ نے میری جانب کچھ اس انداز سے دیکھا گویا میرے تمام معروضات اول سے لیکر آخر
تک ان کی بالغ نظری سے مخفی نہیں ہیں۔ تاہم میں نے آگے عرض کر دیا کہ ''حضورؒ! اب میں بہت
تنگ آ گیا ہوں۔ اور یہ تکلیف مجھ سے اٹھا لیجئے۔'' اس کے جواب میں حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد
گرامی یہ تھا کہ:۔

''یہ ہمارے بس سے باہر ہے۔!''

یہ سن کر میں نے گزارش کی کہ ''اگر یہ آپ کے بس سے باہر ہو تو فکر نہیں۔ اب آپ براہِ کرم مجھے
اجازت دے دیجئے کہ کسی اور کی خدمت میں حاضر ہو کر قسمت آزما لوں۔ تاکہ یہ مسلسل اور جان
لیوا تکلیف مجھ سے دور ہو جائے۔'' یہ سماعت فرماتے ہوئے حضور بادشاہ جانؒ نے تبسم فرمایا اور
ارشاد ہوا کہ:۔

''بے وقوف! اس میں خود تمہارا ہی فائدہ ہے''۔

اب میں نے عرض داشت پیش کی کہ ''یہ فائدہ کسی اور کو مبارک ہو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔
کیونکہ مجھے صرف آزادی چاہئے اور آپ مجھے آزاد کر دیں۔ یہ سن کر حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی
زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''میں نے تو کبھی منع نہیں کیا۔ بفرض محال اگر کہیں اور سے تمہیں فائدہ پہنچنے کی امید ہو سکتی ہے تو
ضرور چلے جاؤ۔ اور اگر دوبارہ واپس آنا ہوا۔ تو یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ اور اس کا دروازہ تمہارے لئے
ہر وقت کھلا رہے گا۔ لیکن! یہاں سے رخصت لے کر بھی۔ اگر تمہیں کسی اور جگہ سے حسب طبیعت

فائدہ نہ پہنچا۔تو واقعی یہ بڑی بری بات ہوگی اور فضول وقت ضائع کرلو گے"۔
اب میں نے یہ استدعا کی کہ "حضورؒ! میں مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ایک مرتبہ آپ آزاد کرلیں. پھر دیکھا جائے گا. جو ہوگا سو ہوگا" اسی اثناء میں، میں اس قدر حواس باختہ اور بے اختیار ہوگیا تھا کہ فرط جوش سے میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔
مگر حضور بادشاہ جانؒ نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:۔
"بے وقوف! ہمارے جال سے بھی کوئی نکل سکتا ہے؟"
میں نے غصہ سے بھرپور گھٹی آواز میں عرض کردیا کہ "آپ ایک بار آزاد کردیں پھر آپ ہاتھ اٹھانے اور زور آزمائی کرنے میں آزاد ہوں گے"۔اور ان الفاظ کو سماعت فرما کر حضور بادشاہؒ کے رخ انور پر ملال کے علامات نظر آنے لگے۔مگر پل بھر میں فوراً اپنے جذبات پر اس تندی اور خوبی سے قابو پالیا کہ مجھے اپنے پہلے قائم کردہ خیال پر-----وہم وگمان ہونے لگا۔اب حضور بادشاہ جانؒ نے تبسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔
"تم نادان ہو! دیکھو! سمجھدار لوگ بات مان لیا کرتے ہیں۔چلو اب ساتھیوں کے پاس چلیں"۔
چنانچہ میں رنج واندوہ سے نڈھال ہوکر ایک مظلوم کی طرح حضور بادشاہ جانؒ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوگیا۔میری آہ وبکا اور میرے درد والم نے ان پر کچھ بھی اثر نہ کیا. تاہم آج میں اس حقیقت کے احساس کا اعتراف کرتا ہوں۔کہ اے کاش! اگر ان مصائب وآلام میں کچھ اور بھی اضافہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔حافظ شیرازؒ نے خوب کہا ہے۔

به مے سجاده رنگیں کن اگر پیر مغاں گویت
که سالك بے خبر نه بود زراه و رسم منزلها

قصوروار کون:۔۔؟؟

مندرجہ بالا واقعات کسی حد تک شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنے سے مدعا صرف یہ ہے کہ انسان کو تربیت دینا کس قدر مشکل کام ہے۔اس وقت جبکہ میری حیوانیت زوروں پر تھی۔اور ہر طرح سے اس کوشش میں لگی ہوئی تھی۔کہ کسی طرح سے حضور بادشاہ جانؒ کی تربیت کے شکنجہ سے نکل جائے۔حیوانیت نے مجھے اس طرح اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔جیسے کوئی ہرنی شیر کے مضبوط پنجوں تلے آ گئی ہو۔اور اگر حضور بادشاہ جانؒ میری اس قسم کی طفلانہ حرکات سے ناراض ہوتے۔تو خدا معلوم میرا کیا حال ہوتا۔۔۔؟
فرض کیجئے اگر ایک باپ اپنے چھوٹے سے بچے کی صندم صندا کو برداشت نہ کرسکے اور مارے غصے کے بچے کی ایسی پٹائی کرے کہ بچارے بچے کے ننھے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں۔تو غور فرمائیے۔

اس افسوسناک انجام کا قصوروار بچہ ہوگا یا اس کا ناعاقبت اندیش باپ۔۔؟

بطرز کنایات:۔

تربیت دینے کے مشکل ترین کام کے سلسلے میں ایک اور واقعہ بھی عرض کرتا ہوں۔ جس کا ذکر کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ یہ واقعہ بھی میری سرکشی سے متعلق ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ میری سرکشی درجہء کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ میری تمام تر علمی استعداد حیوانی ادھیڑ بُن کی نظر ہوگئی تھی۔ میری عقل بھی مکمل طور پر حیوانیت کے تابع تھی۔ اور اسی طرح میں ان ہر دو عناصر سے برابر حیوانیت کے اشاروں پر کام لیتا رہا۔ بلا شک وشبہ حیوانیت کا خطرناک منصوبہ یہ تھا۔ کہ وہ مجھے ہر طرح سے حضور بادشاہ جانؒ کی تربیت کے شکنجے سے باہر کھینچ کر آزاد کرا دے۔

واقعہ یہ تھا کہ موضع بڈھ بیر میں سید رحیم شاہ کے فرزند کی رسم ختنہ منعقد ہو رہی تھی۔ اس میں شمولیت کرنے کے لئے حضور بادشاہ جاںؒ کو دعوت دی گئی تھی۔ اور ان کے ہمراہ ہم لوگ بھی تھے۔ ہم نے دو عدد تانگے کرائے پر لئے تھے۔ اور میں حضور بادشاہ جانؒ کے ساتھ تانگے کی اگلی نشست میں بیٹھا تھا۔ جس تانگے میں ہم سوار تھے۔ سوء اتفاق سے اس کی گھوڑی اڑیل تھی۔ وہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر۔۔ چلتے چلتے۔۔ یکا یک رک جاتی اور کھڑی ہو جاتی۔ اور اگر کوچوان دو چار تازیانے رسید کرتا تو دولتیاں جھاڑنا شروع کر دیتی۔ یہ تماشہ ملاحظہ کر کے میں نے یہ بکمال لاابالی پن چپکے سے کہہ دیا۔ کہ ”بچاری گھوڑی تنگ آ گئی۔ تو۔۔ مجبوراً دولتیاں جھاڑنا شروع کر دیں“ میں نے بات ختم نہ کی تھی۔ کہ برجستہ حضور بادشاہ جاںؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

”تو کیا کرے گی۔۔؟ اپنی ٹانگیں توڑ دے گی؟“

اس ارشاد عالی کو سن کر۔۔ میں چکرا گیا۔۔ مگر چوٹتے ہی میرے شیطان نے نفس امارہ کو اور نفس امارہ نے میرے ذہن کو یہ بات سجھائی کہ ”حضور بادشاہ جاںؒ کا ارشاد صحیح ہے۔ لیکن کیا یہ کوچوان کی بے تدبیری پر دال نہیں کہ آخر اس نے کیوں گھوڑی کو مارنے پیٹنے پر ایسا آموختہ کیا ہے۔ کہ اب صرف ”اشارہ“ پا کر کام نہیں دیتی۔ حتیٰ کہ نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی ہے۔؟“ حضور بادشاہ جاںؒ نے تبسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

”گھوڑی۔۔ اور۔۔ انسان۔۔ کی عقل و دانش میں کافی فرق ہوتا ہے۔“

سبحان اللہ! خدا گواہ ہے کہ ان عالی ارشادات کو سن کر میرے قلب میں اطمینان کا دیا روشن ہو گیا۔ اور موضع بڈھ بیر تک وہ کیفیت بحال رہی۔

حق۔۔یا۔۔کیمیا

1933 میں چند دوستوں کی صحبت میں مجھے بھی کیمیا کا چسکہ لگ گیا۔ حضور بادشاہ جانؒ کو معلوم ہوا تو حسب قاعدہ مبارک براہ راست تو مجھے کچھ نہ فرمایا۔ البتہ دوران گفتگو۔۔دوسری باتوں کے ذیل میں اشارتاً اس شغل کی مخالفت فرماتے۔ ایک موقعہ پر جب ہم جمرود گئے تھے۔ تو وہاں ملا شیر محمد (مولوی شیر محمد عرف تیراہ ملا حضور بادشاہ جانؒ کے خلیفہ تھے۔ اور 1958ء میں پردہ کر گئے تھے) کے مریدوں کے مہمان تھے۔ ایک روز میں اور حضور بادشاہ جانؒ حضرت ولی بابا قدس سرہٗ کے مزار کی زیارت کرنے کے لئے روانہ ہو گئے (حضرت ولی بابا قدس سرہٗ کا اسم گرامی فقیر محمد قدس سرہٗ ہے۔ آپ حضرت خواجہ خواجگان غریب النواز معین الدین سنجریؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ حضرت خواجہ غریب النوازؒ کے خلفاء کی فہرست میں حضرت فقیر محمد قدس سرہٗ مدفون جمرود کا نامی مذکور موجود ہے)

خیر تو زیارت سے فارغ ہو کر جب مزار کے احاطے سے باہر نکلے۔ تو حضور بادشاہ جانؒ ایک بڑے سے چوڑے پتھر پر تشریف فرما ہوئے۔ قریب ہی میں بھی نیچے بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں حضور بادشاہ جانؒ نے مجھے مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کیمیا کے بڑے شائق ہو!''

میری نگاہ پھسل گئی۔ اور سر جھکا کر کچھ نہ بولا۔ چنانچہ حضور بادشاہ جانؒ نے دوبارہ ارشاد فرمایا کہ:۔

''اگر یہ سچ ہو تو تم بے فائدہ کوشش کیوں کرتے ہو۔ مجھے کیوں نہ کہا؟ تاکہ میں تمہیں صحیح نسخہ بتاتا''۔

یہ سن کر میں نے سر اٹھایا۔ اور عرض پرداز ہوا۔ کہ'' کیا حضورؒ خوش طبعی فرماتے ہیں۔؟'' یہ بات سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے پوری سنجیدگی سے ارشاد فرمایا کہ۔'' بخدا! یقین جانو۔۔کہ تین عدد کیمیا کے کامیاب ترین نسخے مجھے یاد ہیں۔ اور ان میں سے جو بھی تمہیں پسند ہو ہر وقت لے سکتے ہو''۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ'' حضورؒ! سچ کہہ دوں تو میں آپ کی خدمت اقدس میں یہ خیال لیکر آیا تھا' کہ آپ مجھے اس قابل بنا دیں گے۔ کہ میں یاد حق سبحانہ وتعالیٰ میں محو ہو جاؤں گا۔ اب اگر آپ از راہ کرم گستری یہ دولت عطا فرما سکتے ہوں۔ تو فبہا یہ نورٌ علیٰ نور! ہوگا۔ اور کیمیا کے نسخے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن! اگر یہ ناممکن ہو۔ تو بسم اللہ! خدا نہ سہی دنیا سہی!''

اس گزارش سے حضور بادشاہ جانؒ محظوظ بھی ہوئے اور متاثر بھی۔ چنانچہ اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

شک نہیں اور بلاشبہ بہت کم لوگوں نے مجھے ایسی بات کہی ہوگی۔ ورنہ فی الواقع جو لوگ میرے پاس

آتے ہیں تو ان میں اکثریت طالبان دنیا کی ہوتی ہے۔ بہت بہتر حمزہ! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری خواہش پوری کر دوں گا''

شغل کیمیا گری کا تذکرہ:۔

اسی نشست میں دوران گفتگو کشمیر بادشاہ اور خواجہ راجہ سائیں صاحبؒ کا تذکرہ بھی آ گیا تھا۔ حضور بادشاہ جانؒ نے اسی محل میں کشمیر بادشاہ کے کیمیا سے شغف اور حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کا ان کی سرزنش فرمانے کا حوالہ دیا۔ جس کا ذکر اسی کتاب میں ہو چکا ہے۔ بہر حال حضور بادشاہ جانؒ نے آگے یہ ارشاد بھی فرما دیا تھا کہ:۔

''جب میں کشمیر جا رہا تھا تو اس وقت ایک تولہ سرخ سنکھیا بھی میرے پاس تھا۔ جو میں نے کیمیا کے نسخے کے لئے کسی سے حاصل کیا تھا۔ جب ''میں کوہالہ آیا اور پل کی دوسری جانب پہنچا تو وہاں پر تھانیدار نے ایک سپاہی کو حکم دیا'' اس شاہ صاحب کی تلاشی لی جائے'' میرے پاس تھوڑا سا سفید سنکھیا بھی تھا۔ چنانچہ سفید سنکھیا تو میں نے ظاہر کر دیا۔ مگر سرخ کو نسوار کی ڈبیہ تلے ہتھیلی میں چھپا دیا۔ اور ڈبیہ کھول کر نسوار منہ میں ڈالنے لگا۔ لہٰذا سپاہی سفید سنکھیا کے علاوہ کچھ اور برآمد نہ کر سکا۔ اور باوجود یہ کہ تھانیدار کی مجھ سے شناسائی تھی۔ مگر اس وقت آنکھیں بدل کر بڑی بے التفاتی سے پیش آ رہا تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ'' شاہ صاحب! چونکہ تمہارے قبضے سے سنکھیا برآمد ہوا ہے اس لئے مجبوراً میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔ اور اب تمہیں مظفر آباد جانا ہوگا'' میں نے اسے کہا کہ'' فی الواقعہ سنکھیا میرا نشہ ہے۔ اس کے بغیر میرا گزارہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ میں اس کا عادی ہوں''۔

تھانیدار کسی عذر کو منظور نہیں کر رہا تھا۔ اور مجھے مظفر آباد لے چلنے پر برابر مصر تھا۔ حسن اتفاق سے اس وقت میرے پاس چند روپے موجود تھے۔ ان میں سے کچھ تو میں نے تھانیدار کو دیدیئے۔ اور کچھ اپنے پاس بھی رہنے دیئے۔ بارے تھانیدار سے رہائی ہوئی۔ میں چلا گیا۔ اور جس وقت حضور سائیں صاحبؒ کی پاک بارگاہ میں حاضر ہوا۔ تو انہوں نے اپنے فرزند ارجمند کو ارشاد فرمایا۔ کہ ''اکبرؒ! مظفر آباد کے پولیس افسر کو ایک چھٹی لکھ دو --- اور لکھو --- کہ لوگ کیوں ہمارے مہمانوں کو تکلیف دیتے ہیں''

غرض یہ کہ حضرت شیخ سائیںؒ صاحب نے تھانیدار کی حرکت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ لیکن تعجب ہے۔ کہ مجھے کیمیا کا شوق پورا کرنے کے لئے سنکھیا رکھنے پر کچھ نہ فرمایا۔ البتہ اس بارے میں حضور سائیں صاحبؒ کے وقتاً فوقتاً ارشادات کے طفیل آہستہ آہستہ میرے سامنے سے پردے ہٹتے گئے۔ اور کیمیا کے شوق میں کمی آتی رہی۔

اس کے دوسرے دن صبح جب کشمیر بادشاہ کا ذکر آیا تو اسے سخت ست کہنے کیساتھ ساتھ حضور سائیں صاحبؒ نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔ کہ ''ذہب بنانا فقیر کے مذہب میں شرک اور شریعت کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کیمیا کی اکسیر سے اجساد کے بنیادی وجود منقلب نہیں ہو سکتے۔ البتہ ان کا رنگ تبدیل کر دیتی ہے۔ لیکن یہ رنگ بھی اسی ۸۰ برس سے زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ ہر شے اپنی اصلی حالت کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اب رہے وہ مہوس جن کا یہ دعویٰ ہے کہ تانبا یا فضہ اکسیر کے ذریعے سے اصلی سونا بن جاتے ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں''۔

کیمیا کی اصلیت:۔

مگر ان تنبیہات اور عالی ارشادات کے باوجود میں برسوں اسی طلب میں سرگردان رہا۔ اس دوران میں میں نے کئی تجربے کئے۔ کچھ دیکھا کچھ سنا مگر اس سارے گورکھ دھندے کی حقیقت بس اسی قدر ہے کہ جہاں تک اجساد کو رنگ دینے کا تعلق ہے۔ تو یہ ممکن ہے بلکہ یہاں تک ممکن ہے کہ یہ رنگ شورے کے تیزاب سے بھی محو نہیں ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے کسی جسد میں سونے کے برابر وزن نہیں ہوتا۔ اہل صنعت نے سونے کا وزن سو فیصد مقرر کیا ہے۔ سونے سے ذرا کمتر درجے کا وزن پارے کا ہے اور اس کا وزن ستر یا اسی فیصد کے لگ بھگ ہے۔ گویا اگر کوئی کیمیا گر پارے کو رنگ دے کر صراف کے پاس لے جائے تو اس سے وہ دھوکہ کھا سکتا ہے۔

بہرحال ان معروضات کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا۔ کہ حضرت شیخ سائیں محمد عظیمؒ کا طریقہ من وعن حضور بادشاہؒ نے اپنا لیا تھا۔ یہاں تک کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہ تھا۔

حضور بادشاہ جانؒ کی حکمت عملی:۔

حضور بادشاہ جانؒ اپنے بعض مریدوں کی عادتوں کو حکمت عملی سے بھی بدلایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض لوگوں پر توجہ کا اثر بامقصد اور مؤثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اگرچہ ویسے تو جملہ نفوس ایک ہی چیز ہیں۔ لیکن ہر نفس کی انفرادی صفت اور محور دوسرے نفس سے مختلف اور جداگانہ ہوتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ کہ اگر ان کو محبت کی توجہ دی جائے۔ تو ردعمل کے طور پر ان کے قلوب میں کراہت اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایسے ہی لوگوں کو نفرت کی توجہ دی جائے تو نتیجے کے طور پر ان کے دلوں میں غصہ اور قہر وغضب جنم لے لیتے ہیں۔ فی الواقعہ ایسے لوگوں کے نفس فطری طور پر باغی ہوتے ہیں۔ ان کا خمیر خودی نیاز اور تسلیم سے خالی ہوتا ہے۔ لیکن ان کی خواہش یہ ہوتی ہے۔ کہ باقی لوگ ان کے آگے سر تسلیم خم رکھا کریں۔

حضور بادشاہ جاںؒ کے بعض منچلے مرید:۔

اور تو اور حضور بادشاہ جاںؒ کے مریدوں میں بعض ایسے منچلے بھی موجود تھے۔ جو محض اس غرض سے حضور بادشاہ جاںؒ کے حلقہءارادات میں شامل ہو گئے تھے۔ کہ حضور بادشاہ جاںؒ سے مخلوق خدا کو مسخر کرنے کی ترکیب سیکھ لیں۔ مگر حضور بادشاہ جاںؒ کا قاعدہ مبارک یہ تھا۔ کہ ان کے فساد سے عوام الناس کو بچانے کے لئے اس قسم کے اشغال اور مجاہدات میں مصروف رکھتے۔ مثلاً اسی نوعیت کے ایک مرید کو ارشاد ہوتا کہ:۔

''کہ حضرت خواجہ خواجگان غریب النواز معین الدین حسن سنجریؒ کے دربار میں اپنی روحانیت کے ذریعے رسائی حاصل کرلو۔ اور وہاں سے جو حکم صادر ہوا کرے تو وہی حکم ہمیں پہنچا دیا کرو''۔

چنانچہ ایسے حضرت کو یہ زعم ہوتا کہ گویا وہ واقعی طور پر اس قابل ہے کہ گویا۔۔ اپنی روحانیت کے ذریعے۔۔ براہ راست حضرت خواجہ غریب النوازؒ کے دربار عالی میں پہنچ سکتا ہے۔ اب وہ تصور ہی تصور میں ایک دربار کا نقشہ جما لیتا۔ پھر ایک تخت شاہی کا تصور کر لیتا۔ ساتھ ہی حضرت خواجہء غریب النوازؒ کو تاج خسروانہ سر مبارک پر رکھے ہوئے تخت نشین تصور کر کے ان کے دربار میں اپنے آپ کو بھی حاضر تصور کر لیتا۔ اس کے بعد تصور ہی میں عرض ومعروض اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا۔ اور پھر ساری روئیداد حضور بادشاہ جاںؒ کے گوش گزار کرتا۔ حضور بادشاہ جاںؒ بھی اس کی دلداری کی خاطر ایسی کسی بات کی تردید نہ فرماتے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی مشق سے ایسے مرید کو بھی فائدہ ہوتا اور وہ فائدہ یہ ہوتا کہ اس کے تصور اور ارادے کی قوت مضبوط ہو جاتی اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا کہ وہ عبادات کو اور زور دیتا۔ اور اس طرح اس کے پاس شرارتوں کے لئے وقت بھی باقی نہ رہتا۔ لہذا ان کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی۔

بنیادی اور اساسی صفت:۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہر انسان کا رب ہوتا ہے۔ اس ضمن میں میں نے گزشتہ اوراق میں بھی کچھ نہ کچھ تذکرہ کیا ہے۔ مختصر اور آسان لفظوں میں یہاں کہہ دیں گے۔ کہ ہر انسان کی تخلیق حق سبحانہ وتعالیٰ کے ایک اسم پر ہوئی ہوتی ہے۔ اور اسی اسم پر اس شخص کی بنیادی صفت کا مدار ہوتا ہے۔ پھر یہی اسم اس کی بقایا صفتوں کے لئے بھی اساسی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

مدعا یہ کہ جب تک اسی بنیادی اور اساسی صفت کیمطابق اس انسان کی تربیت نہ کی جائے تو کسی قسم

کی کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ بنابریں ایک مرشد کامل ہر انسان کی اساسی اور محوری صفت کو ملحوظ خاطر رکھ کر اس کی تربیت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسے سالک کو لے لیجئے۔ جس کا رب۔۔۔ اسم قھار ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے سالک کے جملہ فطری صفات اسی محوری صفت کے تابع ہوں گے۔ امر بھی مخفی نہ ہوگا۔ کہ جس انسان کی بنیادی صفت قھار ہو۔ تو فطری طور پر رحمٰن۔ یا رحیم کی صفتیں اپنانا اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہوگا۔ لہٰذا مرشد کامل لازمی طور پر اس کی تربیت اس اسلوب سے کرے گا۔ کہ ایسے شخص کی قہاریت ظلم وتشدد کی طرف نہیں۔ بلکہ عدل وجلال کی طرف متوجہ کرے گا۔ اور ایسی تربیت میں اس کی قہاریت کسی بے گناہ پر نہیں۔ بلکہ کسی ظالم وجابر پر صاعقہ فگن ہو گی۔

قہار بمعنی عدل گستر:۔

یادرہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اگر قہار ہے تو اس کے یہ معنے ہرگز نہیں کہ جیسے کوئی انسان قہر آلود ہو کر آپے ہی سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور متغیر ہو کر غیض وغضب سے اس حد تک مغلوب ہو جائے کہ رحم و کرم کی صفات کو بھی رخصت کر دے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی قہاریت عدل گستری اور دادرسی کا دوسرا پہلو ہے۔

کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ جب کسی کو سزا دیتا ہے۔ تو اس کی صورت تو ایسی نہیں ہوتی۔ جیسے ہم طیش میں آ کر کسی پر غصہ ہوتے ہیں۔ اور اپنی نفسانی خواہشات کے زیر اثر اس سے انتقام لیتے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ کا کسی کو سزا دینے کا منشاء محض اجرائے عدل اور مجرم کی اصلاح ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصلاح کے بغیر عدل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر چہ بظاہر یہ قہر ہی نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت میں عدل ہوتا ہے۔ دیکھئے لوہا اس غرض سے آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ کہ اس سے کوئی کارآمد برتن یا اسلحہ وغیرہ بنانا مقصود ہوتا ہے۔ اگلے وقتوں میں لوہے سے آئینے بنائے جاتے تھے۔ اور اگر ان پر زنگ آ جاتا ہے۔ تو دوبارہ صیقل کئے جاتے فافہم!

مجاہدے کی منشاء:۔

ہر انسان کے اساسی اسم رب کے متعلق جاننا چاہئے۔ کہ انسان میں اور بھی کئی صفات ہوتے ہیں۔ جن کو بنیادی اسم رب کے مقابلہ میں اضافات کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی اضافی صفات انسان کے محوری اسم رب پر غالب ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر مجاہدے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ سالک کا بنیادی اسم رب مابقیہ تمام اضافات پر غالب ہو جائے۔ اور جب تک یہ مقصود پورا نہ ہوگا۔ تربیت کی اصل غایت حاصل نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ تو سالک اضافی صفات کے مختلف تقاضوں اور مختلف

تحریکوں سے نجات پا سکتا ہے اور نہ ہی وحدت فکر حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات صوفیہ رحمہم اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:۔ **التوحید ترک الاضافات۔**

مرشدان کامل کی منتہائے نظر:۔

مندرجہ بالا معروضات کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کامل مرشد کی صحبت میں تربیت دینے کا تمام تر مقصد بس یہی ہوتا ہے کہ کوئی شخص نیک اختر اور خوش خصال ہو جائے۔ یا بد اختر اور بد خصال ہو جائے۔ بلکہ منشا یہ ہوتا ہے۔ کہ ہر انسان کی اتنی اصلاح ہو جائے۔ کہ اس کی اساسی صفت دیگر اضافات سے مغلوب نہ ہو جایا کرے۔ اس لئے کہ انسان اسی دنیا میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی نیابت کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ نے جس انسان کو جس کام کے لئے پیدا فرمایا ہوتا ہے۔ تو کامل مرشد کی منتہائے نظر بھی اسی چیز پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کامل مرشد اس کی تربیت اس پیرائے میں کرتا ہے۔ کہ اس کی تخلیق کا اصلی مقصد فوت نہ ہو جائے۔
یہاں پر یہ بھی یاد رہے کہ اگر کوئی کامل انسان کسی ایسے شخص کو نیکی کی طرف مائل کر دے۔ جو محض شیطنت کے لئے پیدا ہوا ہو تو کامیابی تو رہی ایک طرف بلکہ ایسا کرنے سے برعکس نظام دنیا میں ابتری اور انتشار پھیلے گا۔ وجہ یہ ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے منفی اور مثبت ہر دو طاقتیں تخلیق فرما دی ہیں۔ اور جب یہ دونوں موجود نہ ہوں۔ تو دنیا کا نظام نہیں چل سکے گا۔ نہ ہی نیکی اور بدی یا خیر وشر کا معیار قائم ہو سکتا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ دنیا کا نظام ہی اضداد پر قائم ہے۔

ابوجہل اور فرعون کی مثال:۔

یہ بھی مدنظر رہے کہ اضداد کا اصول سلب اور تحویل ہے آپ نے پڑھا.......ہوگا۔ کہ ابوجہل پر رسول کریم ﷺ کی تبلیغ کا یہ اثر ہوا۔ کہ اس نے اپنے کفر میں مزید شدت اور زیادہ سختی اختیار کی۔ اور بعثت نبوت و رسالت محمدی ﷺ سے تو ابوجہل کے کفر میں پرلے درجے کی انتہائی شدت آ گئی۔ بالفرض! اگر ابوجہل کے زمانے میں نبوت نہ آتی تو اس کے کفر کا جذبہ عام حالت سے تجاوز نہ کرتا۔
مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جب تک کفر کی ضد ظاہر نہ ہوگئی تھی۔ تو کفر کا تمرد اور اس کی سرکشی آشکار نہ تھی۔ لیکن جونہی اسلام آیا۔ تو کفر کا تقابل بھی انتہائی طاقت کے ساتھ ظاہر ہوا۔
اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کی طرف مبعوث فرمایا جانا تھا۔ اور جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت فرعون کے کفر کے مقابل ہوئی اور ان دونوں میں تصادم ہوا تو تب ہی عام انسانوں کی فطرتوں میں جذبۂ ایمانی نے انگڑائی لی۔

باب (۷)

کرامت

لفظ کرامت کے لغوی معنی:۔

لغوی طور پر کرامت عزت‘ بزرگی اور مہربانی کو کہتے ہیں۔لیکن اگر ہم اس لفظ کے مفہوم پر غور کریں۔تو جان لیں گے۔کہ کرامت مخلوقات میں متصور ہونے والی وہ نسبت ہے جو کوئی مخصوص و متعین وجود نہیں رکھتی بلکہ اگر وہ نسبتی حیثیت منتفی ہو جائے۔تو پھر کرامت کی نسبت ہی سے منسوب ہو سکتی۔

اس کی مثال یہ ہوگی۔کہ نباتات‘ جمادات کے مقابلہ میں زیادہ مگر حیوانات کے مقابلہ میں کم قابل قدر ہیں۔پھر عام حیوان انسان کے مقابلے میں کوئی عزت و بزرگی نہیں رکھتا۔اسی طرح انسانوں میں عالم و فاضل انسان جاہل کے مقابلہ میں زیادہ صاحب کرامت و صاحب عزت ہوتا ہے۔اسی طرح نیک انسان برے انسان کے مقابلہ میں اہل کرامت متصور ہوتا ہے۔لیکن اگر کسی نیک انسان کے نیک خصائل قائم نہ رہ سکیں۔اور اسی انسان کو کسی بد خصائل انسان کے مقابلے میں لے آیا جائے۔تو ظاہر ہے۔کہ پھر صاحب کرامت نہ ہوگا۔

اصطلاحی تحقیق:۔

اصطلاحی لحاظ سے جس چیز سے کرامت مراد ہے۔اور جو خواص اور عوام میں بھی متصور ہے۔وہ اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی کرامت ہے۔یہی کرامت مسلمانوں کے اکثر فرقوں میں مؤمن بہ ہے۔اور یہی چیز جب اولیاء اللہ سے منسوب ہوتی ہے۔تو کرامت کہلاتی ہے۔لیکن !اگر کسی نبی اللہ سے منسوب ہو تو معجزہ کہلائے گا۔

باوجود یہ کہ معجزہ اور کرامت کی شکل ایک ہی ہے۔نبی اور ولی اللہ ہر دو الہام کے مورد ہوتے ہیں۔مگر نبی کے الہام کے ذرائع زیادہ مفصل ہوتے ہیں۔اور ولی کے الہام کے ذرائع کم مفصل اور مجمل ہوتے ہیں۔

اعجازی وراثت:۔

قرآن کریم میں الہام کے تین اقسام کا ذکر ہے۔(۱) وحی۔(۲) من وراء الحجاب۔(۳) نزول فرشتہ۔مؤخر الذکر صرف نبی کے لئے مختص ہوتا ہے۔اول الذکر اور ثانی الذکر میں اولیاء اللہ کا بھی

حصہ ہوتا ہے۔ مگر یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہ السلام شریعت لاتے ہیں۔ اور یہ شریعت طریقت، حقیقت اور معرفت کی جامع ہوتی ہے۔ اسی نبی کی امت کے اولیاء اس کے صحیح معنوں میں خلفاء اور برزخ ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ اپنے نبی کی لائی ہوئی شریعت کو جاری کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اور اسے دنیا میں عام بھی کرتے ہیں۔

جس طرح اولیاء اپنے مقتدا نبیوں کی لائی ہوئی شریعت میں خلفاء اور برزخ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ولایت میں ان کے معجزات میں بھی ان کے برزخ ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ اولیاء اللہ رحمہم اللہ انہی انبیاء علیہ السلام کے علوم کو ولایت وخلافت کے لباس میں عوام الناس کو پیش کرتے ہیں۔ یہی اولیاء اللہ انبیاء اللہ علیہم السلام کے اصل اصول کے بطون کی شرح کرتے ہیں۔ اور پھر اسے عوام الناس کی سمجھ، عقل اور استعداد کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ بنا بریں انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ رحمہم اللہ کے برازخ کو ایک اعجازی وراثت کے طور پر منتقل ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح نبوت کا اعجاز ولایت کے قالب میں ڈھل کر ولی کی کرامت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور بعد ازیں ان کے وجود سے ایسے ایسے کارہائے نمایاں ظاہر ہوتے ہیں۔ جو وقت کے لحاظ سے کسی عام انسان کے بس سے باہر ہوتے ہیں۔

مگر یاد رہے کہ ایسے کارہائے نمایاں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خلاف فطرت یا اس سے ماوراء ہوتے ہیں۔ بلکہ حقیقت اسی قدر ہے کہ اپنے عصر کے لحاظ سے ہر ایک ولی اللہ دوسرے تمام انسانوں کے مقابلہ میں ذہنی، اخلاقی اور عقلی لحاظ سے بدرجہا بڑھا ہوا اور ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ اور نیز اس کی کرامت بھی اس امر کی پختہ دلیل ہوتی ہے۔ کہ اس کی پیروی کرنے میں اس زمانے کے انسانوں کے لئے خیر و برکت اور سعادت مندی کا راز مضمر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس کے علوم وافکار سے کما حقہ، استفادہ حاصل کرنا اشد ضروری ہوتا ہے۔

لیکن ہر چیز کی عزت و بزرگی اس کے وجودی صفات سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ قطعی نہیں ہوسکتا۔ کہ کسی چیز کی مخصوص عزت دوسری چیز کے لئے لازمی ہو۔ بلکہ عین ممکن ہے۔ کہ ایک چیز کی عزت دوسری کے لئے ذلت کا باعث ہو۔

مبالغہ آمیز کرامتوں کا ذکر:۔

ہمارے قدیم تذکروں میں اولیاء اللہ قدس اسرارہم کی کرامتوں سے متعلق جو بیانات مندرج ہیں۔ وہ زیادہ تر مبالغہ آمیزی پر مبنی ہیں۔ اور حقیقت میں وہ کرامت جو ایک ولی اللہ کی شایان شان ہوتی ہے ایسی کرامت کا تذکرہ برائے نام یا بہت ہی کم ہوا ہے۔ ہمارے تذکرہ نویسوں نے عموماً ایسی کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً فلاں ولی نے پہاڑ کو اشارہ کیا تو اشارہ پاتے ہی پہاڑ

دوڑنے لگا۔ یا یہ کہ ایک ولی بیچ دریا میں مصلےٰ پر تشریف فرما تھے۔ اور یا یہ کہ مصلیٰ ہوا میں معلق تھا۔ اور حضرت اوپر ہی مصروف نماز تھے۔ وعلیٰ ہذا القیاس ۔۔ ہر چند۔۔ اگر چہ یہ سب بحیثیت مجموعی غلط نہیں ہیں۔ لیکن ان کی روایت کی صحت قابل غور ہے۔ دوسری طرف اس سائنسی دور میں لوگوں کی اکثریت سرے سے ان حقائق کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔

سر سید احمد خان اور مرزا غلام احمد کی تاویلات:۔

یہی وجہ ہے۔ کہ سر سید احمد خان اور مرزا غلام احمد قادیانی صاحبان نے اسی قسم کی باتوں سے یا تو صاف انکار کر دیا اور یا ان کی تاویلات پیش کیں۔ عجب یہ کہ ایسا کرنے سے انہوں نے اپنے خیال میں ان اعتراضات کا دفعیہ کر لیا۔ جو نیچری یا ایسے ہی دوسرے لوگ اسلام پر کرتے ہیں۔ گویا ان ہر دو حضرات نے اس بات کو عملی طور پر ثابت کر دیا۔ کہ اسلام مادیت کے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتا۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں ان دونوں حضرات نے سخت ٹھوکر کھائی۔

انکار کا ردعمل:۔

بلا شبہ کرامات ومعجزات کی اکثریت جن کو لوگ بیان کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کے اندر حقیقت کا رنگ موجود نہ تھا۔ لیکن ایسا بھی تو نہ تھا۔ کہ وہ سب کے سب بنیادی طور پر غلط۔ خلاف عقل یا محض ڈھکوسلے تھے۔ مدعا یہ کہ ان کی حقیقت یقیناً موجود تھی۔ لیکن بجائے اس کے کہ مذکورہ بالا ہر دو حضرات اصولی طور پر معجزہ اور کرامت کی مسلمہ حقیقت کو تسلیم کر لیتے۔ انہوں نے سرے سے انکار کر دیا۔ اور انتہا یہ کہ نصوص کو تاویل کا رنگ دے کر اپنے خیال میں ان کو عام انسانوں سے منوانے کا اہل کر دیا۔

اس طرفہ طرز عمل سے یہ حضرات اسلام کی حقانیت کو تو ذرہ برابر بھی ثابت نہ کر سکے۔ نہ ہی مخالفین۔ ملحدین اور مادئین کو قائل کر سکے البتہ اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں ہی کی نئی پود نے اسلام سے برگشتہ ہو کر راہ فرار اختیار کی۔ اور نتیجہ کے طور پر آج یہ حالت ہو گئی ہے۔ کہ ہمارے نوجوان اسلام کے زرین اصولوں کو دنیا کے ہر اصول سے پست تر اور کمتر تصور کرتے ہیں۔

مادئین کا تفاخر:۔

اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مادئین کا کہنا ہے کہ ''ہم ایک ہی ڈائنامنٹ سے پوری پہاڑی کو بیخ و بن سے ہلا کر مسمار کر سکتے ہیں۔ ہوا میں اڑنا ہمارا معمولی شغل ہے اور ہوا تو کیا چاند پر جا بسنے کے ارادے ہیں۔ نیز عناصر ہماری مٹھی میں ہیں۔ اور اسی طرح ہماری روز افزوں کوششیں جاری

ہیں۔تاکہ حیات پر اجارہ داری قائم کرلیں''۔
اور واقعی دیکھا جا سکتا ہے۔ کہ آج کل کی طبی سائنس نے یہ کرشمہ بھی دکھادیا۔ کہ انسان کے ازکا
رفتہ اور گلے سڑے اعضاء کی سرجری کر کے ان کو ہٹا دیا۔ اوران کی جگہ دوسرے صحت منداعضا
نصب کردیئے۔ اوراب یہ کوشش ہورہی ہے کہ موت کو درمیان سے یکسر نکال دیں۔

یہ کہتے تو بات بنتی :۔

ان حقائق کی روشنی میں چاہیئے۔ تو یہ تھا کہ سرسید احمد خان اور مرزا غلام احمد یا ایسے ہی دوسرے
حضرات تاویلات پیش کرنے سے گریز کرتے۔ بلکہ اسلام کی اصلی روحانی اور اخلاقی قدروں کو
دنیاکے سامنے منظرعام پرلاتے۔ مگر متاسفانہ انہوں نے معجزہ اور کرامت سے قریباً انکار ہی کردیا۔
اگر وہ یہ کہتے کہ اس بسیط کائنات میں ایسے کئی امور۔ کئی موجودات اور مخلوقات موجود ہیں۔ جن
کے متعلق ہمیں ابھی تک کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ اور مزید برآں بے شمار چیزیں ایسی ہیں۔ جن کو
ہم وجوداً تو محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان کی وجودی کیفیت اور صحیح معرفت کے بارے میں ہماری
معلومات صفر کے برابر تو کیا ہیچ ہیں۔ جیسے بجلی یا روشنی یا کشش ثقل وغیرہ ہوئے۔ چنانچہ وقت
گزرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی اور مادی۔ ارتقاء خود بخود معجزہ اور کرامت کی حقیقت کو ثابت بھی کرتا
اور آشکار بھی۔ معاً معترضین کے اعتراضات کا دفعیہ بھی ہوتا۔
غور فرمائیے اگر موجودہ زمانے کے جدید آلات وایجادات پرانے زمانے میں معرض وجود میں
آتے تو کیا عہد قدیم کے لوگ ان کو کرامتوں سے منسوب نہ کرتے؟۔

این ہا ہمہ غیب است کہ معلوم عوام است

مادہ کی تعریف میں تضاد:۔

لیکن جہاں تک مادئین کا بھی تعلق ہے۔ تو ان کی یہ حالت ہے کہ کل تک وہ ایک ٹھوس اورقوی
اصول کے طور پر اس بات پر یقین رکھتے تھے۔ کہ''مادہ ایک ایسی چیز ہے۔ کہ نہ تو کوئی اس کے
ایک ذرہ کو پیدا کرنے پر قادر ہے اور نہ ہی کسی کو یہ قدرت حاصل ہے کہ اس کو فنا کردے۔'' لیکن
سنیئے صاحب! وہی مادئین آج کیا کہتے ہیں؟ کیونکہ اب ان کا قول یہ ہے کہ''مادہ تحلیل ہونے کے
بعد قطعی طور پر توانائی میں تبدیل ہو کر بالکل فنا ہو جاتا ہے۔ اور کسی کے ہاتھ نہیں آتا۔ حتیٰ کہ دوبارہ
اس کا تحلیل اور تجزیہ بھی نہیں ہو سکتا اور جہاں تک توانائی کا تعلق ہے۔ تو یہ بذات خود ایک غیر فعال
چیز ہے۔ اس لئے کہ اس کا تمام تر مدار محرک پر ہے۔ اور اگر محرک کی مرضی ہو اور وہ چاہے تو ہوگی
ورنہ نہیں ہوگی''، یعنی مطلب یہ ہوا کہ صفت بغیر موصوف کے کوئی وجود نہیں رکھتی۔

سبحان اللہ! وہ بھی ایک وقت تھا۔ جبکہ حکماء الٰہی رحمہم اللہ کو یہ فرماتے سنا جاتا کہ ''مادہ کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ صفات کے اجتماع کا دوسرا نام ہے'' تو یہ مادئین ان کی ہنسی اڑاتے اوران کو دقیانوسی یا بابا آدمؑ کے زمانوں کے جنگلی مخلوق سے یاد کرتے۔

کرامت کی مختصر مگر جامع تعریف:۔

بہرکیف حقیقت یہ ہے کہ نبی کے معجزے اور ولی کی کرامت کی اصلیت اور معیار یہ ہے کہ ان کے وجود سے بنیادی طور پر انواع و اقسام کے علوم و دقائق اور حقائق کا اظہار اس حیثیت سے ہو جائے۔ کہ ان کے دور میں کسی بھی دوسرے انسان سے اسی طرح سے ممکن نہ ہو۔

اولیاء اللہ کا ارادہ:۔

یہاں پر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ بے شک اولیاء اللہ کا ارادہ بھی انبیاء اللہ علیہم السلام کے ارادے کا عین عکس ہوتا ہے۔ اور آیت مبارک **وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ**۔ (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جب تم نے (میدان جنگ میں مٹھی بھر خاک) پھینکی تو در حقیقت یہ تم نے نہیں پھینکی تھی۔ خدا نے پھینکی تھی)) کے رو سے انبیاء علیہم السلام کا ارادہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے نیز ایک حدیث قدسی میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ۔

''میرا بندہ کثرتِ نوافل سے میرا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ اور جب وہ میرے قریب ہو جاتا ہے۔ تو میرا محبوب ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں۔ پس وہ میرے ذریعے سے دیکھتا ہے۔ اس کے کان بن جاتا ہوں۔ پس میرے ذریعے سنتا ہے۔ اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں۔ پس میرے ذریعے چیزیں اٹھاتا ہے۔''

تو ایسے لمحات میں کسی نبی یا ولی کا وجود درمیان میں نہیں ہوتا اور اسی اثناء میں جو کچھ بھی صادر ہوتا ہے۔ اسی ذات کبریا جل جلالہ کی جانب سے صادر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب لوہا آگ میں ڈالنے کے بعد سرخ انگارہ ہو جائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس لوہے کے وجود پر بھی انہی احکام کا اطلاق ہوگا۔ جو آگ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ لیکن اگر یہی لوہا آگ سے نکالا جائے تو سرد ہونے پر وہی لوہا ہوگا۔

ایک اور گروہ:۔

بڑی حیرت اور نہایت تاسف کی بات ہے کہ بہت سے اہل حدیث بھی اولیاء اللہ قدس اسرارہم کے بعض خوارق و کرامات سے انکار کرتے ہیں۔ وہ توحید کے ''جذبے'' میں اس حد تک

"تجاوز" کر لیتے ہیں۔ کہ حب جناب رسالت مآب رسول کریم ﷺ بھی ان کے قلوب سے عنقا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کو ایک عام آدمی سے بھی برتر تصور نہیں کرتے۔ دراصل اس قسم کے لوگ مادہ پرست ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے اردگرد کے ماحول اور معاشرے کے خوف سے صاف طور پر اسلام سے انکار کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ ورنہ اگر ان کو اس بات کا یقین نہ آتا ہو۔ تو بصد شوق اپنے تحت الشعور میں تفتیش اور تجسس فرمالیں۔ انشاء اللہ یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے گی۔ کہ وہ یقیناً مادہ پرست ہیں۔

طرفہ یہ کہ مخالفین کا یہی طبقہ کچھ ایسے طریقوں سے اختلاف شروع کرتا ہے۔ کہ بظاہر تو وہ دین کی خدمت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن فی الواقع دین کی جڑیں کاٹ رہے ہوتے ہیں۔

دُوسرا طبقہ:۔

علاوہ ازیں ہمارے دور میں ایک اور طبقہ رسول کریم ﷺ اور ان کی امت کے اولیاء کے ادب میں اس حد تک غلو کرتے ہیں۔ کہ معاملہ شرک کی حدود تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہاں تک کہ ان کو حق سبحانہ و تعالیٰ کی ہر صفت میں شریک کر لیتے ہیں۔

سکر کی باتیں:۔

شک نہیں کہ بعض اولیاء اللہ قدس اسرار ہم نے عشق اور سکر کی حالت میں ایسی باتیں کہی ہیں۔ جو بظاہر خلاف شریعت معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اس ضمن میں بہتر یہ ہے کہ ایسے بزرگوں کو معذور سمجھا جائے وجہ یہ ہے کہ جونہی یہ بزرگ سکر سے صحو کی حالت میں آتے تو وہ خود بخود بھی ایسے کلام پر تاسف کرتے اور ان کا یہ حال ہوتا جیسے حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ نے اپنے مریدوں کو صاف طور پر ارشاد فرمایا تھا۔ کہ اگر بار دگر میں نے سبحانی ما اعظم شانی کہا تو بلا پس و پیش مجھے سنگسار کردو۔ اس قسم کے کلام اور اقوال کو شطحیات کہا جاتا ہے۔ اور ان پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

ایک اور طبقہ اور اس کی پیداوار:۔

اہل حدیث کے بعد ایک اور طبقہ اہل قرآن کا ہے۔ جن کے امام عبد الرحمٰن صاحب چکڑالوی ہیں۔ یہ لوگ قرآن حکیم کے علاوہ ہر قسم کی حدیث نبوی ﷺ کو مومن بہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس نظریئے کا مہلک نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے۔ کہ ہمارے دور میں جبکہ مادیت کا طوفان زوروں پر ہے۔ اس عقیدے کی تائید میں بعض وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے جو عقیدتاً تو ملحد تھے۔ مگر چونکہ اپنے معاشرے کے خلاف چلنے میں انہیں ذلت اٹھانے اور رسوائی سے دوچار ہونے کا اندیشہ تھا۔ اور

نیز ان کے حاصل کردہ علم کے عبث ہونے کا بھی زبردست خدشہ تھا۔ تو لگے ہاتھوں احادیث نبوی ﷺ سے انکار کر کے یہ دعویٰ کر دیا کہ قرآن حکیم میں سب کچھ موجود ہے۔ لہذا احادیث کی کوئی ضرورت نہیں۔

دراصل احادیث نبوی ﷺ سے منکر ہونے میں مصلحت یہ تھی۔ کہ وہ احکام تو قرآن حکیم میں صراحتاً موجود نہ تھے۔ جو ان ملاحدہ کے لئے تکلیف کا سبب ہو سکتے تھے۔ اور اگر کچھ موجود بھی ہیں۔ تو اپنی رائے کو استعمال میں لا کر ان کی تاویلات پیش کر دیئے۔ اور آج جب ان لوگوں کی تحریریں ہماری نظروں سے گزرتی ہیں۔ تو صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ کہ وہ دنیا کو اسلام ایک نئے رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ اس گروہ کے رہنما آج کل غلام محمد پرویز ہیں۔ انہی کے عقائد سے وابستہ ایک صاحب مردان کے ''عرب مُلا'' تھے جو اب فوت ہو گئے ہیں۔

مادیت کی عینک اور کرامت:۔

بہر حال کرامات سے متعلق جہاں کہیں بھی کوئی روایت آ جائے تو یہ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور ایسی تاویلات پیش کرتے ہیں۔ جس کے اپنے ہی متن کی عبارت بھی اس سے بیزار ہوتی ہے۔ کم از کم اتنا تو ہونا چاہیئے۔ کہ تاویل کا مفہوم متن کی عبارت اور مدعا کے قطعی خلاف نہ ہو۔ لیکن خیر ایسے لوگ جو ہر چیز کو مادیت کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ تو ظاہر ہے۔ کہ وہ کب اور کس طرح معجزات اور کرامات کے حقیقی مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔۔۔۔؟

اولیاءاللہ کا ارادہ انائے اکبر کا پرتو ہوتا ہے:۔

ہم اولیاءاللہ کے ارادے کی قوت کا ذکر کر رہے تھے۔ اور اس امر کی وضاحت بھی کرنا چاہتے تھے۔ کہ اولیاءاللہ قدس اسرارہم کا ارادہ رسول کریم ﷺ کے ارادے کے ساتھ ساتھ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے ارادے کا پرتو ہوتا ہے۔ ویسے بھی انسانی وجود کی تمام صفات مجمل طور پر حق سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کے پرتو ہوتے ہیں۔ اشیاء کے لئے زندگی عارض ہے۔ اور حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی حیات ہی کے طفیل ہر شئے میں زندگی کی رمق موجود ہے۔ اگر اشیاء سے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی حیات اور ارادہ کو اٹھا لیا جائے۔ تو اشیاء کی ہستی ہر گز نہیں رہ سکتی۔ یہی حیات اور ارادہ ایک نبی اور ولی میں بھی ہوتا ہے۔ اور ایک عام آدمی میں بھی۔ مگر اس کے باوجود ان دونوں میں اتنا بڑا فرق ہے۔ کہ ان کی آپس میں کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی روح (جو بعض فلاسفہ کے نزدیک ''عین'' ہے۔ اور ہیگل نے اس کو ''فکر'' کے نام سے موسوم کیا ہے) مادی قالب کے حلقہ میں آ گیا ہے۔ جس پر سراسر مادی یا حیوانی

قالب کا بڑا اثر ہے۔ اور اسی بناء پر وہ حیوانیت سے مغلوب بھی ہے۔ لیکن اولیاء اللہ قدس اسرارہم مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعے اسی حیوانی قالب کے اثرات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور ان معنوں میں وہ عام انسانوں کی طرح اس کے تابع اور محکوم نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے برعکس حیوانیت ان کی محکوم ہوتی ہے۔

حیوانی قالب کے مغلوب ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ''انا'' جو ''انائے اکبر'' کا پرتو ہوتا ہے۔ یکا یک روشن ہو کر چمک اٹھتا ہے۔ اور ان کی زندگی اور ارادہ اس قید بلاخیز سے آزاد ہو جاتا ہے۔ جو ان کے لئے حیوانی قالب میں عارض تھا اندریں اثناء ان کا ارادہ خارج میں اس طرح تصرف کر سکتا ہے۔ جیسے کوئی طاقتور مادی وجود کسی دوسرے کمزور مادی وجود میں کرتا ہے۔

ہمارے دور میں بعض مادئین قوت ارادی کے تو قائل ہیں اور مسمیر یزم یا ہپناٹزم کے عاملوں کی قوت تصرف کو بھی کافی حد تک تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ کجا مسمریزم کی قوت ارادی (جس سے اگر کوئی دیوار کے پیچھے چھپ جائے تو سب تصرف بیکار اور نابود ہوگی) اور کجا اولیاء اللہ رحمہم اللہ جو فرش سے لیکر عرش تک اپنے تصرف کو کام میں لا سکتے ہیں۔ پشتو کے مشہور شاعر حضرت عبدالرحمٰن بابا رحمتہ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے۔

چه په یو قدم تر عرشه پورے رسی
مالیدلے دے رفتار د درویشانو

(جو ایک قدم میں عرش تک پہنچ جایا کرتے ہیں۔ میں نے ان درویشوں کی رفتار کا مشاہدہ کیا ہے)

مدعا یہ ہے کہ عاملین مسمریزم نظر اور ہاتھوں کی انگلیوں میں کشش کے ذریعے تصرف اور اثر ڈالنے کی ریاضت کرتے ہیں۔ اور متواتر مشق کرنے سے ان کی انکھوں اور ہاتھوں میں ایک مخفی اور مقناطیسی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اسی مخفی طاقت کے ذریعے معمول پر اثر ڈالتے ہیں۔

کائنات کا آخری ترقی یافتہ وجود:۔

اس کا سبب یہ ہے کہ وجود انسانی میں مادی اشیاء کی نسبت ایٹمی قوت بہت زیادہ ہے۔ اور مصلحت ایزدی کے مطابق یہ اس لئے ضروری تھا۔ کہ انسان ہی کائنات عالم کا سب سے آخری مگر سب سے زیادہ ترقی یافتہ وجود ہے۔ اور اس لئے بھی کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اسی انسان کو دنیائی نظام کو چلانے کے لئے تخلیق فرمایا ہے۔ بنا بریں اس کو دوسری مخلوقات کی نسبت وافر استعداد بھی عطا فرما دی ہے۔ اور ان گنت حکمتوں اور بے شمار حقائق و اسرار کے خزینے اس کے وجود میں پنہاں رکھ دیئے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنا خلیفہ تک فرما دیا ہے۔ (اگر چہ منکرین حدیث اس کو بھی تسلیم نہیں کرتے) علاوہ ازیں خلق آدم علی صورتہ کا معزز ترین خطاب بھی حضرت انسان ہی سے

متعلق ہے۔

سائنسدانوں کا اقرار اور انسانی وجود میں مخفی طاقت:۔

آج کے سائنس دانوں کا بھی یہ دعویٰ ہے۔ کہ کائنات عالم میں جس قدر بھی عناصر تخلیق ہوئے ہیں۔ تو وہ سب کے سب ایک خاص اندازے کے مطابق وجود انسانی میں موجود ہیں اور نیز یہ کہ انسان کے علاوہ کوئی دوسری مخلوق ایسی نہیں ہے جس کے اندر تمام عناصر اجتماعی طور پر موجود ہوں۔ مدعا یہ کہ ایٹمی قوت انسان کے تمام وجود میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور اگر ہم وجود انسانی کے کسی عضو میں یہ قوت بیدار کرنا چاہیں تو تھوڑے سے مجاہدہ اور واجبی ریاضت سے یہ لازوال طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ اور تو اور مادی قید کے اندر رہتے ہوئے بھی یہ آفاقی قوت بیدار ہو سکتی ہے وجہ یہ ہے کہ مسلسل مجاہدہ اور ریاضت کے طفیل مادی کمیت کی طاقت مغلوب ہو جاتی ہے اور ایٹمی کیفیت غالب آ جاتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے کہ موجودہ عصر کے سائنسدانوں نے مادہ کی تحلیل اور تجزیہ سے ایٹمی طاقت حاصل کر لی ہے۔

اولیاءاللہ کی روحانی طاقت اور اس کی نوعیت:۔

لیکن یہ نہ بھولئے کہ اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی طاقت بحیثیت مجموعی روحانی ہوتی ہے۔ وہ مجاہدہ اور ریاضت کی وجہ سے اپنی ''انا'' کو مادی قید سے آزاد کرا دیتے ہیں۔ اور اس قسم کی آزادی کے بعد ان کا وجود کلی طور پر ایٹمی طاقت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مادی قید و بند سے خلاصی پانے کے بعد ان کی ''انا'' جسم ناسوتی کی طرح کسی خاص مکان یا کسی خاص چیز میں مقید نہیں ہوتی۔ بلکہ کائنات عالم میں ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ تمام شش جہت میں وہی سمائے ہوتے ہیں۔

لیکن بہ ایں ہمہ ان کا تعلق اپنے جسم سے بھی ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ذہن نشین رہے۔ کہ ان کی یہ آفاقی حیثیت مستقل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ جسم ناسوتی کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے ان پر قبض کی حالت کا بھی درود ہوتا ہے۔ لیکن جونہی قبض کا دورہ گزر جاتا ہے۔ اور بسط کی حالت وارد ہو جاتی ہے۔ تو ان کے روحانی تصرف کی کوئی حد نہیں رہتی۔ مختصر یہ کہ۔۔۔ یہ ہیں وہ حالات جن سے اولیاء اللہ قدس اسرارہم کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اولیاءاللہ کی حالت بسط اور انکشافات نادرہ:۔

بسط کی حالت میں اگر کوئی شخص کسی ولی اللہ کے سامنے ہوجائے تو اس کے قلبی واردات ۔۔اس ولی اللہ کو صاف طور پر ایسے معلوم ہوجاتے ہیں جیسے ہم کو ظاہری اجسام نظر آتے ہیں۔اس کی دلیل یہ ہے۔کہ جاگنے کی حالت میں جو جو خیالات ہمیں آتے رہتے ہیں۔یا خود ایسا کرتے ہیں۔تو وہ ہمیں محض خیالات ہی نظر آتے ہیں۔لیکن اگر یہی خیالات ہمیں خواب میں آجائیں تو باقاعدہ طور پر ان کو اشکال کی صورت میں محسوس کریں گے۔

ظاہر ہے کہ خواب کی حالت میں ہمارے مادی حواس معطل ہوتے ہیں۔لیکن دوسری طرف مثالی حواس بیدار ہوتے ہیں۔اور یاد رہے کہ مثالی حواس کبھی نہیں سوتے۔اور مادے سے تجرد حاصل کرنے کی بنا پر یہی عالم مثال عالم عقل کے قریب ہوتا ہے۔لیکن صورت قبول کرنے کی وجہ سے عالم شہادت یعنی مادی عالم سے بھی متحد ہوتا ہے۔گویا عالم مثال عالم عقل اور عالم شہادت کے درمیان ایک برزخ ہوتا ہے۔

الغرض جس وقت اولیاءاللہ قدس اسرارہم بسط کی حالت میں ہوں۔تو ان کے مثالی اور عقلی حواس مادی قید سے من حیثت المجموعی آزاد ہوتے ہیں۔اور اسی حالت میں جونہی کوئی آدمی جس قسم کا خیال بھی لیکر ان کے روبرو آجائے۔تو چونکہ ہر خیال ہر چند اشکال سے عبارت ہوتا ہے۔اسی لئے ایک ولی اللہ اسی خیال کی مکمل شکل وصورت صاف طور پر بلا تکلف معائنہ اور ملاحظہ کرسکتا ہے۔اس میں نکتہ یہ ہے کہ لطائف کا ادراک بھی لطائف ہی کر سکتے ہیں۔اور ظاہر ہے کہ اس اثناء میں ولی اللہ کی روح مشاہدہ کی حالت میں ہوتی ہے۔یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیں گے۔کہ سامنا ہوتے ہی آنے والے انسان کا پرتو اس ولی اللہ کے مثالی اور عقلی حواس کے آئینہ پر پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اس شخص کے جملہ خیالات عکسوں کی شکل میں معائنہ کرلیتا ہے۔جیسا کہ حدیث نبوی ﷺ میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔کہ رسالت مآب رسول کریم ﷺ جس طرح سامنے سے کسی چیز کو دیکھتے اسی طرح اپنی پشت مبارک کی طرف سے بھی ملاحظہ فرماتے تھے۔

مہر بہ لب ہونا چاہیے:۔

مگر ان معاملات میں اساسی طور پر اس اصول کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہئے ۔کہ ان مکاشفات کا اظہار علی ای تقدیر۔کسی صورت میں بھی نہ کیا جائے۔اور جس قدر بھی ان کو پوشیدہ رکھا جائے اسی قدر منزل میں مزید ترقی حاصل ہوگی۔اور میں اپنے تجربے کی بنا پر عرض کروں گا کہ خواہ کسی بات کو لے لیجئے۔اگر وہ راز کی صورت میں مخفی رکھی جائے تو باعث اطمینان اور تسلی ہوگی۔

لیکن اگر راز ۔۔ راز نہ رہے اور بات ظاہر کر دی جائے ۔ تو پھر دوسرے لوگ تو رہے ایک طرف آدمی کو خود بھی اس پر اطمینان نہیں رہتا ۔ اور جب اطمینان متزلزل ہو جائے ۔ تو وہ اہم ترین بات بھی وہم بن کر رہ جاتی ہے ۔

مثال کے طور اگر ایک بادشاہ اپنے کسی ملازم کو راز درون پردہ کی کوئی بات بتا دے ۔ اور لگے ہاتھوں وہی ملازم راز شاہانہ سے پردہ سرکا کر عام و مشہور کردے ۔ تو اس صورت میں نہ صرف یہ کہ بار دگر بادشاہ اسی ملازم کو راز کی بات نہ بتائے گا بلکہ سخت ترین سزا بھی دے گا ۔

''انائے اصغر'' پر ''انائے اکبر'' کا پرتو پڑتا ہے :۔

مقصود یہ کہ ہر انسان کے ذہن پر کائنات عالم کے مختلف پرتو منعکس ہوتے ہیں ۔ لیکن اگر یہ پرتو کسی ولی اللہ کے ذہن پر منعکس ہوں ۔ اور بشرطیکہ وہ بسط کی حالت میں ہو ۔ تو ایسے تمام واردات عکسوں کی صورت میں اس کے ذہن کے آئینے میں نظر آ جاتے ہیں ۔

فی الاصل جب ''انائے اکبر'' (جس کو ہم اللہ تعالیٰ جل جلالہ کہتے ہیں) کسی چیز کا ارادہ فرمالیتا ہے ۔ تو وہی ارادہ ''انائے اصغر'' پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ۔ اور معلوم ہے ۔ کہ ''انائے اصغر'' روح انسانی سے عبارت ہے ۔ یعنی جس وقت ''انائے اصغر'' بسط کی حالت میں ہو ۔ تو ''انائے اکبر'' کے ارادے کا ادراک کر لیتا ہے ۔ اور اسی اصول کے رو سے اولیاء اللہ قدس اسرار ہم کو مستقبل کے حالات معلوم ہوا کرتے ہیں ۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر میں نے بارہا اپنے مرشد پاک حضور بادشاہؒ اور ان کے علاوہ متعدد مجاذیب و سالکین کی بے شمار کرامتیں ملاحظہ کی ہیں ۔ مثلاً جناب قاصد باباؒ کا نام نامی کئی بار اس مبارک تذکرہ میں آ گیا ہے ۔ وہ میرے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ کے بڑے قدردان تھے ۔ اور مجھ سے بھی خاصی محبت تھی ۔ برسبیل تذکرہ ان کی دو کرامتوں کا ذکر کروں گا ۔

قاصد بابا کی چشم دید کرامت :۔

واقعہ یہ تھا ۔ کہ ایک روز قاصد باباؒ بھاگے بھاگے ہمارے گاؤں تشریف لے آئے ۔ کتوں کا ایک جم غفیر ان کے ہمراہ تھا ۔ آئے اور آتے ہی مجھ سے کہا کہ ''منے ! (وہ مجھے ککیہ کہا کرتے تھے) جلد سے اور جھٹ پٹ چائے لے آ ۔ اور غلام (میرا بھانجہ) کو بھی بلا لے ۔ کیونکہ آج تمہارا گاؤں ایک آفت عظیم کی لپٹ میں آنے والا ہے'' یہ سنتے ہی میں بلا توقف چائے لانے گھر چلا گیا ۔ مگر بڑا پریشان بھی تھا ۔ اس لئے کہ قاصد باباؒ کی بات کبھی بھی خلاف واقعہ نہ ہوتی تھی ۔ چنانچہ میرے دل میں کئی خدشات تھے ۔ اور اسی کشش و پیچ اور اضطراب کی حالت میں چائے لے آیا ۔ اتنے میں

غلام بھی آ گیا۔ قاصد باباؒ بڑی تیزی سے چائے پی رہے تھے۔ جو صاف طور پر ان کی الجھن اور تشویش کا پتہ دے رہی تھی۔ اسی اثناء میں حجرے میں بیٹھے ہوئے میرے برادر بزرگ ملک باور خان (مرحومؒ) اور ہمارے بڑے رشتے کے چچا (تربور) مجید خان کاکا آپس میں کسی بات پر الجھ گئے۔ درحقیقت مجید خان کاکا، کا اصل جھگڑا ہمارے ایک دور کے رشتہ دار (تربور) سے تھا۔ جو میرے بھائی کی بات کی تائید کرر ہا تھا۔ اور مجید خان کاکا کو اس پر طیش آ گیا۔ چنانچہ اس کی اعانت کے لئے اس کے عزیز و اقارب اسلحہ سے لیس ہو کر ہمارے حجرے میں آ گئے۔ اور اب دونوں طرف سے رائفلیں اٹھا دی گئیں۔ وہ ایک دوسرے کو نشانہ بنانے ہی والے تھے۔ کہ یکا یک قاصد باباؒ بڑی تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بھاگ کر قریبی مسجد کی سیڑھیوں میں کھڑے ہو گئے۔ کتوں کی ٹولی بھی ان کے ساتھ گئی۔ اب قاصد باباؒ نے آسمان کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ "یا اللہ خیر!" معاً دوسری بار ذرا زور دے کر کہا کہ "یا اللہ خیر!" اور تیسری بار تو پورے جلال اور جذبے سے کہہ دیا! یا اللہ خیر کرو نہ چوتھی بار نہ کہوں گا۔ حیرت یہ تھی کہ کتے بھی برابر آسمان کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے مسلسل اوپر تک رہے تھے۔ اور اسی لمحہ میں دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہولناک جھگڑا پر اسرار طور پر خود بخود ختم ہو گیا۔ رائفلوں کی نالیاں زمین کیطرف جھک گئیں۔ برہمی اور طیش کے آثار ختم ہو گئے۔ اور ساتھ ہی ہمارے باہر کے رشتہ دار حجرے سے باہر نکل گئے۔ اور قریبی رشتہ دار اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

قاصد باباؒ کی ایک اور کرامت:۔

اسی طرح ایک اور موقعہ پر قاصد باباؒ میرے پاس آئے اور فرمایا کہ "منّے! اس لنڈورے گنجے کے پاس جلدی سے چلے جاؤ" ورنہ تمہاری ملکی ماری گئی"۔ فوراً میرے خیال میں پولیٹیکل ایجنٹ آ گیا۔ چنانچہ بلا تاخیر پشاور چلا آیا۔ عرضی لکھ دی۔ مگر گرمی کا موسم تھا۔ اسی لئے پولیٹیکل ایجنٹ کوہ مری میں تھا۔ لہذا میں بھی کوہ مری چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر چپڑاسی کے ذریعے عرضی پولیٹیکل ایجنٹ کے نوٹس میں لے آیا۔ اتفاق سے اسی وقت متعلقہ مثل بھی میز پر اس کے سامنے پڑی تھی۔ میری عرضی پڑھ لینے کے بعد حقیقت حالات سے باخبر ہو گیا۔ چنانچہ مثل پر "زیر تجویز" لکھ کر بات رفع دفع کر لی۔ دراصل یہ ہمارے چند چھپے ہوئے "کرم فرماؤں" کی کارستانی تھی۔ جنہوں نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت نائب پولیٹیکل آفیسر کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا۔ اور پھر پولیٹیکل ایجنٹ کو مثل توثیق کے لئے کوہ مری بھیج دی تھی۔

خیر تو دوسرے روز جب میں اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ تو قاصد باباؒ پہلے سے ہمارے حجرے میں موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اور فرمانے لگے۔ منّے! بہادر تھے ملکی بچالی"۔

ممانعت:۔

قاصد بابا کی کرامتوں پر مشتمل ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اور یہاں بھی ضمناً ان کا ذکر آ گیا۔ اور یاد رہے کہ مجاذیب اکثر راز چھپانے کی بڑی پابندی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ساری گفتگو منطقی تسلسل اور باقاعدگی سے خالی ہوتی ہے۔ اور عوام کو نرے پاگل نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ کسی مجذوب سے کچھ سن لیتے ہیں۔ تو اوٹ پٹانگ اور بے سروپا بات چیت کی وجہ سے اس کی کسی بات پر یقین نہیں کرتے۔ بہر حال سالک کے لئے ان باتوں کو ظاہر کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ اور بالفرض اگر وہ ایسی باتوں کو ظاہر کر دے۔ تو اس کو نقصان پہنچتا ہے۔

ڈبگری دروازے کے مجذوب بابا کی کرامت:۔

ڈبگری دروازے سے باہر والے مجذوب بابا کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے۔ اس کا تعلق میرے ساتھ اس حد تک بڑھ چکا تھا۔ کہ وہ میرے دل کی بات کا اپنی زبان سے جواب دیتے۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ کسی شخص نے آ کر مجھے اطلاع دی۔ کہ میرا بھائی ملک باور خان وزیری قبائیلوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ (ان کا اس علاقے میں ٹھیکہ تھا) یہ لرزہ خیز خبر سن کر میں براہ راست مجذوب بابا کے پاس آ گیا۔ ان کے سامنے ہوا تو وہ ہنس پڑے اور عرض معروض سنے بغیر فرمانے لگے۔ ''کہ باور خان کل آ جائے گا۔ اور اتنے روپے لے آئیگا'' (اس جملے کے ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر ایک بڑے ڈھیر کا نقشہ پیش کیا) اور معاً برادرم باور خان کو دو چار گالیاں بھی دیں۔ بہر حال دوسرے دن واقعی برادرم آ گئے۔ اور روپوں کی بھری ہوئی تھیلی بھی لے آئے۔

کچھ علم لدنی کے بارے میں:۔

اس مقام پر علم لدنی اور علم غیب کا ذکر کرنا بھی سود مند ہوگا۔ اس لئے کہ اس کا تعلق بھی کرامت سے ہے۔ اور علم غیب اس بنا پر بھی کرامت کے زمرے میں آتا ہے۔ کہ یہ حق سبحانہ وتعالیٰ جل جلالہ کی طرف سے انسان کے لئے ایک بہت بڑا عطیہ ہے۔ اور اس الطاف عظیم سے ایک انسان اس وقت نوازا جاتا ہے۔ جب اس کے وجود کے آئینے سے تمام حیوانی نقوش یکسر محو ہو جاتے ہیں۔ یعنی جس وقت ایک سالک اپنے نفس سے فانی ہو جاتا ہے۔ تو حق سبحانہ وتعالیٰ سے باقی ہو جاتا ہے۔ اس کی ''انا'' حیوانیت کی معیوب حلقہ بگوشی اور مذموم محکومی کا جوا اتار پھینکتی ہے۔ اور ''انائے اکبر'' سے معنوی عینیت حاصل کر لیتی ہے۔ تو اسی حال میں سالک مغائب کا مدرک ہو جاتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ بسط کی حالت میں ہو۔ وجہ یہ ہے کہ بہر نوع وہ ''بندہ'' ہی ہوتا ہے۔ اور اس کے

ساتھ ہی جسم کی قید میں بھی ہوتا ہے۔

آیات قرآنی سے انسانی علم غیب کی نفی نہیں ہوتی:۔

قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی اس قسم کا ذکر آیا ہے۔ کہ علم غیب سوائے حق سبحانہ وتعالیٰ کے اور کسی کو بھی حاصل نہیں۔ یا حق سبحانہ وتعالیٰ کا رسول کریم ﷺ سے یہ ارشاد کہ۔
''کہہ دے اے رسول! اگر مجھے علم غیب حاصل ہوتا۔ تو دنیا کے سارے خزانے اپنے لئے مختص کرتا''
یا اسی طرح جتنی بھی دیگر آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ تو اس سمیت ان سب سے انسان کے علم غیب کی نفی ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ بات یقینی ہے۔ کہ چونکہ یہ انسان کا اپنا ذاتی علم نہیں ہوتا۔ بلکہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے عطا فرمایا گیا ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی کوئی صفت بھی اس کی ذاتی نہیں ہوتی۔ جیسے حیات، سمع، بصر، کلام اور سبھی کچھ انسان کو حق تعالیٰ جل وعلا کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ اب اگر انسان سے علم غیب کا ظہور ہو جائے تو یہ انسان کو اللہ ہی کی طرف سے ودیعت ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ تو ہر چیز کا خالق ہے۔ یعنی وہی ذات اقدس عز و جل ہی ہر چیز کا ظاہر کرنے والا ہے۔ اور ہر شے قبل از ظہور اس تعالیٰ شانہ کے علم میں موجود ہوتی ہے۔ یہ قطعاً نہ جاننا چاہئے۔ کہ کوئی شے علمی طور پر حق سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں نہ ہوگی۔ اور اسے تخلیق فرمادے گا۔ اگر ایسا تصور کیا جائے۔ تو ذات حق سبحانہ وتعالیٰ پر...دو اعتراضات وارد ہوں گے۔ اولاً یہ کہ جو چیز اس تعالیٰ شانہ کے علم میں نہ ہو۔ تو اس کو تخلیق بھی نہیں فرما سکتا۔ اور اگر وہ چیز پیدا کرنا منظور بھی فرمادے۔ تو ظاہر ہے کہ اپنی ہستی سے قطع نظر خارج سے تخلیق فرمائے گا۔ اور جس وقت اس کی ذات والا تبار کا خارج متصور ہوگا۔ تو لا محالہ اس کی ذات پاک محدود ثابت ہو گی۔ اور یہ قطعی محال ہے۔ ثانیاً یہ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا علم ذاتی اور حضوری نہ ہوگا۔ بلکہ اکتسابی او تجرباتی ثابت ہو جائے گا۔ اور شک نہیں کہ یہ بات بھی قطعی ناممکن ہے۔ بنا بریں ثابت ہوا کہ جب کوئی شئے بھی اس کی ذات والا صفات سے غائب نہیں تو اس ذات اقدس وتعالیٰ کے لئے علم غیب کی صفت بہ اعتبار مخلوق ہے۔ اور جو اشیاء مخلوق سے مخفی ہیں وہ ابتداء سے حق سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں موجود ہیں۔ نیز مخلوق کو پیدا فرمانے کا مدعا بھی یہی ہے۔ کہ مخلوق اس کی عبادت کرے۔ اور نتیجے کے طور پر معرفت کا مقام حاصل کرے۔
اب جہاں تک اس معرفت کا تعلق ہے۔ تو یہ سب سے پہلے انسان کے اپنے نفس سے شروع ہوتی ہے۔ **وفی انفسکم افلا تبصرون** (اور خود تمہارے اندر ہیں۔ سو کیا تم کو سوجھتا نہیں) تو جس قدر بھی انسان مجاہدہ کرتا ہے۔ اور اپنی ''انا'' کو اضافات سے آزاد کراتا جاتا ہے۔ اسی قدر

علم غیب حاصل کرتا ہے۔ اور اسی حصول کے ساتھ ساتھ حق سبحانہ وتعالیٰ کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ (اور جنہوں نے محنت کی (مجاہدہ کیا) ہمارے واسطے ہم سمجھا دینگے ان کو اپنی راہیں)
یہ بھی ظاہر ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لیکر تا زمانۂ حال جس قدر بھی ترقی ہوئی ہے۔ یا بصورت دیگر انسان نے طرح طرح کی ایجادات کی ہیں۔ تو یہ تمام ظہور میں آنے سے پہلے اور کسی کے لئے تو چھوڑیئے خود انسان کے لئے بھی علم غیب کا درجہ رکھتی تھیں۔ لیکن جب ان سب کو حاصل کیا گیا تو شہود میں آ گئیں۔

''انائے انسانی'' کی اضافات سے آزادی:۔

کئی مقامات پر ہم اس حقیقت پر بحث کر چکے ہیں۔ کہ ہر انسان حق سبحانہ وتعالیٰ کے ایک اسم پر پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اسی اسم کے ''عین'' کا پرتو ہوتا ہے۔ تو جس وقت وہ انسان اپنا ''عین'' یا اپنی ''انا'' اضافات کے پرتو سے آزاد کرالیتا ہے۔ تو من بعد وہی انسان اپنے اسی وجودی اسم اور عین سے واصل ہو جاتا ہے۔ اور اسی وصلت کے ساتھ ہی ذات سے بھی اس کا عقلی تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔
ذہن نشین رہے کہ قبل ازیں وہ اضافات کے حلقے میں اسیر تھا۔ اور اس صورت میں ذات میں حق سبحانہ وتعالیٰ سے اس کا تعلق حسی تھا۔ لیکن اب مجاہدہ کی برکت سے حجابات سے خلاصی پا کر ذات حق سبحانہ وتعالیٰ سے واصل ہو گیا۔ اور یہی وہ محل ہے۔ جس میں سالک اچھا خاصہ علم بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی حال میں اپنی ذات سے اس کا معنوی وصال بحثیت مجموعی علمی اور عقلی ہوتا ہے۔ اور اسی حیثیت سے وہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے انوار مقدسہ کا برزخ ہوتا ہے۔ اور ہر لمحہ اسے ذات حق سبحانہ وتعالیٰ سے نئے نئے حقائق اور اسرار معلوم ہوتے ہیں۔

الکل فی الکل:۔

اضافات کے سلسلہ میں عرض کروں گا۔ کہ مندرجہ بالا سطور میں یہ وضاحت کی گئی ہے۔ کہ ہر انسان حق سبحانہ وتعالیٰ کے ایک اسم پر پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر یہی انسان ایک خاص صفت اور ''عین'' کا پرتو ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ ذات کے بغیر صفت ہرگز قائم نہیں رہ سکتی۔ اور مزید برآں یہ کہ صفات عین ذات ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فعال صفت نہیں۔ بلکہ ذات ہے۔ اور صفات محض اعتبارات ہیں۔ جو ایک ہی ذات میں متصور ہیں۔ یعنی وہی ایک ذات رحیم، کریم، ودود اور سبھی کچھ خود ہے۔

بالفرض اگر ہم صفات کو فعلیت کی طرف منسوب کر لیں۔
تو ذات الٰہی صفات کی معلول ہو جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ بغیر صفات کے ناقص ہو گی۔ اور معاذ اللہ یہ امر مطلق ممکن نہیں ہے۔ تو جب ایک انسان حق سبحانہ وتعالیٰ کے کسی اسم یا صفت پر بھی پیدا ہو گا۔ تو اسی اسم اور صفت کے ساتھ بذات خود ذات بھی موجود ہو گی۔ وجہ یہ ہے کہ ظاہر ہے۔ کہ صفت بغیر ذات کے اور اسم بغیر مسمّی کے ممکن نہیں۔ اور شک نہیں کہ حق سبحانہ لامحدود اسماء وصفات کا مالک ہے۔ لہٰذا انسان میں وہ سب لامحدود اسماء وصفات آ جائیں گے۔ جو عین ذات ہیں۔ اور ذات کے بغیر نہ تو وہ قائم رہ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی ان کی طرف فعلیت منسوب ہو سکتی ہے۔
مثلاً فرض کیجئے۔ ایک انسان کا بنیادی اسم رحیم ہو تو اس کے باوصف حق سبحانہ وتعالیٰ کے دیگر اسماء و صفات بھی اسی انسان کے وجود میں شامل ہوں گے۔ اس لئے کہ صفت بغیر موصوف کے قائم نہیں رہ سکتی۔ تو معلوم ہوا۔ کہ یہی اسم رحیم اور اس کے ساتھ رحمت کی صفت تو اس انسان کی بنیاد ہو گئی۔ کیونکہ اسی اسم پر اس کی بنیادی تخلیق ہوئی ہو گی۔ اور مزید برآں حق سبحانہ وتعالیٰ کے لامحدود صفات بھی اس کے اندر "اضافات" کے زمرے میں آ جائیں گے۔ جن کا ذات کے ہمراہ اس کے وجود میں آنا لابدی ہو گا۔ اور اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ کہ **التوحید ترك الاضافات** یعنی توحید ان اضافات کے ترک کرنے کو کہتے ہیں۔ جو اس کے بنیادی اسم اور صفت کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ اور اسی شمولیت نے اس کی اساسی صفت اور بنیادی اسم کو مغلوب کر دیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ اسقاط یا ترک اضافات صرف مجاہدہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ بہر حال اسی لحاظ سے ہر اسم دوسرے اسم کا اور ہر صفت دوسری صفت کا "عین" ہوتا ہے۔ اور (الکل فی الکل) یعنی ہر شئے ہر شئے کے اندر) کا اشارہ اسی طرف ہے۔
اور کوئی شک نہیں کہ یہ توحید وجودی کی وہ بے مثال اور بیش بہا معرفت ہے۔ جس کی کوئی مثال موجود نہیں۔

اگر اضافات زائد بر ذات مان لئے جائیں تو؟:۔

اب جن لوگوں نے صفات کو زائد بر ذات کہا ہے۔ بلا شبہ انہوں نے حق سبحانہ وتعالیٰ کو صفات کا معلول ثابت کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک ہی ذات میں کثرت کے بھی قائل ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ جل جلالہ سمیع و بصیر ہے۔ اور اگر کوئی بندہ اس کا ذکر کرے۔ تو وہ اس کو بحیثیت سمیع سنتا ہے۔ اور بحیثیت بصیر دیکھتا بھی ہے۔ اب ملاحظہ فرمایئے۔ اگر ہم صفات کو زائد بر ذات مان لیں۔ تو پھر ذات ہی میں ہر ہر صفت کے جداگانہ طور پر مستقل وجود کا قائل ہونا لازم آ جائے گا۔ گویا اس صورت میں حق تعالیٰ جل وعلا ذاکر کا ذکر بحیثیت سمیع سنے گا۔ اور بحیثیت بصیر دیکھے گا۔

لیکن! رحمٰن، رحیم، مصور اور اسی طرح باقی صفات اور اسماء کی حیثیت سے اپنے ذاکر کا معبود ثابت نہ ہوگا۔
البتہ یہ جبھی ممکن ہوگا۔ کہ ہم رحیم، رحمٰن، مصور اور اسی طرح دوسرے اسماء وصفات کو بھی سمیع و بصیر نہ مان لیں۔ تو ظاہر ہوا کہ ہر اسم اور ہر صفت دوسرے اسم اور دوسری صفت کا ''عین'' ہوتا ہے۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ کے تمام اسماء بحیثیت مجموعی اسم ذات اللہ میں اور اس کی صفات صفت علم میں متصور و متحقق ہیں۔

بالآخر مادئین کو بھی حق سبحانہ کا وجود ماننا پڑے گا:۔

رہے وہ فلاسفہ! جن پر محسوسات کی ظلمت و تاریکی مسلط ہے۔ تو وہ اولیاء قدس اسرارہم کے حالات سے منکر ہونے پر مجبور ہیں۔ اس لئے کہ (جو کوئی ذوق نہیں رکھتا ادراک نہیں کرسکتا) دراصل مادئین بچارے ابھی تک مادے کے چکر سے نہیں نکلے۔ اور جس قدر بھی انہوں نے اشیائے کے متعلق علم حاصل کیا ہے۔ تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہزار ہا برس کے بعد ان کو محض اسی قدر معلوم ہوگیا۔ کہ سابقاً وہ مادہ کو جو چیز سمجھ رہے تھے۔ وہ ایسی چیز نہ تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ پہلے مادئین کا قول تھا۔ کہ مادہ کو نہ تو کوئی پیدا کرسکتا ہے اور نہ ہی کوئی اسے فنا کرسکتا ہے۔ مگر غور فرمائیے۔ کہ موجودہ ایٹمی دور میں وہ خود اس بات پر قادر ہوگئے۔ کہ مادہ کو فنا کر کے اس کو ''توانائی'' میں تبدیل کردیا۔ مگر اب ''توانائی'' ان کے ہاتھ نہیں آسکتی۔
ان حقائق کے رو سے نئے دور کی نئی تحقیقات خود ہی مادئین کے اکثر و بیشتر نظریات کو غلط ثابت کر دینگی۔ اور یہ بات ان کی سمجھ اور فہم میں آجائے گی۔ کہ کائنات عالم کا ایک عالم اور مدبر خالق بالضرور موجود ہے۔ اور انشاء اللہ عنقریب ہی بہت سے مادئین اپنے نظریات میں انقلابی تبدیلی پیدا کردیں گے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ ان کے مادے کی بنیادی تعریف کا تانا بانا ہی غلط ثابت ہوگیا۔ چنانچہ لازمی ہے کہ اسی غلط بنیاد پر۔ قائم شدہ تمام نظریات کی پوری اور ساری عمارت منہدم ہوکر نیست و نابود ہوجائے گی۔

''انائے اکبر'' سے معنوی وصلت کے بعد:۔

الغرض جس وقت انسان کا ارادہ اضافات سے تجرد اور ''انائے اکبر'' سے معنوی وصلت کی وجہ سے آزادی حاصل کرلیتا ہے۔ تو اس کی طاقت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور اس طاقت کے حصول کے بعد وہ منفصل اور پریشان مادہ کو مجتمع اور متصل مادہ کو منتشر کرنے کی قوت بھی حاصل کرلیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے لئے یہ بات کوئی مشکل یا ناممکن نہیں رہتی کہ وہ کسی پہاڑی کو اپنی جگہ سے ہلا

دے۔ اور یا اس سے بعض دوسرے ایسے کام ظاہر ہوں۔ جو عام انسانی طاقت سے بھی ممکن نہ ہوں۔ بہر انداز جہاں تک ایسے امور سے انکار کرنے کا تعلق ہے۔ تو اس کی زیادہ تر وجہ علم وفکر کی کمی ہوتی ہے۔

معیار یہ نہیں ہے:۔

یہاں پر یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کوئی ضروری امر نہیں۔ کہ اولیاء اللہ قدس اسرار ہم کا کوہستانی سلسلوں کو ہلانے جلانے کے سوا کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہوتا۔ یا جونہی کہیں گہرا اور تندو تیز پانی نظر آیا۔ تو جھٹ بغل سے مصلیٰ نکال کر آناً فاناً سطح آب پر بچھا دیا۔ یا پھر بسیط فضاؤں اور ہواؤں میں محو پرواز ہونے ہی پر ولایت کے معیار کا دارومدار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اولیاء اللہ قدس اسرار ہم کی توجہ سے پہاڑوں کو ہلانا تو کیا بلکہ اس سے بھی زیادہ محیر العقول اور حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ اور اس کی واضح ترین مثال یہ ہے کہ یہی اولیاء اللہ قدس اسرار ہم دوسرے حیوانی صفت رکھنے والے انسانوں کے ظلمت میں لپیٹے ہوئے قلوب کو یکسر بدل کر ان کے تاریک دلوں کو ہدایت اور نیکی کے راستے پر گامزن کرتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ غیر معمولی بات یہ ہے نہ کہ وہ!

سب سے بڑی کرامت:۔

اس ضمن میں حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ کا ایک واقعہ بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ وہ جو حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ کی خانقاہ میں ایک آدمی مسلسل تین برس تک مقیم رہا۔ جب رخصت لینے لگا۔ تو حضرت بایزید قدس سرہٗ نے اس سے دریافت کیا کہ "میاں! نہ ہم نے کچھ کہا نہ تم نے کچھ سنا۔ تو ایسے کہے سنے بغیر اچانک روانہ ہونے کا مطلب؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ کہ "قبلہ! مسلسل تین برس آپ کی صحبت میں بلا ناغہ حاضر رہا۔ لیکن افسوس! کہ اتنے طویل عرصے میں بھی آپ کی ایک معمولی سی کرامت مشاہدے میں نہیں آئی"۔

اب حضرت بایزید قدس سرہٗ نے اس شخص کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا۔ کہ "بھئی خوب! لیکن کیا تم یہ بتا سکتے ہو۔ کہ ان تین برسوں میں کبھی یہ بات بھی تمہارے مشاہدے میں آئی ہے۔ کہ کسی موقعہ پر "بایزید" نے کوئی کام خلاف شریعت کیا ہو؟" سالک نے یہ سن کر جواب دیا۔ کہ "نہیں قبلہ! میں نے آپ کو کوئی خلاف شریعت کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ بلکہ آپ کے سارے معاملات قرآن وسنت کے عین مطابق ہوتے تھے"۔ لہذا حضرت شیخ بایزید بسطامی قدس سرہٗ نے ذرا زور دے کر ارشاد فرمایا "پھر تم خود ہی بتا دو کہ اس سے بڑی کرامت اور کیا ہو سکتی ہے" چنانچہ سالک

اپنے ارادے سے باز آیا۔

معجزات نبوی ﷺ اور کرامات اولیاء قدس اسرارہم :۔

رسول کریم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن حکیم ہے اور تا حال کسی نے بھی قرآن حکیم کے اس چیلنج کو قبول نہ کیا۔ جو **فاتوا بسورة مثله** کی شکل میں موجود ہے۔ اور اگر بالفرض مقابلہ کے طور پر کسی نے کچھ پیش بھی کیا۔ تو مسلمان تو رہے مسلمان۔ خود کفار نے بھی اس مقابلے کی ہنسی اڑائی۔ علاوہ ازیں رسول کریم ﷺ کے وجود مبارک سے ایسے معجزے بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ جو اس زمانہ کے انسانوں کے فہم کے مطابق تھے۔ یہ اکثر علمی معجزات تھے۔ جن کی تفصیل سیرت نبوی ﷺ کی کتابوں میں موجود ہے۔

دوسرا معجزہ جو تمام انبیاء علیہم السلام کو بطور معجزہ اور ان کے بعد تمام اولیاء اللہ کو بطور کرامت عنایت ہوتا ہے۔ وہ استقلال اور استقامت کی بیش بہا دولت ہے۔ جس پر کوئی شئے اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہی اس میں خلل ڈال سکتی ہے۔ ان بزرگوں کی مثال ان بلند و بالا پہاڑوں اور محکم چٹانوں کی طرح ہوتی ہے۔ جن کے ساتھ حوادثات کے دریا ٹکریں تو مارتے ہیں۔ لیکن ہر بار اس کی ہر ٹکر خود اس کے اپنے چہرے کیلئے ایک زوردار چپت ثابت ہوتی ہے۔

تاریخ کے طالب علم کو معلوم ہوگا۔ کہ رسالت مآب رسول کریم ﷺ اپنی حیات دنیوی میں کس کس قسم کے ہولناک حوادثات اور صبر آزما مصائب سے دوچار ہوئے تھے۔ مگر یہ رسالت پناہ رسول کریم ﷺ ہی کی ذات بابرکات تھی۔ جنہوں نے اپنے کامل ارادے اور مضبوط استقلال کو بروئے کار لا کر ان تمام حوادث و مصائب کو اس خوبی سے برداشت فرمایا۔ کہ آخر کار آنحضرت ﷺ کی حیات طاہرہ میں ہی ساری سرزمین عرب نے ان کی کامل اطاعت کو قبول کیا۔ اور نتیجتاً وہ لوگ جو ظاہری شکل و صورت سے انسان نظر آتے تھے۔ لیکن فی الواقع وحوش و درندگان سے بھی گئے گزرے تھے۔ وہ سب رسالت مآب ﷺ کے طفیل بہترین اور کامل ترین انسانوں میں شمار ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مشرق و مغرب کے تمام ملکوں نے انہی متبرک ہستیوں کے خوان نعمت سے علم و ادب اور تہذیب و شائستگی کے ساتھ ساتھ اخلاق و روحانیت کی خوشہ چینی کو باعث صد افتخار سمجھ لیا۔ نیز اور بھی بہت کچھ سیکھا۔

اس قسم کا معجزہ رسالت پناہ رسول کریم ﷺ کے مبعوث ہونے تک کسی نبی کو بھی عطا نہیں فرمایا گیا تھا۔ اور اس حقیقت کی روشنی میں اولیاء اللہ قدس اسرارہم جو رسول کریم ﷺ کے برحق متبعین ہیں۔ تو وہ بھی زیادہ تر وہی کرامات ظاہر کرنا پسند فرمائیں گے۔ جو مشکوٰۃ نبوت سے سینہ بسینہ ان کے ولایت کے کالبد میں منتقل ہو گئے ہوں۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ بھی اپنے کسی ولی کی تائید میں جس قسم

کی کرامت ظاہر کرنا پسند فرمائیں گے۔ وہ بالیقین رسول کریم ﷺ کی مشکوٰۃ نبوت سے عبارت ہو گی۔ یہ اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کی حقانیت اور سنت کی ضیا پاشیوں سے پورے کائنات منور ہوں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے:۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ کہ کسی ولی اللہ سے جب کوئی کرامت ظاہر ہوتی ہے۔ تو اس کو خود بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کرامت کو ظاہر کرنے کا ارادہ ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انبیاء السلام یا اولیاء اللہ قدس اسرار ہم اپنے اختیار یا ارادے سے کوئی معجزہ یا کرامت ظاہر ہی نہیں کر سکتے۔ وہ یقیناً ایسا کر سکتے ہیں. کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو یہ طاقت عنایت کی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جنگ بدر ہی کو لے لیجئے۔ کیونکہ **وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ** کا اشارہ صاف طور پر اسی طرف ہے۔

حضور بادشاہ جانؒ کی ایک کرامت:۔

اسی سلسلے میں مجھے حضور بادشاہ جانؒ کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔ ''ایک موقعہ پر دہلی میں پختونوں کے دو گروہوں میں زبردست فساد شروع ہو گیا۔ اور یہ سب خرکار کیمپ کے مزدور تھے۔ ان کی لڑائی نے خاصہ طول پکڑ لیا تھا۔ کہ ایک دوسرے کے خون سے ہاتھ رنگتے۔ کہ ایک روز اچانک انہی میں سے ایک مزدور نے چلا کر کہا، ''اے لو! عبدالستار شاہ بادشاہ تشریف لے آئے''۔ چنانچہ میں پہنچ گیا۔ اور دونوں فریقوں میں صلح کرا دی۔ اس صلح کی خوشی میں انہوں نے بطور خیرات دنبے ذبح کئے۔ ''کھا پی'' کر میں نے ان سے رخصت لی۔ اور اسی روز رات کی گاڑی میں سوار ہو کر پشاور چلا آیا''۔

اتنا ارشاد فرمانے کے بعد مرشد پاکؒ مسکرائے اور اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔ ''فی الحقیقت مجھے بذات خود اس واقعہ کی کچھ بھی خبر نہ تھی۔ کیونکہ اسی دن اور اس کے بعد بھی کافی عرصہ تک پشاور سے باہر نہ گیا تھا۔ مگر تعجب ہے۔ کہ ان پختونوں کے سینکڑوں افراد آج بھی اس واقعہ کی شہادت دیتے ہیں۔

گویا یہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے حضور بادشاہ جانؒ کی کرامت کا اظہار تھا۔ اس کے علاوہ بھی صدہا ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ جو حضور بادشاہ جانؒ کی کرامتوں سے متعلق ہیں۔ اور اگر ان سب کو تحریر کیا جائے۔ تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے گی۔ البتہ انہی میں سے چند ایک کو میں مختصر طور پر تبرکاً عرض کرتا ہوں۔

پراسرار غیبت:۔

قاعدہ مبارک تھا کہ ہر سال موسم بہار میں حضرت شیخ علی ترمذی عرف پیر بابا قدس سرہٗ کی زیارت کے لئے علاقہ بنیر تشریف لے جاتے۔ ہم بھی ساتھ ہوتے۔ ایک مرتبہ جب ہم بنیر گئے تو میں نے اور میرے چچیرے بھائی (تربور) عصمت اللہ خان نے آپس میں طے کرلیا۔ کہ جب سب لوگ حضور بادشاہ جانؒ کی معیت میں حضرت پیر بابا قدس سرہٗ کے مزار اقدس میں داخل ہوں تو عین اسی وقت حضور بادشاہ جانؒ سے التماس کرینگے۔ کہ اس وقت خصوصی طور پر ہمیں دعا میں یاد فرمالیں۔ خیر تو جس وقت ہم زیارت کے احاطہ میں داخل ہوگئے۔ تو اس وقت حضور بادشاہ جانؒ نے اپنے ایک مرید عبدالرشید بادشاہ سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''عبدالرشید بادشاہ! تم مزار اقدس پر ہی کھڑے رہنا اور جو کوئی زائر اس طرف نیاز پھینکے تو سب کو جمع کر کے ایک طرف رکھنا۔ اور بعد میں وہ سب کچھ ان سادات کے حوالے کردینا۔ جن کی آج نذر نیاز لینے کی باری ہے۔''

اسی اثناء میں میں نے عصمت اللہ خان کو اشارہ کیا کہ موقع غنیمت جان کر حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں اپنی گزارش پیش کردے۔ مگر دوسرے لمحے دیکھتے ہی دیکھتے حضور بادشاہ جانؒ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ ہم نے اِدھر اُدھر خوب تلاش کیا اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے کافی چکر لگائے۔ مگر مرشد پاک ''نظر نہ آئے۔ خیر جب سب لوگوں نے دعا مانگی اور واپس ہو رہے تھے۔ تو اسی وقت میں نے حضور بادشاہ جانؒ کو ایک طرف سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ

''تم نے کیا دعا مانگی۔۔۔۔۔؟''

چونک کر میں نے دیکھا۔ تو حضور بادشاہ جانؒ میرے پہلو میں کھڑے تھے۔

اسی طرح دوسرے سال بھی عصمت اللہ خان اور میں نے مل کر تیراہ مُلا (مولوی شیر محمد مرحوم) کو بھی ہمراز بنالیا اور جونہی ہم سب حضرت پیر باباؒ کے روضۂ اطہر میں داخل ہوئے اور دعا کے وقت سعی کی گئی تو حضور بادشاہ جانؒ حسب سابق غائب تھے۔ اب ہم تینوں نے مل کر تلاش شروع کی۔ مگر یقین فرمالیجئے۔ کہ روضۂ اطہر کے مختصر سے احاطے کے اندر ہم میں سے کسی ایک کو بھی حضور بادشاہ جانؒ نہ ملے۔ اور نہ نظر آئے۔ مجبوراً ہم نے واپس جانے کی ٹھان لی۔ معاً ملاحظہ کیا تو قریب ہی حضور بادشاہ جانؒ ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔

اب کی مرتبہ میں نے اپنے دل میں طے کرلیا۔ کہ اس بار حضور بادشاہ جانؒ سے ضرور معلوم کروں گا کہ یہ سب کیا اسرار تھا؟ خیر تو جس وقت حضور بادشاہ جانؒ پیر بابا صاحب قدس سرہٗ کے روضۂ اطہر سے باہر نکلے۔ اور عام قبرستان کے عبداللہ خادم کے گھر روانہ ہوئے (عبداللہ خادم کے ہاں

حضور بادشاہ جانؒ قیام فرماتے تھے۔اور اس کے گھر کو یہی کوتاہ ترین راستہ جاتا تھا) بہر حال میں بھی حضور بادشاہ جانؒ کے پیچھے روانہ ہو گیا۔اور قریب پہنچ کر عرض خدمت کیا۔کہ ''حضورؒ! پچھلے برس بھی......''ابھی میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔کہ حضور بادشاہ جانؒ سخت غصہ ہو گئے۔اور میری طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

''کم عقل! ایسی باتیں بھی کرنے کی ہوتی ہیں۔کیا تم مجھے لوگوں میں مشہور کرانا چاہتے ہو''؟

میں کچھ وقفہ کے لئے گھبرا سا گیا۔مگر حوصلہ کر کے دوبارہ عرض کیا۔کہ ''حضورؒ! ابھی تو میں نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی۔'' یہ سن کر حضور بادشاہ جانؒ اور غصہ ہو گئے۔اور مجھے ایسی جھڑکی دی۔کہ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔بارے مرشد پاکؒ کا قاعدۂ مبارک تھا۔کہ جب کسی کو جھڑکی دیتے تو بعد میں اسے راضی فرماتے۔چنانچہ اس واقعہ کے کوئی نصف گھنٹہ بعد مجھے اپنے حضور میں طلب فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''دیکھو! کبھی سورۂ مزمل کا بھی یہ اثر ہوتا ہے۔کہ آدمی دوسروں کی نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ایک مرتبہ ارمڑ کی مسجد کے صحن میں بنے ہوئے چبوترے پر بیٹھے ہوئے میں اپنے اوراد میں مصروف تھا کہ حجرے میں آدمی مجھے بلانے کے لئے مسجد آ گیا کیونکہ کھانا تیار تھا۔اس شخص نے مسجد کے کونے کونے میں مجھے تلاش کیا مگر میں اسے نظر نہ آیا''

واقعہ حکیم خان گڑھی:۔

شریف خان خٹک جو حکیم خان خٹک کا فرزند اور حضور بادشاہ جانؒ کا مرید ہے۔اچھے خاصے معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ان کے گاؤں کے امام مسجد حضور بادشاہ جانؒ کے بڑے مخالف تھے۔ اسی امام مسجد نے شریف خان کے والد کو خوب اکسایا تھا۔اور اسے کہا تھا۔کہ اپنے بیٹے شریف خان کو حضور بادشاہ جانؒ کی مجلس میں جانے سے منع کر دے۔پھر شریف خان کو اس کے والد نے یہاں تک کہہ دیا تھا۔کہ ''یا تو اپنے سلسلے کے کسی آدمی کو لے آؤ۔تاکہ ہمارے ملا صاحب سے سماع کے بارے میں بحث کر لے۔اور یا اپنے مرشد سے قطع تعلق کر کے توبہ تائب ہو جاؤ''۔چنانچہ شریف خان نے حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر ماجرا بیان کیا۔شریف خان کی بات سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''ہم کسی سے مناظرہ یا مجادلہ کرنے کے روادار نہیں بلکہ اس کے مخالف ہیں۔کیونکہ ایسا کرنے سے اصلاح کی صورت تو نکلتی نہیں۔البتہ اختلافات کی خلیج اور وسیع ہو جاتی ہے۔رہی سماع کی بات تو یہ سب کو معلوم ہے۔کہ ابتداء ہی سے یہ مسئلہ متنازعہ فیہ رہا ہے۔نہ اس کا کوئی فیصلہ ہوا نہ اس کی کوئی صورت نکلی۔اندریں حالات بہتر یہ ہو گا۔کہ تم ہمارے پاس نہ آیا کرو۔اس لئے کہ باپ کی

ناراضگی بھی کسی طرح سے جائز نہیں۔ اور ہاں اگر تمہاری نسبت ہم سے پختہ ہو تو آمد و رفت ضمنی چیزیں ہیں جن کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں''۔
مگر شریف خان نے گزارش کی کہ ''حضورؒ! یہ مجھ سے ہر گز نہ ہو سکے گا۔ کہ میں آپ کی صحبت بابرکت کو ترک کر دوں۔ اور اس میں نقص کی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پھر لوگ کہیں گے۔ کہ مرشد کی صحبت سے اس لئے باز آیا کہ خدانخواستہ حضور بادشاہ جانؒ جادۂ مستقیم پر نہ تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے والد بھی آپ کے مخالف نہیں لیکن ملا صاحب نے ان کے کان آپ کے خلاف بھر دیئے ہیں۔ اور ملا صاحب کے کہنے پر انہوں نے ایسا کہا ہے۔''
اس موقعہ پر میں حاضر تھا۔ اور میں نے حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں عرض کر دیا۔ کہ ''اگر حضورؒ مجھے اجازت عنایت فرما دیں تو میں خود جا کر امام مسجد سے تبادلۂ خیالات کر لوں گا۔ اگر ایسا کرنے سے اصلاح کی صورت نکل آئی تو بہتر ورنہ میں بھی شریف خان کو یہی مشورہ دے دوں گا۔ کہ یہاں کم حاضر ہوتا رہے''۔ حضور بادشاہ جانؒ نے میری گزارش کو شرف قبولیت بخش دی۔ چنانچہ شریف خان تو پہلے اپنے گاؤں رخصت ہو گیا۔ اور اس کے بعد میں بھی چند کتابیں ہمراہ لیکر موضع ارمڑ پہنچ گیا۔ اس قت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ارمڑ سے میں نے ایک شخص کو حکیم خان گڑھی کی طرف شریف خان کے والد کے ہاں روانہ کر دیا۔ تاکہ اسے اطلاع ہو جائے۔ کہ ہم کل صبح آجائینگے۔ اور اسکی موجودگی میں امام مسجد مذکور سے گفت و شنید کر لیں گے۔
شام کو میرا بھیجا ہوا شخص واپس آ گیا۔ اور ہمیں اطلاع دی کہ شریف خان کے بڑے بھائی امیر شاہ خان نے کہلا بھیجا ہے۔ کہ ''ان لوگوں (یعنی ہمیں) کو کہا جائے کہ وہ یہاں نہ آئیں نہ ہی بحث و مباحثہ کی کوئی ضرورت ہے۔ اور اگر ارمڑ سے کوئی شخص بھی یہاں آ گیا۔ تو حکیم خان گڑھی کے باشندے ان کو قتل کر دینگے۔ کیونکہ سب نے اسلحہ سنبھال لیا ہے''۔
یہ طیش دلانے والی اطلاع پا کر موضع ارمڑ کے لوگ بھی بھپر گئے۔ اور بیک آواز انہوں نے بھی آناً فاناً بندوقیں اٹھالیں۔ گویا صورت حال نے خطرناک ہنگامی شکل اختیار کی۔ مگر میں نے سب کو سمجھا بجھا کر کہا کہ یہ بات اچھی نہیں اور ان کو منع کر دیا۔ اور اسی طرح صبح کو میں ٹانگے میں بیٹھ کر حکیم خان گڑھی روانہ ہو گیا۔
حکیم خان گڑھی اور موضع ارمڑ کے درمیان قریباً دواڑھائی میل کا فاصلہ ہو گا۔ خیر گڑھی حکیم خان کے قریب سرکاری پن چکیوں کے قریب ہم نے ٹانگہ رکوا دیا۔ وہاں امیر شاہ خان پہلے سے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھا۔ تو دور سے مسکرایا پھر میرے پاس آ کر کہنے لگا۔ کہ ''حمزہ صاحب! ہمارا ملا صاحب تو راتوں رات کہیں بھاگ کر رفو چکر ہو گیا ہے۔ اب اگر آپ لوگوں کو ہماری مہمان داری اور تواضع قبول ہو تو چشم ما روشن دل ماشاد۔ بصد شوق تشریف لے آئیے۔ ورنہ بحث و مباحثے کا قصہ ختم ہی

ہوگیا ہے۔'' میں نے اسے کہہ دیا کہ'' اگر آپ لوگ شریف خان سے کوئی تعرض نہ کرتے ہوں۔ تو بہت خوب! کیونکہ ہمیں بھی مناظروں اور مجادلوں میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اور نہ ہی اس کے قائل ہیں۔ لہذا ہم یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔ امیر شاہ خان نے وعدہ کیا کہ ان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اور شریف خان پوری آزادی سے حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا رہے۔ اس یقین دہانی کے بعد ہم خوشی خوشی موضع ارمڑ چلے آئے۔

اور یہی دن تھا کہ دوپہر کے وقت ایک اور شخص نے آ کر ہمیں بتایا کہ'' آپ لوگوں کے آنے سے قبل والی رات کو ملا صاحب نے خواب میں دیکھا۔ کہ وہ اپنی مسجد میں بیٹھا ہے۔ کہ یکا یک ایک ایک مہیب شیر جبڑے کھولے ہوئے مسجد کے اندر داخل ہوگیا۔ مارے خوف کے ملا صاحب پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اور دہشت زدہ ہو کر بھاگ جانے کے لئے مسجد کے جس دروازے کا رخ کرتا تو خوفناک درندہ ادہر آ موجود ہوتا۔ صبح اٹھا تو سراسیمگی کی حالت میں پاؤں سر پر رکھ کر بے تحاشہ وزیر گڑھی کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں پر ایک دوسرے ملا صاحب کو اپنا ہمنوا بنانا چاہا۔ کہ فلاں شخص مجھ سے بحث کرنے کے لئے آ رہا ہے۔ اور دہی ملا صاحب بھی اس کا ساتھ دے۔ خود حکیم خان گڑھی کے ملا کو تو صبح سے بخار کا عارضہ بھی ہوگیا تھا۔ بہر حال وزیر گڑھی کے ملا صاحب نے علیل امام مسجد کو سمجھا دیا۔ کہ بحث کرنے والے اگر وہی حمزہ شنواریؒ ہوں۔ جنہوں نے (تجلیات محمدیہؐ) نامی کتاب لکھی ہے تو ان سے مباحثہ کرنا فضول بات ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اس کتاب میں ہر قسم کے سماع کو جائز نہیں کہا ہے۔ البتہ مشروط سماع کی بات الگ ہے۔ اور جس کی ممانعت بھی نہیں ہے۔ لہذا اگر وہ یہاں تشریف لے آئیں تو ظاہر ہے کہ یہی دلائل پیش کریں گے۔''

بہر حال ملا صاحب کو بخار نے نہ چھوڑا۔ اور چند روز کے بعد اس کی موت واقع ہوگی۔

صرف پندرہ:۔

مولانا محمد روشن صاحب (جو بقید حیات ہیں) کہتے ہیں۔ کہ ایک روز گھر کی بعض ضروریات نے مجھے بیحد پریشان کر دیا۔ اور کچھ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا قدم اٹھاؤں؟ حساب لگایا۔ تو پندرہ روپوں کی فی الفور ضرورت تھی۔ مگر یہ کہاں سے آئیں۔ یہ میں نہیں سمجھتا تھا۔ بہ امر مجبوری گھر سے باہر نکلا۔ اس وقت حضور بادشاہ جانؒ حسب معمول سلطان سرائے کی ڈیوڑھی میں تشریف فرما تھے۔ اور یہاں اخبار مطالعہ فرمانے کے بعد اکثر اوقات سامنے پٹواریوں کے بالا خانہ میں وضو تازہ فرمانے کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔

خیر تو اخبار پڑھ کر جب حضور بادشاہ جانؒ اٹھے تو مجھے ادہر آنے کا اشارہ فرمالیا۔ سو میں بھی چل

دیا۔ جس وقت ہم بالا خانہ کی بالائی سیڑھی تک پہنچ گئے۔ اور بازار ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تو اسی جگہ حضور بادشاہ جانؒ رک گئے۔ اور ٹھیک پندرہ روپے مجھے عنایت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:۔

''لیجئے ملا صاحب! تو میرے پاس بھی یہی پندرہ روپے ہیں''۔

واسکٹ کی خالی جیبیں:۔

حضور بادشاہ جانؒ کا معمول مبارک تھا۔ کہ نماز عصر ادا فرمانے کے بعد چہل قدمی کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ البتہ جب بقاضائے بشری ذرا کمزور ہو گئے۔ تو تانگے میں بیٹھ کر ہوا خوری کے لئے نکلتے۔ اکثر اوقات حاجی عمر شاہ، غلام سرور علوی مرحوم اور محمد اکرم مشہود علوی ان کے ہمراہ ہوتے۔ اگر کبھی میں بھی پشاور میں ہوتا تو ضرور ان کے ساتھ جاتا۔

محمد اکرم مشہود علی کا کہنا ہے۔ کہ ایک روز حضور بادشاہ جانؒ انکے ہمراہ میں تنہا گیا تھا۔ سوء اتفاق سے اس روز میری جیب بالکل خالی تھی۔ بہر حال بالا حصار کے قریب میدان میں بیٹھ گئے۔ ویسے بھی مجھے دولت مند ہونے کی ہوس تھی۔ مگر اس دن تو جیب ہی خالی تھی۔ اور مجھے برابر اس امر کی تشویش ہو رہی تھی۔ کہ تانگے کا واپس کرایہ کہاں سے آئے؟ رہ رہ کر یہ بات میرے دل میں کھٹکتی تھی۔ خیر تو باتوں باتوں میں حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی واسکٹ نکال کر مجھے دیدی۔ اور ارشاد ہوا کہ:۔

''دیکھو۔ میری بھی سب جیبیں خالی ہیں۔ دولت کہاں سے آئے؟''

موضع غنیمت جان کر میں نے بھی لگے ہاتھوں اوپر تلے سب جیبوں کی خوب تلاشی لی۔ مگر دو عدد رومالوں اور ایک عدد خلال و تسبیح کے سوا باقی کچھ بھی دستیاب نہ ہوا۔ جیبوں کو الٹا کر بھی دیکھا۔ مگر کچھ ہو تو نکلے۔! جب کچھ بھی نہ ملا تو میں نے بھی جوں کی توں واپس کر دی۔ واسکٹ انہوں نے پہن کر تھوڑی دیر کے بعد ارشاد فرمایا کہ:۔

''کہو مشہود! تم کیا مانگتے ہو۔۔؟''

میں سچ کہتا ہوں کہ میں ایک طویل عرصہ سے اسی قسم کے ارشاد کا متمنی تھا۔ اور بلا توقف عرض کر دیا۔ کہ حضورؒ! صرف پانچ ہزار روپے! تا کہ امریکہ کا ایک چکر ہو جائے۔'' میری گزارش سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''مشہود! اگر تم یہ جواب دیتے کہ حج بیت اللہ شریف یا مدینہ منورہ جاؤں گا۔ تو ابھی اور اسی وقت تمہاری آرزو پوری کر دیتا''۔

میں نے عرض کیا کہ'' حضورؒ! ابھی کیسے؟ کیونکہ اس وقت تو آپ کی جیبیں بالکل خالی ہیں''۔ یہ گزارش سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی واسکٹ کی جیبوں سے نوٹوں کے بنڈل نکالنا

شروع کردیئے۔اور پل بھر میں میرے سامنے چھوٹے سے لیکر بڑے نوٹوں تک کا انبار لگ گیا۔ اوراس پر بھی بس نہیں۔ بلکہ پاؤنڈ اور چاندی کے نقد روپوں کے بھی الگ الگ ڈھیر لگا دیئے۔ بارے میں جی ہی جی میں پھولا نہ سمارہا تھا۔کہ حضور بادشاہ جانؒ آج ضرور مہربانی فرمائینگے۔اسی اثناء میں مجھ سے ارشاد ہوا کہ:۔

''کہو اب کیا کہتے ہو؟''

بہر حال مجھے اچنبھا ہورہا تھا۔اور حیرت زدہ ہوکر ان کی خدمت اقدس میں عرض کیا۔کہ''حضور یہ اتنی دولت کہاں سے آ گئی؟ ابھی جب میں نے آپ کی واسکٹ کی تلاشی لی تھی تو۔۔حاشا! وہ تو بالکل خالی تھی۔اور مجھے کچھ ہاتھ نہ آیا تھا''۔ارشاد ہوا کہ:۔

''مشہود! دراصل یہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی جیبیں ہیں۔اور تمہارے ہاتھ اتنے لمبے نہیں کہ ان تک پہنچ سکیں''۔

میں نے بصد التجا گزارش کی کہ''حضورؒ! براہ غریب نوازی میرے ہاتھ بھی لمبے فرما دیجئے۔تب حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''دیکھا جائے گا۔اس کا وقت تو آنے دو''۔

خیر! تو جب ہم واپس آرہے تھے۔تو مولوی عبدالمجید افغانی مرحوم (جو حضور بادشاہ جانؒ کے مرید تھے) اور ارباب تاج محمد خان خلیل مرحوم بھی ہم سے مل گئے۔دونوں حضرات نے حضور بادشاہ جانؒ سے مصافحہ کیا۔اور انہی میں سے مولوی صاحب نے مجھے ایک روپیہ دے کر ٹانگہ لانے کے لئے بھیج دیا۔چنانچہ میں ٹانگہ لے آیا۔اور اسی طرح ہم ڈیرے واپس آ گئے۔

تحقیق:۔

مولوی گل امیر صاحب جو بقید حیات ہیں اور سلسلہ نقشبندیہ میں خلافت بھی رکھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے۔کہ ایک رات کو خواب میں میں نے ایک بزرگ ہستی کو دیکھا۔وہ بزرگ کہہ رہے تھے۔کہ'' پہلوان! مجھے اٹھالو آس پاس چونکہ اور بھی کئی لوگ تھے۔چنانچہ مجھے شبہ ہوا۔کہ نہ جانے کس سے مخاطب ہیں۔اس لئے میں نے کوئی حرکت نہ کی۔تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے صاف طور پر میری طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ''ارے میاں! تم سے کہتا ہوں۔مجھے اٹھالو'' البذا میں نے آگے بڑھ کر انہیں اٹھالیا۔اور قریب پڑے ہوئے ایک تخت پر بٹھا دیا۔صبح ہوئی تو حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔اور خواب کا سارا واقعہ عرض کردیا۔ارشاد ہوا۔کہ''بہتر ہے ہم تحقیق کرلیں گے''۔چند ایام کے بعد میں نے دوبارہ اسی بزرگ کو خواب میں دیکھا وہ یہی فرما رہے تھے۔کہ''پہلوان! مجھے اٹھالو!'' حسب سابق میں نے اسی طرح اٹھا کر تخت پر بٹھا دیا۔مگر اب کی

بار میں نے ان سے دریافت کیا کہ ''حضرت! آپ کون ہیں؟'' انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ ''مودود چشتی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہوں۔ تب میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور صبح جب حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ تو سلام عرض کرنے کے بعد ابھی کچھ اور نہ کہنے پایا تھا کہ حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا۔ کہ ''مولوی صاحب! ہم نے تحقیق کے بعد معلوم کر لیا ہے۔ کہ وہ حضرت مودود چشتی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تھے۔

اٹھارہ برس قبل:۔

حضور بادشاہ جانؒ کے ایک مرید مولوی عبدالرحمٰن (عرف وہابی ملا جو بقید حیات ہیں) کہتے ہیں۔ کہ اٹھارہ برس قبل میں نے خواب میں ایک کہنے والے کو سنا کہ ''عبدالرحمٰن ٹھیک اٹھارہ برس کے بعد تمہارا کام ہو جائے گا''۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خاصہ طویل عرصہ تھا اور جس چیز کی مجھے تلاش تھی۔ تو اپنی آرزو کے مطابق جدوجہد کرتا رہا۔ لوگوں سے ملتا۔ بات چیت ہوتی۔ پھر ان کے طور اطوار اور رکھ رکھاؤ کا خوردبینی نظر سے جائزہ لیتا۔ الغرض تسلی نہ ہوتی تھی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں اور اسی طرح اٹھارہ برس بھی پورے ہو گئے۔ انہی ایام میں ایک روز میں ڈبگری بازار سے گزر رہا تھا۔ یکا یک میری نگاہ ایک خوبصورت اور پرجلال شخصیت پر پڑ گئی۔ قدم رک گئے۔ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ ایک تختے پر جلوہ افروز تھے۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ کیونکہ یہی وہ مقدس ہستی تھی۔ جنہوں نے ٹھیک اٹھارہ سال پہلے مجھے خواب میں بشارت دی تھی۔ کشاں کشاں میں ان کے قدموں تک چلا گیا۔ نہایت خلوص اور مروت سے پیش آئے۔ اس دلربا شخصیت نے پہلے ہی میرا دل موہ لیا تھا۔ اور محبت کے چند اکسیر کلمات نے تو سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ کچھ دیر ان کی متبرک محفل میں بیٹھا رہا۔ اسی اثناء شرکائے محفل میں سے کسی شخص نے (جو مجھے پہلے سے پہچانتا تھا) کہہ دیا کہ ''حضورؒ! یہ مولوی صاحب تو وہابی عقیدہ رکھتے ہیں''۔ یہ بات سماعت فرما کر حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا۔ کہ:۔

''ارے میاں! ہمیں سب کچھ معلوم ہے۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے۔ کہ یہ مولوی یقیناً وہابی ہے۔ لیکن ہے ہمارا وہابی!''

پھر تو میں نے حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت میں حاضر ہونا بھی شروع کر دیا۔ تاہم ابھی تک ناپ تول اور جانچ پرکھ میں مصروف رہا۔ اس دوران میں بھی کوئی تین چار برس گزر گئے۔ حتیٰ کہ مجھے کامل یقین آ گیا۔ کہ یہی وہ اکمل ترین ہستی ہے۔ جس کی مجھے برسوں سے تلاش تھی۔ چنانچہ مزید وقت ضائع کئے بغیر ان کے دست مبارک پر بیعت کر لی۔ فالحمدللہ!

اندرون کھوپڑی:۔

اسی وہابی ملا کا کہنا ہے کہ ایک بار کوہاٹ کے بازار میں میں نے ایک جوڑہ سلیپر خرید لئے۔ مگر قیمت اس وقت ادا نہ کی۔ دکاندار سے سلیپر لے کے یہ کہہ کر پشاور چلا آیا۔ کہ وہاں سے بھیج دوں گا۔ اب اسے میری سستی کہہ دیجئے یا کچھ اور۔ بہرحال مجھ سے یہ کوتاہی ضرور ہوگئی۔ کہ قیمت نہ بھیج سکا۔ اور یہ دکان دار کی مروت ہوگی یا دوسرے معنوں میں اسے بھی یاد نہ رہا ہوگا۔ کیونکہ اس نے بھی یاد نہ دلایا۔ چنانچہ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد میرے ذہن سے بھی یہ بات نکل گئی۔ کہ گویا سلیپروں کی قیمت بھی ادا کرنی ہے؟ مگر اب ایک اور مصیبت نازل ہوگئی۔ اور وہ یہ کہ جس کام کو میں ہاتھ ڈالتا۔ وہ بگڑ جاتا۔ کوئی بات ہی نہ بنتی تھی۔ بارے نحوست مجھ پر مسلط ہو گئی۔ اور اس صورت حال نے ناک میں دم کر دیا۔ چنانچہ میں نے پر درد الفاظ میں اپنے برے دنوں کا ذکر اپنے حضور بادشاہ جانؒ سے کر دیا۔ حضور بادشاہ جانؒ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

''اچھا ہم بابا صاحب (خواجہ خواجگانؒ) سے دریافت کریں گے''۔

اس ارشاد عالی سے کچھ تسلی تو ہوگئی۔ مگر اب انتظار اس امر کا تھا۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ مزید کیا ارشاد فرمائیں گے؟

چند دنوں کے بعد میں نے خواب میں دیکھا۔ کہ حضرت خواجہ بزرگ تشریف لائے ہیں۔ اور حضور بادشاہ جانؒ بھی ساتھ ہیں۔ حضور بادشاہ جانؒ نے عرض کیا کہ مولوی عبدالرحمٰن کو روزگار میں گھاٹا ہوتا ہے۔ اور اسے بغیر کسی وجہ کے نقصان ہوتا ہے'' حضرت خواجہ خواجگان بزرگؒ نے اپنے دست مبارک سے میری کھوپڑی کے اوپر کا حصہ اٹھالیا۔ اور حضور بادشاہ جانؒ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ''دیکھو یہ کیا ہے''؟ حضور بادشاہ جانؒ نے فرمایا۔ ''ایک جوڑا سلیپر کا۔'' چنانچہ میں جاگا۔ تو حیران تھا۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ آخر سوچتے سوچتے اچانک سلیپر کا وہ جوڑا یاد آ گیا۔ جس کی قیمت میرے ذمہ واجب الادا تھی۔ چنانچہ میں نے فوراً اس کی قیمت کوہاٹ کے دکاندار کو بھیج دی۔ اور ساتھ ہی معذرت بھی لکھ بھیجی۔ جس کے بعد وہ تکلیف رفع ہوگئی۔

یہ رقم امانت تھی:۔

ایک روز خود حضور بادشاہ جانؒ سے میں نے دریافت کیا تھا۔ کہ ''حضورؒ! کیا سبب ہے۔ کہ آپ تانگے کا کرایہ اپنی جیب سے ادا نہیں فرماتے'' ۔ ارشاد ہوا کہ۔

''جہاں تک ''اس رقم'' کا تعلق ہے۔ تو یہ میرے پاس بطور امانت محفوظ ہے۔ میں اپنے کپڑوں وغیرہ کے لئے بھی ''اس رقم'' سے ایک پائی بھی خرچ نہیں کرتا۔ ہاں! بامر مجبوری کسی خاص

ضرورت کے مطابق تھوڑا سا خرچ کر لیتا ہوں''۔
یادر ہے کہ یہ اس رقم کا تذکرہ ہے جس کا ذکر محمد اکرم مشہود کے واقعہ میں آ گیا ہے۔

سفید پوش مساکین کے وظائف مقرر تھے:۔

حضور بادشاہ جانؒ نے سفید پوش مساکین کے لئے باقاعدہ طور پر وظائف مقرر فرمائے تھے۔اور ان کو بڑی بڑی رقمیں عطا فرماتے تھے۔مگر کیا مجال کہ کانوں کان کسی کو خبر ہو۔البتہ جب حضور بادشاہ جانؒ کا وصال ہو گیا۔تو کہیں جا کر لوگوں کو اس حقیقت کا پتہ چل گیا کہ ان مساکین میں سو روپے ماہوار سے لیکر چار پانچ سو روپے ماہوار تک وظائف پانے والے حضرات شامل تھے۔ اور یہ انکشاف بھی خود انہی وظائف پانے والے حضرات نے کیا۔ورنہ کسی کو آج تک اس کا علم نہ ہوتا۔

حضور بادشاہ جانؒ کی ایک اور بڑی کرامت:۔

حضور بادشاہ جانؒ کی ایک اور بڑی کرامت وہ ہے جس کو سرفراز حسین نے بیان کیا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ ''میں بھی اپنی شیعہ برادری کی طرح اکثر کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی زیارتوں کے لئے جایا کرتا تھا۔اسی سلسلہ میں ایک بار کربلائے معلیٰ سے نجف اشرف چلا گیا۔زیارت مبارک سے فارغ ہوا۔تو میرا ارادہ واپس جانے کا تھا۔مگر وہاں کے مجاور نے آگاہ کیا کہ آج ٹھہر جاؤ۔اس لئے کہ عموماً اسی رات کو مولائے کائنات مشکل کشا علی علیہ السلام خواب میں تشریف لاتے ہیں۔ اور اکثر لوگ جناب امیر علیہ السلام کے دیدار اقدس سے مشرف ہوا کرتے ہیں''۔یہ بات خوب تھی لہذا میں اسی آسرے میں رک گیا۔رات کو خواب میں دیکھا۔کہ لوگوں کا ایک جم غفیر ایک طرف نہایت تیزی سے جا رہا ہے۔میں نے خواب ہی میں کسی سے پوچھا۔کہ ''بھائی تم لوگ کہاں بھاگے بھاگے جا رہے ہو؟''تو جواب ملا۔کہ'' خوب! بھلے آدمی تمہیں معلوم نہیں کہ مولائے کائنات علیہ السلام تشریف لا رہے ہیں؟'' یہ کہہ کر وہ شخص اسی طرف روانہ ہو گیا۔میں بھی اس کے عقب میں چل دیا۔ اور بالآخر اس مقام تک پہنچ گیا۔ جہاں مولائے کائنات شمس المشارق لو المغارب۔امام لائمہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام رونق افروز تھے۔مخلوق خداوندی باری باری حاضر ہو کر قدم بوسی کی سعادت حاصل کر رہی تھی۔زہے قسمت کہ میری باری بھی آن پہنچی۔ اور خوش نصیب کہ جناب امیر علیہ السلام کی قدم بوسی اور دست بوسی کا اعزاز حاصل کر لیا۔مگر اسی خواب ہی میں جب میں نے ذرا اوپر نگاہ اٹھائی۔اور جناب امیر علیہ السلام کے چہرۂ انور کو دیکھنا چاہا تو بجائے حضرت امیر علیہ السلام کے حضور سید عبدالستار شاہ بادشاہ جانؒ تشریف فرما تھے۔اب

میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور اسی خواب کے دوران ہی مجھے تعجب ہو رہا تھا۔ کہ یا خداوندا یہ کیا اسرار ہے؟ معاً جب دوبارہ دیکھا تو خود امیر المومنین اسد اللہ الغالب علی علیہ السلام تھے۔ اور اب کی بار مجھے مخاطب فرما کر اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔

''سرفراز! مجھ میں اور عبدالستار شاہ میں کوئی فرق نہیں۔ اور جب وہ پشاور میں موجود ہیں۔ تو تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تم انہیں کے پاس جایا کرو''۔

سرفراز حسین کا کہنا ہے۔ کہ ''جب میں پشاور چلا آیا۔ تو یہاں پہنچ کر سب سے پہلے ڈبگری بازار کا رخ کیا۔ وہاں حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں حاضری دی۔ اس وقت قبلہ بے نواؒ تلاوت کلام الٰہی فرما رہے تھے۔ میری آہٹ پا کر قرآن حکیم کو بند فرماتے ہوئے سروقد کھڑے ہو گئے۔ اور میرا استقبال فرمایا۔ میں وفور محبت سے ان کے مبارک قدموں میں گرنے ہی والا تھا۔ کہ دست ہائے مبارک سے مجھے۔۔ تھام کر۔۔ سینۂ اقدس سے لگا لیا۔ اور اپنی زبان فیض ترجمان سے تاکیدی طور پر ارشاد فرمایا کہ

''اس بات کو مخفی رکھنا۔ ظاہر نہ ہونے پائے''۔

سرفراز حسین کا بیان ہے۔ کہ باوجود یہ کہ اس خواب کا علم یا تو میرے خدا کو تھا۔ اور یا پھر مجھے خود۔ لیکن حضور بادشاہ جانؒ کو پہلے سے سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اور مزید برآں اس سے قبل بھی بارہا میں نے حضور بادشاہ جانؒ کے نیاز حاصل کئے تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ اس وقت میری نظروں میں ان کی کوئی خاص وقعت نہ تھی۔ یہاں تک کہ سالہا سال کے بعد تصور میں بھی نہ آتے تھے''۔

بہر حال اس واقعہ کے بعد سرفراز حسین اکثر حضور بادشاہ جانؒ کی مبارک صحبت میں حاضر رہتا۔ اور اہل شیعہ کے ان حضرات کو حضور بادشاہ جانؒ سے حسن ظن اور عقیدت رکھنے کی تلقین کرتا۔ جو حضور بادشاہ جانؒ سے حسن ظن نہیں رکھا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ حضور بادشاہ جانؒ نے زیارت کربلائے معلیٰ کے لئے جو رقم پونڈوں کی صورت میں جمع فرمائی تھی۔ تو ان کا ارشاد تھا کہ وہ بھی سردار علی کے حوالے کر دوں گا۔ تاکہ وہ کربلائے معلیٰ میں ان کو میری طرف سے میری وفات سے قبل وہاں نذر کر دے۔

کرسی نشین تاجدار سادات:۔

سلطان سرائے میں ایک ستون تاحال موجود ہے۔ حضور بادشاہ جانؒ کی چارپائی کے قریب اسی ستون کے اردگرد کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ جن میں لوگ بیٹھتے۔ ستون سے وصل ایک اور کرسی ہوتی تھی۔ جو خصوصی طور پر محمد اکرم مشہودی کی مستقل نشست گاہ تھی۔ اتفاقاً ایک روز اسی کرسی میں بڈھ بیر کے رحیم شاہ بادشاہ نے بیٹھنا چاہا۔ مگر حضور بادشاہ جانؒ نے منع فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''یہ جگہ ماسٹر (محمدؐ اکرم مشہود) کے لئے مختص ہے''
بنا بریں ایک روز میں نے ماسٹر مشہود علوی سے پوچھا۔ کہ یہ جگہ تمہارے لئے کیوں خاص فرمادی گئی ہے۔؟ تو اس نے بتایا۔ کہ بات یہ تھی۔ کہ ایک روز مجھے معلوم ہوا۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ تنہا باہر تشریف لے گئے ہیں۔ تو میں بھی ان کے پیچھے چلا گیا۔ بالا حصار سے کچھ آگے حضور بادشاہ جانؒ سے مل گیا۔ حضور بادشاہ جانؒ نے ازراہ کرم گستری رخ انور میری طرف فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔
''ماسٹر! تمہیں معلوم ہے۔ کہ میں تاج دارِ سادات ہوں۔۔؟''
میں نے عرض کیا کہ ''حضورؒ کا ارشاد بجا ہے۔!'' تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ یہی ارشاد ہوا۔ اور میں نے حسب سابق جواب دے دیا۔ مگر حیرت ہے۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ نے تیسری بار بھی وہی ارشاد دہرایا۔ اور میں نے بدستور وہی جواب دیا۔ البتہ حضور بادشاہ جانؒ کے بار بار ارشاد فرمانے سے میرا دل قسما قسم خیالات اور وساوس کا آماجگاہ بن گیا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی۔ کہ آخر حضور بادشاہ جانؒ کا مقصد کیا ہے؟ بہر کیف اس واقعہ کے ٹھیک تیسری رات میں نے خواب میں دیکھا۔ کہ ایک وسیع میدان میں کئی لوگ جمع ہیں۔ مگر سب کے سب اجلے دھلے سفید اور صاف لباسوں میں ملبوس ہیں۔ میں نے ایک اجلے لباس والے سے دریافت کیا کہ ''یہ لوگ یہاں کس غرض سے جمع ہیں؟'' تو اس نے مجھے بتایا۔ کہ ''یہ سب سادات کرام ہیں۔ اور کچھ دیر میں ان کے شہنشاہ نزول اجلال فرمانے والے ہیں''۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد چاروں طرف سے ایک غلغلہ بلند ہوا۔ ایک شور اٹھا۔ میں نے دیکھا تو حضور بادشاہ جانؒ تاج خسروانہ سر پر رکھے ہوئے بصد انداز تشریف لا رہے ہیں۔
ان کے جلو میں سادات کرام ہیں۔ اور تماشہ یہ کہ حضور بادشاہ جانؒ اپنے متوازن اور میانہ قد اقدس کے باوجود تمام لوگوں سے.....اونچے اور قدآور دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے نگاہ محبت سے دیکھا۔ تو اسی لمحہ میں خواب سے بیدار ہو گیا۔ صبح جب حضور بادشاہ جانؒ کی محفل میں حاضر ہوا تو انہوں نے خود ہی ارشاد فرمایا۔
''کیوں مشہود! اب بھی تمہیں یقین آ گیا یا کچھ شک باقی ہے۔؟''
میں نے عرض کیا۔ کہ حضور! بے شک مجھے یقین آ گیا''۔ تب حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا۔
''اچھا تو بیٹھ جاؤ۔ اس کرسی پر۔۔!''
چنانچہ میں اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس دن سے یہ میرے لئے مخصوص ہو گئی''۔

گئے کہاں تھے! پہنچے کہاں؟:۔

اسی ماسٹر محمد اکرم مشہود علوی کا کہنا ہے۔ کہ ''ایک موقعہ پر میری مالی حالت دگر گوں ہو گئی۔ تو میں اکثر حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں یہ گزارش کیا کرتا تھا۔ کہ ازراہِ غریب نوازی نگاہ کرم سے نوازتے رہا کریں۔ انہی ایام میں ہمیش گل نامی ایک ملنگ بھی آیا کرتا تھا۔ اسی ملنگ نے ایک روز مجھے بتایا کہ حضور بادشاہ جانؒ کسی کا کام نہیں کرتے آؤ کہ آج میں تمہیں حضرت غوث الثقلین قدس سرہٗ کے دربار میں حاضر کرادوں۔ کیونکہ وہاں تمہارا کام یقیناً بن جائے گا۔ لہذا میں ملنگ کے ہمراہ نکل پڑا۔ اور ایک مسجد میں نماز مغرب ادا کرنے کے بعد ہمیش گل ملنگ نے مجھے ہدایت کی کہ سجدے میں جا کر حضرت غوث الثقلین پیران پیر قدس سرہٗ کا تصور قائم رکھوں۔ چنانچہ میں نے اور خود اس نے بھی سجدے میں جا کر تصور جما لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ پر محویت کا عالم طاری ہو گیا۔ تاہم حواس بجا تھے۔ دریں اثناء میں نے دیکھا کہ ہم دونوں ایک دفتر کے پاس کھڑے ہیں۔ جس کے باہر ایک اردلی بیٹھا ہے۔ اس نے ہم سے دریافت کیا۔ کہ تم لوگ یہاں کس لئے آئے ہو؟'' ہمیش گل نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ کہ ''ہم حضرت غوث الثقلین قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کی آرزو رکھتے ہیں'' یہ سنکر اردلی دفتر کے اندر گیا۔ اور لمحہ بھر کے بعد باہر نکل آیا۔ تو بلند آواز سے پکارنا شروع کیا۔ کہ ''محمد اکرم ولد فلاں اور ہمیش گل ولد فلاں کو اندر آنے کی اجازت ہے۔'' تب ہم اندر چلے گئے۔ اور اندر جا کر دیکھا۔ کہ ایک شخصیت کرسی پر جلوہ افروز ہے۔ اور سر جھکائے ہوئے کسی کتاب میں کچھ تحریر فرمایا جا رہا ہے۔ ہمت کر کے ہم دونوں ان کے روبرو کھڑے ہو گئے مگر یا للعجب! جب اس ہستی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہ حضور بادشاہ جانؒ تھے۔ جو کرسی پر رونق افروز تھے۔ چنانچہ ہیبت زدہ ہو کر ہم دونوں نے سجدے سے سر اٹھا لئے۔ اور مسجد سے باہر نکل آئے۔ خیر! دوسرے دن صبح جب میں اور ہمیش گل حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ تو ارشاد ہوا کہ:۔

''کیوں بدمعاشو! رات کو تم کہاں گئے تھے؟
یاد رکھو. اگر آسمان کی طرف بھی اڑ جاؤ یا مشرق و مغرب کی خاک چھاننے نکل جاؤ۔ تو بھی ہمارے جادو سے بچ نکلنا محال ہوگا''۔

جھاڑ پھونک اور عقل:۔

میرے ایام شباب میں فلسفہ میری فطرت ثانیہ بن گیا تھا۔ اور جو چیز بھی مجھے خلاف عقل اور بعید از قیاس نظر آتی تو اس سے صاف انکار کرتا۔ اور اس کو مان لینے کیلئے ہرگز تیار نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک

کہ میں کبھی کبھی حضور بادشاہ جانؒ سے بھی بحث کرنے لگ جاتا۔ مگر جونہی مرشد پاکؒ کی مبارک طبیعت میں ثقل محسوس کرلیتا تو خاموش ہو جاتا!

ابتدائی دنوں میں جھاڑ پھونک اور گنڈوں تعویذوں کو میں از قبیل فضولیات تصور کرتا۔ بات یہ تھی کہ یہ چیز میری عقل سے باہر تھی۔ کہ کس طرح چند آڑی ترچھی لکیروں کو کھینچ لینے سے مرض کا دفعیہ ہو سکتا ہے؟ کم از کم یہ ماننے کے لئے میری عقل ہرگز تیار نہ تھی۔

مگر جب میں نے حضور بادشاہ جانؒ کا ایک عمل دیکھا تو نہ صرف یہ کہ میں کلی طور پر اس کو ماننے پر مجبور ہو گیا۔ بلکہ میرے منکر فلسفی مزاج نے خود بھی جھاڑ پھونک اور تعویذ کی تاثیر کا ایک فلسفہ بنا دیا۔ اور میں مطمئن ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز عقل سے باہر ہو تو آدمی اسے تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اگر ایسی چیز مشاہدے میں آ جائے اور اس کو ماننے پر مجبور ہو جائے۔ تو اس کے بعد غور و فکر کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ معاملہ کے اسباب و علل کو پا لیتی ہے۔ یہی عقل ایک ایسی دلیل اختراع کر لیتی ہے۔ اور پھر خود ہی ایک اور دلیل سے پہلی دلیل کو رد کر لیتی ہے۔ گویا عقل خود اپنی تردید کرتی ہے۔ اور ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ ہم پر یہ بات لازم ہے کہ دین کے امور پر عملدرآمد کریں۔ جن کی بنیاد وحی اور الہام پر استوار ہے۔ اور عقل کے کہنے پر نہیں! اس لئے کہ وہ خود حواس کی محتاج ہے اور اپنے ہی تجربے کی بناء پر معاملات کا فیصلہ کرتی ہے۔

ایک عجیب و غریب عمل:۔

امر واقعہ یہ تھا کہ لنڈی کوتل میں ایک باؤلا کتا کہیں سے آ گیا تھا۔ یہ موذی کتا جس کسی کو بھی کاٹتا تو وہ شخص چند دنوں کے اندر فوت ہو جاتا۔ خود ہمارے گاؤں کے ایک بوڑھے آدمی کو بھی اس کتے نے کاٹا تھا اور وہ چند ہی دنوں کے اندر فوت ہو گیا۔

کتے کو گولی سے اڑانے کے لئے کئی لوگ کوشش کر رہے تھے۔ مگر وہ ہاتھ نہ آتا تھا نہ کسی کو نظر آیا۔ اتنے میں ہمارے گاؤں کی ایک عورت کو بھی کاٹ لیا۔ یہ عورت بڑی مشکل سے اپنے گھر تو پہنچ گئی۔ مگر پہنچتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ اور سب کو یقین آ گیا۔ کہ وہ بھی گزر جائے گی۔ مگر زہے نصیب کہ حضور بادشاہ جانؒ ہمارے گاؤں تشریف لے آئے تھے ان کو خبر دی گئی۔ تو ارشاد ہوا کہ:۔

''گیلی مٹی لے آؤ۔۔!''

چنانچہ ہم نے پاک و صاف مٹی میں پانی ڈال کر اسے گیلا کر دیا۔ اور حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں لے آئے۔ حضور بادشاہ جانؒ نے اس پر کچھ پھونک کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''اس مٹی سے تھوڑا سا لیکر ایک چھوٹی سی گولی بنا دی جائے۔ اور جس جس مقام پر باؤلے کتے کے

زہریلے دانت لگے ہوں۔اس مقام پر صرف دو بار پھرادی جائے۔اس گولی کے درمیان سے اسی کتے کے بال برآمد ہوں گے۔اسی طرح یہ عمل جاری رکھا جائے یہاں تک کہ مٹی کی گولی سے بال برآمد ہونا بند ہو جائیں۔اس کے ساتھ ہی مریضہ بھی تندرست ہو جائے گی"۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ عین میری جوانی کا دور تھا۔اور میں قطعاً اس قسم کی باتوں کا قائل نہ تھا۔ اور قدرتی طور پر تجربے کے لئے یہ موقعہ خوب ہاتھ آ گیا تھا۔چنانچہ گیلی مٹی ہم لے گئے۔اور جس وقت ہم نے "تجربہ" شروع کیا۔تو حسب ارشاد گولی کو گھائل مقام پر ملنے کے بعد بال برآمد ہوتے۔ساتھ ہی مریضہ کو بھی افاقہ ہو رہا تھا۔حتیٰ کہ گولی سے بال برآمد ہونا بند ہو گئے۔اور واقعی مریضہ بھی تندرست ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ اس بات کا شہرہ ہونا تھا۔سو ہوا!! اور آس پاس کے تمام مریض آئے۔سب کے لئے حضور بادشاہ جانؒ نے مٹی دم کر کے دے دی۔اور خدا کی قدرت کہ سب شفائے کاملہ سے ہمکنار ہو گئے۔اور کوئی تجربہ بھی ناکام نہ رہا۔

مذکورہ بالا عورت کے علاج کے دوران ایک بار میں نے ویسے ہی گیلی مٹی کی گولی پر آزمائش کی۔مگر حاشا۔کہ جب گولی توڑ دی گئی۔تو کوئی بال برآمد نہ ہوا۔لیکن جونہی حضور بادشاہ جانؒ کی دم کردہ مٹی کی گولی زخمی مقام پر دوبارہ رگڑ دی جاتی تو گولی کو توڑنے کے بعد باقاعدہ بال موجود ہوتے۔

بس!! اسی روز سے میری فلسفیانہ طبیعت کو شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔اور میری سمجھ میں یہ بات آ گئی۔کہ یہ دنیا ہے۔اور اس دنیا میں کئی ایسے امور اور بے شمار ایسی اشیاء موجود ہیں۔جو ہمارے عقول کی پہنچ سے بالاتر ہیں۔

ہماری عقل کی حد:۔

سچی بات یہ ہے کہ ہماری عقل اس امر پر مجبور ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو زیرغور لا کر نتائج اخذ کرلے۔ جو ہمارے ماحول میں موجود ہوں۔اور ہماری نظروں کے سامنے بھی ہوں۔یا پھر ہمارے تجربہ اور مشاہدے میں آ چکے ہوں۔

بڑے بوڑھوں کی عقول اور مادئین کے ذہن:۔

غالباً 1911ء میں لوگ کہا کرتے تھے۔(جیسے کہ ہمارے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے) کہ عنقریب ایک ایسی چیز آ جائے گی۔جو لوہے کی ہوگی۔ہوا میں اڑے گی۔اور طرفہ تماشہ یہ کہ لوگ بھی اس میں سوار ہوں گے۔جس کا نام ہوائی جہاز ہوگا۔مگر ہمارے چند سفید ریش ایسے بھی تھے۔کہ جب وہ ایسی باتیں سن پاتے تو کانوں کو ہاتھ لگا کر کہہ دیتے کہ "یہ سب کفریات ہیں۔اور ایسی باتوں کو

ہرگز ہرگز زبان پر نہ لانا چاہئے۔اور بالفرض اگر ایسی چیز نازل بھی ہوگئی تو "لکہ سر" (بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی کا نام)۔کے اوپر سے کیسے گزرے گی۔؟"

اب قابل غور بات یہ ہے۔کہ ان سفید ریشوں کا ایسا سوچنے ۔۔اور ایسا کہنے سے یہ تو مطلق لازم نہیں آتا۔کہ وہ نرے بے عقل یا پرلے درجے کے بیوقوف تھے۔بلکہ حق یہ ہے کہ ان کے ماحول میں جو کچھ موجود تھا۔اور جن چیزوں سے وہ پوری طرح آشنا تھے۔تو ان کی عقول اپنے ماحول کے مطابق انہی حدود تک کام دیتے تھے۔اور یہی وجہ ہے کہ ان آشنا چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کو مان لینے کے روادار نہ تھے۔اس لئے کہ عقل اس وقت ایک کلئے کا وجود تسلیم کرتی ہے۔جس کے کچھ نہ کچھ اجزاء اس کے سامنے موجود ہوں۔اور جب تک ایسا نہ ہوگا۔عقل مجبور ہوگی۔اور اس سے سوائے انکار کے اور کچھ بن نہ پڑے گا۔پھر خصوصی طور پر جبکہ ہمارے بڑوں نے موٹر تک کو نہ دیکھا تھا۔تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں۔کہ وہ ہوائی جہاز کا تصور کس طرح قائم کر سکتے تھے؟

اسی مثال کی روشنی میں زمانے کے مادئین کو بھی پرکھ لیجئے۔اور فی زمانہ مادئین تو مادیت کے تلاطم خیز طوفان میں اس حد تک بہہ گئے ہیں۔کہ ایسی باتوں کو ان کی عقول ہرگز تسلیم نہیں کر سکتیں۔بات صاف ہے۔اور وہ یہ کہ ان کے مادہ پرست ذہنوں اور روحانی ماحول میں بعد المشرقین ہے۔

کوئی شک نہیں کہ روحانیت کے بارے میں مادئین کی عقول کے پیش نظر کسی قسم کے بنیادی مقدمات نہیں ہوتے اور نہ ہی کبھی انہوں نے اس ضمن میں فکر کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔بلکہ حالت یہ ہے کہ جب کبھی روحانی قسم کی باتیں انہیں پیش آ جائیں۔تو بجائے مان لینے کے جیسے ان کو مذاق اڑانے کا موقعہ ہاتھ آیا ہو۔ظاہر ہے کہ اس حال میں وہ ایسے ہی معذور و مجبور ہوتے ہیں جیسے ہمارے بڑے بوڑھے تھے۔

مولانائے رومی قدس سرہٗ کا ایک مشورہ:۔

مولانا جلال الدین رومی قدس سرہٗ نے بھی فلاسفہ کے اس اعتقاد پر اعتراضات کئے ہیں۔وہ فرماتے ہیں۔کہ ان فلاسفہ کی مثال ان نابالغ لڑکوں جیسی ہے۔جو مباشرت کی لذت سے نابلد ہوتے ہیں۔اور اگر ان لڑکوں کو اس بارے میں لمبی چوڑی تقریریں بھی کی جائیں۔تو ان کی سمجھ میں خاک نہ آئے گا۔البتہ جب وہ بالغ ہو جاتے ہیں۔اور بزعیم خویش تجربہ کر لیتے ہیں۔تب ساری بات ان کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔آگے چل کر مولانائے رومی قدس سرہٗ ایسے منکر لوگوں سے مخاطب ہو کر مشورہ دیتے ہیں۔کہ ذرا تم دو تین مہینے مجاہدہ کر کے تجربہ کر لینا۔کہ آیا کہ اس ظاہری دنیا میں ایک اور باطنی دنیا کو صاف طور پر محسوس کرتے ہو یا نہیں؟ اور اگر ایسا نہ ہوا تو بے شک مجھے جھوٹا کہہ دو۔

تعویذ محبت:۔

بات گنڈوں، تعویذوں اور جھاڑ پھونک کی ہو رہی تھی۔ حضور بادشاہ جانؒ سے میں نے ایک تعویذ کے متعلق بھی سنا تھا۔ مرشد پاک کا ارشاد گرامی یہ تھا۔ کہ:۔
''ایک آدمی کسی خوبرو عورت کا شیدا اُوالہ تھا۔ وہ منہ بنا کر میرے پاس آیا۔ اور اپنی سرگذشت عشق ومحبت اور حکایت دردو فراق بیان کی۔ میں نے سن کر ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر وہ عاشق زار کب ٹلنے والا تھا۔ بس میرے سر ہو گیا۔ کہ میں اس کے لئے تعویذ محبت لکھ دوں۔ بہ امر مجبوری ''عاشق زن'' سمجھ کر میں نے تعویذ لکھ کر دے ہی دیا۔ چنانچہ عورت اس کے پاس آ گئی۔ لیکن بایں اضطراب واضطرار وہ نیک بخت ''عاشق زر'' نکلا۔ اور غضب یہ ڈھایا۔ کہ اپنی ''محبوبہ'' کو پشاور میں قیمتاً فروخت کر دیا۔ جب مجھے اس افسوسناک واقعہ کی اطلاع مل گئی۔ تو بیحد ملال ہوا۔ اور اسی روز سے میں نے وعدہ کر لیا۔ کہ آئندہ کے لئے کسی کے واسطے بھی تعویذ محبت نہ لکھوں گا۔ چنانچہ اب نہیں لکھتا''۔

عین میں حضور بادشاہ جانؒ حاضر ہو گئے۔:۔

1947ء کا واقعہ ہے کہ ان دنوں میں جذب کی کیفیت کے علاوہ اور بھی بڑی تکلیف میں مبتلا تھا۔ حالت یہ تھی۔ کہ جذب اور صحو ہر دو باہمد گر مشت بہ گریبان تھے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ میں توپ خانہ بازار پشاور صدر میں میاں قائم شاہ کاکاخیل کے ہاں رہائش رکھتا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل میری اہلیہ فوت ہو گئی تھی۔ اور میں تنہا اپنے پیر بھائی میاں صاحب کے ہاں رہتا تھا۔
میاں صاحب پولیس میں ملازم تھے۔ گاہے بگاہے حضور بادشاہ جانؒ بھی ان کے ہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ ان دنوں لوگوں کے ہجوم میں اٹھنے بیٹھنے سے مجھے سخت دہشت ہوتی تھی۔ مزید برآں چوبیس گھنٹے جان کنی کی سی سخت حالت ہوتی۔ اور ہر لمحے مجھے یہ یقین ہوتا کہ بس اسی گھڑی میں دم نکل جائے گا۔
انہی ایام میں مجھے میاں قائم شاہ نے بتایا کہ ایک عورت اسکی طرف مائل تھی۔ میاں صاحب کا کہنا ہے کہ ''مجھے حضور بادشاہ جانؒ کی ارادت میں آئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ اور میں اپنے ذکر و فکر میں مشغول رہتا لیکن اس عورت کے بے پناہ التفات نے میری توجہ بھی اپنی طرف مبذول کرا دی۔ ایک روز وہ عورت مکمل تنہائی میں میرے پاس آ گئی۔ اور آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے قابو میں رہنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر میرے ارادے کے مضبوط قلعے میں نفس امارہ کی فوج نے شگاف پیدا کر ہی دیا۔ اور دوسرے لمحے میں پوری طرح نفس امارہ کے قبضے میں تھا۔ اور

قریب تھا کہ پاس شریعت کو بالائے طاق رکھ کر گناہ کبیرہ سے روسیاہی کی نوبت آ جاتی۔ کہ اسی اثناء میں میرے دماغ میں یکایک زبردست دھما کہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی حضور بادشاہ جانؒ بہ نفس نفیس میرے سامنے تھے۔ اور قسم لیجئے۔ کہ اس وقت میں ہرگز یہ تصور ہی نہیں کر سکتا۔ کہ گویا حضور بادشاہ جانؒ بذات خود میرے سامنے نہیں ہیں۔ کیونکہ میں ان کو عین مین مادی جسم میں دیکھ رہا تھا۔ بس میں لرز گیا۔ مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑ کنے لگا۔ اور ایسا ڈوب گیا۔ گویا میری جان نکل رہی ہو۔ ایک لحظے کے اندر اندر میری اس قسم کی ناگفتہ حالت دیکھ کر وہ عورت گھبرا گئی۔ اور پریشانی کے عالم میں مجھ سے دریافت کیا۔ کہ ''تمہیں کیا ہو گیا اور تمہارا رنگ اسقدر زرد کیوں پڑ گیا؟'' مگر میری حالت غیر ہو گئی تھی۔ ہیبت زدہ ہو کر عورت کو تو اپنی جگہ پر چھوڑ دیا۔ اور خود مسجد کی جانب سرپٹ دوڑ پڑا۔ وہاں جا کر وضو کیا۔ دو رکعت نماز نفل ادا کی۔ بعدہٗ سجدہ میں جا کر توبہ استغفار میں مشغول ہو گیا۔

سیف پنجتن کا ورد:۔

ایک وقت تھا کہ سرائے لنڈی کوتل میں کہیں سے ایک مجذوب آ گیا تھا۔ بڑے زور کی توجہ رکھتا تھا۔ مگر تھا بد کن؟ اس لئے کہ بری توجہ دے کر سرائے سے گزرنے والے ہمارے پیر بھائیوں کو ناحق تنگ کیا کرتا تھا۔ ان بچاروں کو تکلیف دینے میں مجذوب صاحب کو مزہ آتا تھا۔ ایک شب کو جبکہ میں اپنے گھر میں لیٹا ہوا تھا۔ یکایک اس مجذوب کا خیال آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ کہ آخر یہ بدفطرت آدمی ہمارے پیر بھائیوں کو کیوں تنگ کرتا ہے۔ اور کیوں نہ میں خود ہی اس کا کام تمام کر لوں؟ اس خیال کے آتے ہی میں نے حضور بادشاہ جانؒ کی دی ہوئی ''سیف پنجتن'' کا ورد شروع کیا۔ تین چار پڑھی ہوگی۔ اور ابھی ''سیف پنجتن'' کو تیز کرنے میں مصروف ہی تھا کہ اسی لمحہ میں بجلی کی کوند کی طرح حضور بادشاہ جانؒ جیسے مادی جسم میں ہوں۔ ہو بہو میرے سامنے آ موجود ہوئے اور تیز نظر فرما کر ذرا سخت لہجے میں ارشاد فرمایا کہ:۔

''ارے خبردار! یہ کیا کر رہے ہو۔۔؟''

میں سہم گیا۔ اور ''سیف پنجتن'' کا ورد بند کر دیا۔

صبح ہوئی تو حضور بادشاہ جانؒ کے نیاز حاصل کئے بغیر چین نہ آیا۔ لیکن حضور بادشاہ جانؒ ان دنوں سکھر سندھ میں تشریف رکھتے تھے اور آج کل میں آنے والے تھے۔ اس لئے میں پشاور روانہ ہوا۔ جاتے وقت سرائے لنڈی کوتل میں ادھر ادھر دیکھا مگر مجذوب کا پتہ نہ تھا۔ وہ اپنے ٹھکانے میں بھی موجود نہ تھا۔ خیر میں حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت مبارک میں حاضر ہونے کے لئے پشاور پہنچا۔ تو اسی دن شام کے بعد حضورؒ سکھر سے تشریف فرمائے پشاور ہوئے۔ اور جب میں نے

دست بوسی کی۔ تو انہوں نے میرے ہاتھ مضبوطی سے پکڑے۔ اور سب سے پہلے انہوں نے جو ارشاد فرمایا وہ یہ تھا کہ:۔

''یہ تمہارے دل میں کیا آ گیا تھا۔ تم میں اس کے مقابلے کی طاقت کہاں تھی۔؟ کچھ معلوم ہے پیس لیتا تمہیں!''

میں نے آہستہ سے گزارش کی۔ کہ ''حضورؒ! میں تو ''کسی کے'' بل بوتے پر ایسا کر رہا تھا۔ ورنہ مجھ میں تو کوئی طاقت نہ تھی''

بہر حال وہ مجذوب اسی دن سے ایسا فرار ہو گیا کہ آج تک نظر نہ آیا۔

اور حضور بادشاہ جانؒ صاحب فراش تھے!

میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ نماز عصر ادا فرمانے کے بعد حضور بادشاہ جانؒ چہل قدمی فرمانے کے لئے باہر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ مشہودؔ، حاجی عمر شاہ، غلام سرور یا میں ہمراہ ہوتے تھے۔ عموماً دو نفر سے زیادہ آدمیوں کو ساتھ لے جانے پر راضی نہ ہوتے۔ بلکہ بڑا محسوس فرماتے تھے۔ خیر تو جب ہم قصہ خوانی بازار سے ہوتے ہوئے کابلی دروازہ سے باہر نکلتے تو دروازہ کے قریب ہی ایک میوہ فروش کی دکان تھی۔ جو ابتک موجود ہے۔ اور وہی میوہ فروش حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت اقدس میں میوے کی پیش کش کرتا۔ جس کو حضور بادشاہ جانؒ شرف قبولیت بخشتے۔ یہ گویا میوہ فروش مذکور کا معمول تھا۔

مگر ایک روز حضور بادشاہ جانؒ کی طبع گرامی ناساز ہو گئی۔ اور مسلسل کئی دنوں تک علیل رہے۔ انہی دنوں اتفاقاً ایک روز ماسٹر مشہود قصہ خوانی کی طرف نکل گئے۔ میوہ فروش نے دیکھا۔ تو آواز دی۔ مشہود اس کے قریب گئے۔ تو اس نے کہا کہ ''آج آغا جی (حضور بادشاہ جانؒ کے ہمراہ کیوں نہ آئے؟'' مشہود کو تو معلوم تھا۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ نے کئی دنوں سے آستانہ عالیہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔ لہذا میوہ فروش کو بتایا کہ ''حضور بادشاہ جانؒ کئی دنوں سے صاحب فراش ہیں۔ اور سیر کے لئے باہر نہیں نکل سکتے۔'' یہ سن کر میوہ فروش مسکرایا۔ اور کہنے لگا۔ کہ'' خدا نہ کرے ایسا کیوں کہا؟ کیونکہ ابھی ابھی کوئی پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ آغا جی'' حسب معمول'' اسی راستے سے گزر رہے تھے۔ میں نے میوہ نذر کیا۔ انہوں نے شرف قبولیت بخشا۔ اور تشریف لے گئے۔''

نہیں جائے گی۔

لنڈی کوتل ہی کے ایک شخص مسمی سید کمال کے چچا کا چشم دید واقعہ ہے۔ کہ ''حضور بادشاہ جانؒ نے ایک پہاڑ میں سرنگ بنانے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ سرنگ مکمل ہو گئی تھی۔ اور اس کے اندر ریل کی پٹڑی بھی

بجھ گئی تھی۔ لیکن ابھی اس کے اندر کچھ کام باقی تھا۔ اور مزدور برابر مصروف کار تھے۔ انہی مزدوروں میں سے ایک میں خود بھی تھا۔ اور ایک روز دوپہر کو سارے مزدور سرنگ کے اندر پٹڑیوں کے بیچ میں بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ کہ اتنے میں گاڑی کے آ جانے کا وقت ہو گیا۔ گاڑی نے سیٹی دی۔ اور غراٹے کے ساتھ سرنگ کے دہانے تک پہنچ ہی گئی تھی۔ کہ اسی نازک وقت میں کسی نے چلا کر پکارا۔ کہ ''بادشاہ صاحب! گاڑی سرنگ کے اندر داخل ہوا چاہتی ہے۔ اور اندر مزدور بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں''۔ حضور بادشاہ جانؒ نے فی الفور ارشاد فرمایا کہ:۔

''نہیں جائے گی!''

اور دفعتاً ایک جھٹکے کے ساتھ گاڑی عین سرنگ کے دہانے پر آ کر رک گئی۔ ادھر مزدوروں پر قیامت گزری۔ بارے خیریت ہو گئی۔

بزور کرامت:۔

یہاں پر میں عبدالغفور بادشاہ کی ایک کرامت کا بھی ذکر کردوں اور اس کے راوی خود حضور بادشاہ جانؒ ہیں۔ فخر العلماء الاولیاء حضور بادشاہ جانؒ کا ارشاد گرامی ہے کہ:۔

''جب ہم کشمیر میں تھے۔ تو انہی دنوں عبدالغفور بادشاہ نے مجھ سے فرمایا۔ کہ ''یہاں پر ایک کشمیری ملنگ کے پاس رسول کریم ﷺ کے تبرکات اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی تسبیح مبارک ہیں۔ اور چلو کہ ان کی زیارت کرلیں''۔ چنانچہ ہم دونوں اس کے پاس چلے گئے۔ علیک سلیک کے بعد عبدالغفور بادشاہ نے فرمایا۔ کہ ''کشمیری! میرے لئے چرس کا بندوبست کیا جائے۔ ملنگ نے جواب دیا کہ ''سید! مجھے اس کی فرصت نہیں تمہیں خود اپنے لئے انتظام کرنا ہوگا''۔ اس پر عبدالغفور طیش میں آ گئے اور فرمایا کشمیری! تمہارے پاس شیر خداؒ کی تسبیح ہے۔ جلدی سے اس کی زیارت کرادو۔'' مگر اس پر بھی ملنگ راضی نہ ہوا۔ اور کہنے لگا ''نہیں سید! اس کی اجازت نہیں ہے۔'' جذبے میں آ کر عبدالغفور بادشاہ نے اپنی انگلی اٹھائی۔ اور معاً ملنگ کی کسوت دو ٹکڑے ہو گئی۔ تسبیح مبارک باہر نکل آئی جس کو ہم نے جی بھر کر چوم چوم لینے کی سعادت حاصل کی۔ دوسری طرف کشمیری ملنگ کو بزور کرامت تسبیح چومنے کی کارروائی ناگوار گزری۔ چنانچہ انتقاماً اس نے ہم دونوں کو محبوس کر دیا۔ ہم نے بھی حضور خواجہ خواجگان غریب النوازؒ کی خدمت مبارک میں درخواست کی۔ جو منظور ہو گئی۔ اور الٹا کشمیری ملنگ خود قید ہو گیا۔ مگر جلد ہی اس نے ہم سے معافی کی التجا کی جو دے دی گئی۔ بہرحال ہم نے تبرکات کی خوب خوب زیارت کی''۔

باب (۸)

توحیدِ وجودی اور توحیدِ شہودی

حضرت وجود:۔

طبقہء صوفیاء میں کوئی بزرگ اس وقت تک عرفان کامل سے ہمکنار نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی کائنات کے منشاء اور غایت کو معلوم کر سکتا ہے۔ جب تک وہ وجود کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے حکمت اور معرفت کے موتی باہر نہ نکال لائے۔ مگر اس سلسلے میں ملحوظ خاطر رہے کہ اس بحر محیط میں بے خطر کود پڑنا ہر کسی کا کام نہیں۔ کیونکہ اس کام کے لئے آہنی حوصلہ اور جوان ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز اس کام میں ایسے پختہ اور مضبوط ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو ہر طرف سے نا قابل تسخیر ہو۔ کیونکہ یہ وہ مقام ہے۔ جہاں پہنچ کر بڑے بڑوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ حضرت وجود کے سامنے ان کے ذہنوں کی بلند پروازیاں مات کھا گئی ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں اکثر سالکوں کی ہمتیں جواب دے چکی ہیں۔

حضرت وجود کی مطلقیت:۔

ظاہر ہے کہ سلوک کا منشاء حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کی معرفت یعنی خاص وجود مطلق کی معرفت ہے۔ اس لئے کہ وجود عین ذات ہے۔ مطلب یہ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا وجود۔ ذات حق جل وعلا کا غیر نہیں۔ بلکہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت کی بناء بھی وجود ہی پر ہے۔ اس لئے کہ ذات ان خصائص کا نام ہے۔ جن کے ذریعے ہم کسی چیز کو دوسری چیز سے ممتاز یا مختص سمجھتے ہیں۔ اور جہاں تک وجود کا تعلق ہے۔ تو وہ کسی چیز کا "ہونا" یا "بودن" ہے۔ اور یہی "ہونا" یا "بودن" ادراک میں ذات سے اولیت رکھتا ہے۔

رہے وہ لوگ جو وجود کو زائد برذات سمجھتے ہیں۔ متاسفانہ وہ اصلی مدعا تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اور وہ حضرات جو عدم کو حضرت وجود کے مقابلے میں لاتے ہیں۔ وہ شرک خفی کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ اگر عدم کو وجود کے مقابلہ میں کوئی شئے سمجھ لی جائے۔ تو لامحالہ اس کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے مقابلے میں ایک اور شئے کا وجود بھی موجود ہے۔ ورنہ بصورت دیگر تقابل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مندرجہ مذکور عندیئے کے مطابق اگر عدم کا وجود ثابت ہوگا۔ تو ظاہر ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کی ضد اور تقابل معرض وجود میں آجائے گا۔ (دراں حالیکہ اس امر کا مطلق کوئی امکان نہیں) مزید

برآں یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی۔ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا وجود ہی محدود مفہوم ہو جائے گا۔ اس بنا پر کہ ظاہراً حق سبحانہ وتعالیٰ کے محیط سے باہر بھی ایک اور وجود متصور ہوگا۔ جو اس آیت الٰہی کے بالکل خلاف اور قطعی برعکس ہوگا۔

قال اللہ تعالیٰ

(اگر آسمان وزمین میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو (ممکن نہ تھا۔ کہ ان کا کارخانہ اس نظم اور ہم آہنگی کے چلتا) وہ یقیناً بگڑ کے برباد ہو جاتے)

مدعا یہ ہے کہ ہرگاہ جب دوران سلوک میں سالک راہ کا آخری منشاء۔ اور غایت اصلی۔۔ حق اور عین حق سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت ہے۔ تو وجود سے قطع نظر اس کی منزل۔۔ جہاں کہیں اور جس مقام پر رکے گی۔ تو بلاشبہ اس کو اس وقت تک چین نصیب نہ ہوگا۔ جب تک کہ وجود مطلق کی مطلقیت کا احساس نہ کر لے اور اگر ایسا نہ ہوگا۔ تو معرفت نامکمل ہوگی۔

شہود و وجود:۔

راہ سلوک میں توحید کے بارے میں دو قسم کے اعتقادات پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے ایک عقیدے کو وحدۃ الشہود اور دوسرے کو وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔ تو اس سے قبل کہ ان دونوں اعتقادات کے بارے میں کچھ تحریر کیا جائے۔ بہتر یہ ہوگا کہ اولاً محض ''وجود'' کے سلسلے میں چند حقائق قلمی کئے جائیں۔

وجود مادی چیز نہیں ہے:۔

وجود اگر کوئی مادی چیز ہوتی۔ تو اس کی تعریف وتشریح کرنے کے لئے وہ تمام اصطلاحات استعمال میں لائے جاتے۔۔ جو ایک مادی چیز کی تعریف اور تشریح کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ مگر یہ کوئی مادی چیز نہیں ہے۔ نہیں تو اس لئے جب یہ حقیقت ثابت ہوگئی۔ کہ وہ ہرگز مادی چیز نہیں ہے۔ تو لامحالہ جسم بھی نہ ہوگا۔ کہ ایک طرف تو اپنی ذات پر قائم ہو۔ اور دوسری طرف مخلوق بھی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وجود خود ہی اپنی ذات پر قائم ہے اور مخلوق بھی نہیں۔ ان حقائق کی روشنی میں جبکہ وہ جوہر بھی نہ ہو۔ اور مخلوق بھی نہ ہو۔ تو معلوم ہوا کہ عرض بھی نہیں ہو سکتا۔ اس سبب سے کہ عرض اپنے قیام کے لئے غیر کا محتاج ہوتا ہے۔ اور یہی حال جوہر کا بھی ہے۔ کیونکہ وہ بھی غیر کا محتاج ہوتا ہے۔

حضرت شیخ محی الدین ابن العربیؒ کا قول کلی:۔

حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ کا ارشاد ہے۔ کہ ''لفظ وجود دو معنوں میں مستعمل ہے۔ (جس کا فارسی ترجمہ ''بودن'' اردو میں ''ہونا'' ۔۔اور پشتو میں ''شتہ'' ہے) یہ ایک مصدری مفہوم ہے۔ یہ بھی دیگر مفاہیم کی طرح اعتباری حیثیت رکھتا ہے۔اور منجملہ ان معقولات ثانیہ میں سے ہے۔ جو خارج کے ظرف میں منشائے واحدہ کے علاوہ کوئی دوسری حیثیت نہیں رکھتا۔ البتہ ذہنی تصور کے اعتبار سے اشیاء کے لئے عارض ہے۔ حکماء اور متکلمین بھی اسی مصدری مفہوم کو اعتباری چیز سمجھتے ہیں''۔

اس کے بعد حیرت شیخ اکبرؒ وجود کے دوسرے مفہوم کو لیتے ہیں۔ اور اس سے متعارف کراتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ'' وجود کا دوسرا مفہوم علی الاطلاق وہ حقیقت ہے جو بغیر احتیاج ، بغیر ذحلول ، بغیر مکان اور بغیر زمان کے قائم اور موجود ہو۔ یہی عین ذات ہے۔ یعنی حکماء کے مذہب کے رو سے یہی واجب لذاتہ ہے۔اور جو کچھ بھی خارج میں موجود ہے۔ یہ سب اسی ایک واجب الوجود کی وجہ سے ہے۔اور اسی کو منسوب! یہ الفاظ دیگر ممکنات کا وجودِ حقیقی کوئی نہیں بلکہ عکس یا ظل ہے۔تو اس اعتبار سے جب وجود حق سبحانہٗ وتعالیٰ میں منحصر ہے۔تو بس یہی اصل ہے۔اور باقی تمام اشیاء کی ماہیتیں اس کے عوارض ہیں''۔

وجود کے مختصر معنے:۔

اب گویا وجود کے دو معنے مفہوم ہوئے۔اولاً وجود بالمعنی مصدری یعنی'' شتہ '''' بودن'' یا ''ہونا'' تو جس وقت ہم یہ لفظ منہ سے نکالتے ہیں۔تو ہمارے ذہن میں ''بودن'' ''شتہ'' یا ''ہونا'' یا کسی ہستی کا ایسا تصور پیدا ہو جاتا ہے کہ دوسری اشیاء کی طرح ہم کو اس کا وجود خارج میں نظر نہیں آتا۔ اور ثانیاً وجود کے مفہوم کی تعریف یہ ہوئی کہ وہ چیز جو موجود اور قائم بالذات ہو۔

یہ بھی نہیں:۔

بعد ازیں ہم اس حقیقت پر غور کریں گے کہ ہمارا وجدانی حس کیسے اور کیوں کر وجود کا ادراک کرتا ہے؟ کیونکہ ابھی ابھی یہ صراحت کردی گئی۔ کہ وجود نہ روح ہے، نہ مادہ، نہ جسم اور نہ ہی جوہر یا عرض ہے۔تو امر واقعہ یہ ہے۔ کہ وجود کی کما حقہ، تعریف تو ہو نہیں سکتی۔ البتہ زبان ولغت کے رو سے جہاں تک ہو سکتا تھا۔ علی قدر طاقت ہم نے وہ تعریف کردی۔ اس کے بعد ہم وجود کے بارے میں وجدانی تحقیق کا خلاصہ روشنی میں لائیں گے۔ اس لئے کہ کسی چیز کی ماہیت اور اصلیت کو پالینے

کے لئے وجدان ایک آخری اور حتمی درجہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

غور فرمالیجئے:۔

اب ذرا غور فرمالیجئے۔ کہ بالفرض ایک آدمی کرسی پر بیٹھا ہے۔ کرسی میز پر دھری ہے۔ اور میز زمین پر پڑی ہے۔ تو فرمایئے کہ زمین کس چیز میں پڑی ہے۔؟ اگر سائنسدانوں کے نظریہ کے مطابق سارے اجرام ایک دوسرے کی کشش پر قائم ہوں۔ تو پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ پر قائم ہے۔ کہ چلے پھر یہ بتا دیجئے۔ کہ یہ ساری چیزیں کس چیز میں پڑی ہیں؟ ظاہر ہے کہ آخر کسی چیز میں تو پڑی ہوں گی۔ اور مختصر الفاظ میں یہی وجود ہے۔!

کائنات عالم فعلیت مطلقہ کے اجمال کی تفصیل ہے:۔

وجود کی تعریف یوں بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ ہر وجود نمود چاہتا ہے۔ اس بناء کہ کسی چیز کا وجود اس وقت تحقیق کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک اس کی نمودی صفت موجود نہ ہو۔ اور اگر وہ اس صفت سے متصف نہ ہو۔ تو اس صورت میں نہ تو ہم کسی چیز کے وجود کا احساس کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی اس کی نفی یا اثبات پر کوئی دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ تو اس صورت حال میں ہم حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کی نمود کو کس طرح تصور میں لائیں گے؟ اور عوام الناس نے جس طور پر حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کو محسوس کیا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ بغیر نمودی صفت کے تو اس کا احساس مطلق نا ممکن ہے۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی نمودی صفت کیا ہوئی۔۔؟

تو بات صاف ہے۔ کہ کائنات عالم ہی حق سبحانہ وتعالیٰ کی نمودی صفت ہے۔ اس بناء پر کہ کائنات عالم ہی فعلیت مطلقہ (حق سبحانہ وتعالیٰ) کے اجمال کی تفصیل ہے۔ خارج میں کائنات عالم کا تنوع اور اختلاف محسوس ہوتا ہے۔ مگر ذات میں اس قسم کے اختلافات کا نام ونشان نہیں ہے۔ چنانچہ آج کا سائنس دان بھی ہمیں یہ یقین دلاتا ہے۔ کہ ظاہر میں دکھائی دینے والے مختلف رنگ بحیثیت مجموعی آفتاب میں موجود ہیں۔ مگر آفتاب کے وجود میں ان رنگوں کی گوناگونی کا کوئی تعین نہیں ہے۔

اگر ہم اللہ تعالیٰ جل جلالہ کو کائنات کی علت تسلیم کر لیں۔ اور فی الاصل (حقیقت بھی یہی ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ ہی کائنات کی علت ہے) تو پوشیدہ نہ رہے کہ ممکن یا حادث کیلئے علت بھی حادث اور ممکن ہوگی۔ اور یہ قطعی ناممکن ہے کہ علت قدیم ہو۔ اور اس کا معلول حادث ہو۔ اس لئے کہ قدیم کی علت بھی قدیم ہوگی۔ اور یہ اس لئے کہ علت اور معلول ہر دو متحد ہوتے ہیں۔ اور ان کا تصور الگ الگ قطعاً نہیں ہو سکتا۔

مثال کے طور پر اگر کسی لکڑی سے میز بنادی جائے۔تو کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس حال میں میز اور لکڑی ایک دوسرے سے جدا متصور نہ ہوں گے۔اگر چہ علت مادی کا اطلاق علت فعلی پر نہیں ہوتا۔اور یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے خطبات میں لکھا ہے۔کہ ''آیا تم یہ سمجھتے ہو کہ کائنات حق سبحانہ وتعالیٰ کے آگے یوں پڑے ہیں۔جیسے ان کے درمیان کسی قسم کا فاصلہ یا بعد تصور میں لایا جا سکتا ہے؟ اگر تم نے یہ فہم کیا ہو تو حق سبحانہ وتعالیٰ کو محدود ثابت کرلو گے۔کیونکہ کائنات حقیقت میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی لا احصی اور لا متناہی قدرتوں کا اظہار ہے۔'' (خطبات)

افہام و تفہیم :۔

تو مدعا یہ کہ کائنات حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کے اجمال کی تفصیل ہے۔اور اگر ہم حق سبحانہ وتعالیٰ کو تخم کا دانہ تصور کرلیں۔تو کائنات کو درخت سے تعبیر کریں گے۔اور اگر نقطہ سمجھ لیں تو کائنات کو دائرہ کہیں گے۔مگر بطور انتباہ یاد رہے کہ مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا یہ سب افہام و تفہیم کے لئے بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔حق سبحانہ وتعالیٰ اس سے بہت بلند اور وراء الوراء ہے۔

وحدۃ الوجود :۔

بہر حال یہ متحقق ہے۔کہ وجود صرف ایک ہے اور بلا شبہ وہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا وجود ہے۔یہ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے۔یا وہ جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے۔فی الحقیقت وجود حق سبحانہ وتعالیٰ سے متعلق ہیں۔مطلب یہ کہ جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں۔تو وہ سب اسم الظاہر کا ظہور ہے۔اور جو چیزیں مخفی ہیں۔وہ اسم الباطن سے عبارت ہیں بذات خود اشیاء کا کوئی وجود نہیں۔اور یہی مجاہدے کی غایت اور معرفت کی انتہا ہے! جسے وحدۃ الوجود کہتے ہیں اور امت کے بہت سے عظیم المرتبت اور بلند پایہ اولیاء اللہ قدس اسرار ہم اس کے قائل ہیں۔

وحدۃ الشہود :۔

لیکن اس کے علاوہ حضرات صوفیہ کی ایک اور جماعت ایسی بھی ہے۔جو اس عقیدے پر کار بند ہیں۔کہ اعیان ثابتہ (جو اسماء کے مظاہر ہیں) حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود میں نہ تھے۔لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے ارادہ فرمالیا تو ان کا (اعیان) وجود خود بخود ظہور میں آگیا۔اور وہ اس طرح کہ سب سے پہلے حق سبحانہ وتعالیٰ نے وجود کو تخلیق فرمالیا۔یعنی بزعم خود حق سبحانہ وتعالیٰ وجود نہ رکھتا تھا۔جو ایجاد کے لئے ضروری تھا۔اور ایجاد اس کو ثابت کرتی ہے۔خیر تو جب وجود پیدا کیا گیا اس کو متعین فرمالیا گیا۔تو اس سے صفات کا ظہور ہوگیا۔من بعد انہی صفات سے اعیان پھر

ارواح اور آخر میں عالم خلق کا ظہور ہو گیا۔ یعنی عالم خلق صفات کا سایہ یا ظل ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ گویا صفات جو بذات خود ظل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا بھی ظل پیدا ہو گیا۔ بہ الفاظ دیگر سائے کا سایہ ظہور میں آ گیا۔ جو صریحاً خلاف عقل ہے۔

بہر حال ان کے عقائد کے بموجب مشہود صرف ذات حق سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ اور وجود کی وحدت ممکن نہیں۔ اسی عقیدے کو وحدۃ الشہود کہتے ہیں۔ یعنی ہر شئے میں ذات واحد عز اسمہ کا مشاہدہ۔ یا یوں کہہ دیجئے۔ کہ "ایک دیکھنا"۔

وحدت الوجود اور وحدالشہود میں فرق:۔

مگر یاد رہے کہ وحدۃ الوجود کا مطلب ہے "ایک ہونا" اور شہودی توحید میں چاہے ذات واحد کا کتنا ہی مشاہدہ نہ ہوتا ہو۔ مگر اس مسلک کے سالک کے قلبی پس منظر میں لابدی طور پر یہ وسوسہ موجود رہتا ہے۔ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے علاوہ دیگر اشیاء بھی موجود ہیں۔ اور یہ امر مشاہدہ اور معرفت کی کمی اور کوتاہی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوئی بہر تقدیر موجود رہتی ہے۔ اس کے برعکس اگر بوقت مشاہدہ ماسوی اللہ کا وجود یکسر ختم ہو جائے اور سالک پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ سوائے حق تعالیٰ جل وعلا کے اور کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی موجود ہے وہی حق سبحانہ وتعالیٰ ہے۔ تو پھر شہود اور وجود کا مسئلہ محض لفظی اختلاف تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور کوئی اساسی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

داعیان وحدت الشہود:۔

وحدۃ الشہود کے داعیوں میں حضرت شیخ سرہندی مجدد الف ثانی رحمت اللہ علیہ کا نام نامی سرفہرست ہے۔ ان سے قبل بھی جو سالکین شہودی توحید کے قائل رہے ہیں۔ ان کو بھی اسی گروہ صوفیہ میں شامل سمجھ لینا چاہئے۔ بہر حال اصطلاح عام میں وحدۃ الوجود ہمہ اوست اور وحدۃ الشہود ہمہ از وست سے مشہور ہیں۔

عدم اور نمودی صفت:۔

مگر یہاں پر یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کہیں یہ تصریح کی ہے کہ اگر ہم عدم کو بھی کوئی شئے تسلیم کر لیں تو لازمی ہے کہ اس کا وجود ہو گا۔ اور جب اس کا وجود ثابت ہو گا۔ تو لامحالہ وہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود کی ضد ہو گا۔ اور جب عدم کا وجود ثابت ہو گا تو بالضرور نمودی صفت بھی رکھتا ہو گا۔ اس لئے کہ بغیر نمودی صفت کے تو کسی وجود کے متحقق ہونے کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا۔ اور جب وہ بھی نمودی صفت سے متصف ہوگا۔ تو بالیقین حق سبحانہ وتعالیٰ کی نمودی صفت سے متصادم ہونا لازم آجائے گا۔ اس لئے کہ عدم بھی بجائے خود ایک وجود کی حیثیت سے ممتاز ہوگا۔ جیسے ''الف'' اور ''ب'' ایک دوسرے کے مقابلے میں امتیاز رکھتے ہیں تو اس حال میں نمودی صفات ایک دوسرے سے متصادم ہوں گے۔ اور قرآن حکیم کے اس ارشاد کی صداقت واضح ہوجائے گی: کہ اگر دو خدا ہوتے تو نظام بگڑ جاتا۔

عدم کے معنی؟ ممکنات کی اصل! عدم کے معنی؟ کچھ بھی نہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ عدم ہی کو جملہ ممکنات کی اصل سمجھتے ہیں۔ مگر عدم کو نیستی کے معنوں میں بھی لاتے ہیں۔ اور جس وقت ممکن الوجود عدم میں منطبع ہوجاتا ہے۔ تو ظاہر ہوجاتا ہے۔ یعنی ایک ''چیز نیست'' میں منطبع ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ مطلق ممکن ہی نہیں کہ کوئی چیز ''نیستی'' میں منطبع ہو سکے۔ اور باوجود یہ کہ حضرت مجددؒ حضرت یوسف علیہ السلام کی اصل کو عدم نہیں مانتے۔ اور انہیں عدم کے اتصال کے بغیر فہم کیا ہے۔ لیکن اس کے باوصف حضرت یوسفؑ کو ممکن الوجود بھی تسلیم کیا ہے۔ حالانکہ اصولاً چاہئے تو یہ تھا۔ کہ اگر ہم ''ممکنات'' کی اصل کو ''عدمات'' فہم کرلیں۔ اور پھر اس کا اطلاق خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاءؑ پر بھی کرلیں۔ تو اس کلیہ سے کس بناء پر حضرت یوسفؑ کو مستثنیٰ کریںگے؟

کیا تعین اول سیدنا حضرت ابراہیمؑ تھے؟:۔

لیکن یہ حضرت مجددؒ کی ایک خاص معرفت ہے۔ جنہوں نے ساری امت کے برخلاف حضرت ابراہیمؑ کے وجود کو تعین وجود مان لیا ہے۔ اور اسی کو تعین اول کہہ دیا ہے۔ ساتھ ہی رسالت پناہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا جزو کہہ دیا ہے۔ حالانکہ ساری امت حضرت رسالت پناہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تعین اول تسلیم کرنے اور کائنات عالم کو اس کے اجزاء ماننے پر متحد و متفق ہے۔

عدم۔۔ اور علم:۔

اگر غور کیا جائے تو عدم کا وجود اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ کہ صرف اس کے الفاظ یعنی ''ع''، ''د'' اور ''م'' تحریر کئے جائیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عدم ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہ ایک چیز کے اجزاء کا اتصال سے ماقبل نیستی کی دلیل ہے۔ مثلاً ایک کمرے کو لے لیجئے۔ یعنی جب تک اس کمرے کے اجزاء متصل نہ ہوئے تھے۔ تو کمرہ عدم تھا۔ لیکن جب اس کے اجزاء کا اتصال ہوگیا۔ تو کمرے کا وجود ثابت ہوگیا۔ اب اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں نکلتا۔ کہ اشیاء کا ظہور

میں آ جانے سے قبل سرے سے حق سبحانہ وتعالیٰ کے حضرت علم میں ہی نہ تھیں۔ لیکن جب حق سبحانہء نے ارادہ فرما لیا۔ کہ ان کا ظہور ہو جائے تو ''نیست'' یا عدم میں منطبع فرما لیا۔ اگر ''نیستی'' یا عدم نہ ہوتا تو حق سبحانہ وتعالیٰ اشیاء کو پیدا ہی نہ فرما سکتے تھے؟ العیاذ باللہ۔

عدم کس کونے سے ایجاد ہوا؟:۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام ظاہری اشیاء حق سبحانہ وتعالیٰ کے **اسم الظاھر** سے اور ساری مخفی چیزیں **اسم الباطن** سے ظہور میں آ گئی ہیں۔ اور بقول حضرت مجددؒ نہ تو عدم حق جل وعلا سے سابق ہے اور نہ ہی لاحق ہے۔ حق سبحانہء وتعالیٰ کا وجود محیط ہے۔ اور اس محیط میں سوائے وجود کے اور کوئی چیز نہیں سما سکتی۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ عدم حضرت پیدا کہاں سے ہو گیا اور کیونکر پیدا ہو گیا؟ مزید برآں حضرت مجددؒ کا قول ہے۔ ''عدم نے علم میں جگہ پیدا کر لی ہے''۔ اب اگر اس جملے پر غور کریں۔ تو شک نہ کریں گے۔ کہ عدم نے علم میں جگہ پیدا کی ہے۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھیں گے۔ کہ ممتنع الوجود نے بھی علم میں جگہ پیدا کی ہے۔ تو آیا ممتنع الوجود بھی کوئی وجود رکھتا ہے۔؟

حق سبحانہء وتعالیٰ کی کوئی ضد ممکن نہیں:۔

علاوہ ازیں اگر یہ کہا جائے کہ چیزیں اپنی اضداد کی بناء پر پہچانی جاتی ہیں۔ تو اس لحاظ سے جب عدم وجود کی ضد ہو گا۔ تو ظاہر ہے کہ عدم کا وجود بھی متحقق ہو گیا۔ اس اعتراض کا ایک جواب تو ابھی ابھی ہم نے دے دیا ہے کہ ممتنع الوجود بھی مرتبہ علم میں محسوس ہے۔ لیکن اس کا وجود متحقق نہیں۔ دوسری ضروری بات یہ ہے۔ کہ اضداد کے اصول کا تعلق ممکنات اور مرکب اجسام تک ہے۔ اور اس سے آگے نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اضداد کے اصول کا اطلاق وجود پر کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ وجود عین ذات حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اور حق سبحانہء وتعالیٰ کی کوئی ضد۔ نہ متصور ہے۔ اور نہ ممکن ہے۔ اور اگر ہم حق سبحانہ وتعالیٰ کی ضد مان لیں۔ تو ایسا کرنے سے حق سبحانہ وتعالیٰ بھی ممکنات کے زمرے میں آ جائے گا۔ یہ بھی ہے کہ اگر ہم حق سبحانہ وتعالیٰ کی ضد مان لیں۔ تو ظاہر ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ قدیم ہے۔ بنابریں لازم آئے گا۔ کہ اس کی ضد بھی قدیم ہو۔ حالانکہ سوائے حق تعالیٰ جل وعلا کوئی شئے بھی قدم کے مرتبہ پر فائز نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تعدد قدما کے بھی قائل نہیں ہو سکتے۔

ان حقائق کی روشنی میں جبکہ سوائے حق سبحانہ وتعالیٰ کے کوئی دوسری شئے قدیم نہیں ہے۔ تو ثابت ہوا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی کوئی ضد نہیں۔ یہ اس لئے بھی کہ حق سبحانہء وتعالیٰ ہمیشہ سے موجود ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے موجود رہے گا اور ضد کی صورت میں لازمی ہو گا۔ کہ اس کی ضد بھی ابدی طور پر

موجود ہو۔ کیونکہ یہ تو کسی طور پر ممکن نہیں کہ ایک چیز خود تو پہلے سے موجود ہو۔ لیکن اس کی ضد کچھ عرصہ کے بعد پیدا ہو جائے؟

عدم کے وجود کا تصور اور قائلین وحدۃ الشہود:۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ ''ہونے'' یا وجود کے تصور سے ضروری طور پر ''نیست'' یا عدم کا تصور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یا جس وقت وجود تھا۔ تو عدم بھی موجود تھا۔ یعنی یہ کہ وجود کی موجودگی خود بخود عدم کی موجودگی کی دلیل ہے۔ تو اس قسم کا تصور کا امکان قائلین وحدۃ الوجود میں تو مطلق نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ وہ وجود کو ''محسوس'' مانتے ہیں۔ یا بہ الفاظ دیگر بدیہی مانتے ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں تو یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ البتہ رہے قائلین وحدۃ الشہود؟ تو ان کے ذہنوں میں یہ تصور جنم لے سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ وجود کو بدیہی نہیں مانتے۔

عالم اضداد میں اضداد کی خوگری:۔

دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم اضداد میں ہم تضاد کے خوگر ہو گئے ہیں۔ اور ممکنات میں بھی ہر طرف تضاد ہی کا اصول کارفرما ہے۔ بلکہ یہاں تک کہ سارے کا سارا کارخانۂ ہستی اضداد ہی کے اصول پر رواں دواں ہے۔ اور اسی کارخانہء عالم میں منفی اور مثبت ہر دو طاقتوں کا ردعمل جاری و ساری ہے۔ لیکن! جس وقت ہم وجود کی بداہت تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ تو اس وقت سمجھ میں آ جاتا ہے۔ کہ کائنات کی کثرت بس ایک ہی وجود کے اندر ہے۔ بعینہ ایسے جیسے تخم کے دانے میں پورے درخت کا وجود ہوتا ہے۔ یا پھر نقطے میں دائرے کا تصور فرمالیجئے۔ بہر حال اسی وقت یہ بات ہماری سمجھ میں آ جاتی ہے۔ کہ اس مقام میں اضداد کا وجود۔ وجود مطلق کے محیط میں۔ مطلق نابود ہے۔ یہاں وہ تعین کی حدود سے نکل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ گویا بہر نوع ماورائے ادراک ہوتا ہے۔ جیسے آفتاب میں مختلف رنگ ہوتے ہیں۔

حق سبحانہ وتعالیٰ اور ظرفیت:۔

وجود مطلق کے مقابلے میں عدم کے امکان کے ہم اسوقت قائل ہوں گے کہ کسی حد تک ذات کا وجود فرض کر لیں۔ اور ذات باری تعالیٰ عزوجل کے وجود کے محیط سے باہر محض خلا فرض کر لیں۔ یا پھر ان سے قطع نظر کوئی ایسا عالم تصور میں لے آسکیں۔ جہاں حق سبحانہء وتعالیٰ کا وجود نہ ہو۔
ظاہر ہے کہ اگر ہم ایسے امور کو ممکن سمجھ لیں۔ تو کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ کہ تب حق سبحانہ وتعالیٰ کا وجود محدود ثابت ہو جائے گا۔ اور اسی بناء پر قدیم اور قادر مطلق نہ رہے گا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس

تعالیٰ شانہ کے لئے ایک خارج بھی متحقق ہو جائے گا۔ اور جب اس تعالیٰ جدہ کا خارج متحقق ہو گا۔ تو داخل بھی خود بخود ثابت ہو جائے گا۔ اور اگر معاملہ یوں تصور کیا جائے۔ تو ''ظرف'' ہو جائے گا۔ اور یہ قطعی ناممکن ہے۔

ظرفیت کے کونسے لوگ قائل ہو سکتے ہیں:۔؟

اگر چہ وہ صاحبان غیر شعور طور پر حق سبحانہ وتعالیٰ کی ظرفیت کے قائل ہو گئے ہیں۔ جو صفات کو زائد برذات سمجھتے ہیں۔ یعنی بہ الفاظ دیگر وجود واحد میں صفات کی کثرت کے قائل ہو گئے ہیں۔ تو اس عقیدے کے رو سے جب وہ کثرت کے معتقد ہونگے۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازم آئے گا۔ کہ ہر صفت کے انفرادی اور امتیازی وجود کے بھی قائل ہوں گے۔ ورنہ بصورت دیگر صفات کی کثرت ثابت نہ ہو گی۔

اعیان کہاں سے پیدا فرمالئے:۔؟

غور فرمائے اگر ہم حق تعالیٰ جل وعلا کو اس طرح مان لیں کہ اعیان ثابتہ اس کے وجود میں نہ تھے۔ بلکہ یہاں تک کہ خود اس کا بھی کوئی وجود نہ تھا۔ البتہ ذات تھی۔ (حالانکہ ذات ان اوصاف کا نام ہے۔ جن کے طفیل وہ دوسری اشیاء سے ممتاز ہوتی ہے۔ اور بغیر وجود کے متحقق نہیں ہو سکتی) تو جب یہ تمام اشیاء اس تعالیٰ شانہ کے ہاں نہ تھیں۔ تو بالیقین اپنی ذات کے خارج سے لی ہوں گی۔ یعنی اس خارجی وجود سے لی ہوں گی۔ جو اس کی ذات کے مقابلے موجود تھا۔ تو پھر بھی وہی بات ہو جائے گی۔ کہ حق سبحانہ، وتعالیٰ محدود ثابت ہو گا۔ اور اگر اس کا خارج ممکن نہ ہو تو یہی سوال پیدا ہو گا۔ کہ پھر اس تعالیٰ شانہ نے ''وجود'' اور ''اعیان'' جو اس کی ذات میں نہ تھے تو ان کو کس طرح اور کس زاویئے سے پیدا فرمالیا؟

حق سبحانہ وتعالیٰ کا عجز؟:۔

مطلب یہ کہ جو چیز اس تعالیٰ کے علم میں نہ ہو تو قابل غور یہ بات ہے۔ کہ وہ چیز کیونکر موجود ہو سکتی ہے؟ مزید برآں اس امر سے حق سبحانہ وتعالیٰ کا عجز ہر گز ثابت نہیں ہوتا۔ کہ اس تعالیٰ شانہ کو نیند نہیں آسکتی۔ یا یہ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اپنا وجود فنا نہیں فرما سکتا۔ غرض یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں سے حق سبحانہ وتعالیٰ کا عجز ہر گز ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جس چیز سے اسکی ذات کلی طور پر منزہ ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تو اس کی ذات محدود اور عاجز نہیں ہو سکتی۔
مقصد محض اس قدر ہے کہ یہ ساری اشیاء، اسی ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود میں تھیں۔ اور یہ بھی

کچھ اس کی معلومات تھیں۔ بقول حضرت بایزید بسطامی سرہٗ (بحوالہء خطبات اقبال) کہ "تمام اشیاء اب بھی حق سبحانہ وتعالیٰ کے حضرت علم میں ہیں"۔

وجود کے سوا اور کچھ بھی نہیں:۔

غرض یہ کہ تمام چیزیں ذات حق سبحانہ وتعالیٰ میں عین علم اور عین وجود تھیں۔ اور آپس میں جب ان اشیاء کو ایک دوسرے پر ظاہر فرمانا چاہا۔ تو اسوقت حق سبحانہ وتعالیٰ عین علم تھا۔ جب اشیاء عالم تجرد میں آ گئیں تو علم عین عقل تھی۔ جب مثال کی طرف منتقل ہوئیں۔ تو عین فکر ہوئیں۔ یا اس کو عین طبیعت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح حضرت صوفیاء نے افہام وتفہیم کیلئے تنزلات مقرر فرمائے ہیں۔ اور تین قسم کے عالم مشہود ہیں۔ یعنی ان عالموں کی مخلوق یا۔ افراد ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ جو مخلوقات عالم عقل۔ مخلوقات عالموں مثال اور مخلوقات عالموں شہادت پر مشتمل ہیں۔ ان عالموں میں سے ہر عالم اور ان سے متعلق ان کی دنیا کا ہر لحظہ متغیر ہے۔ اور ہر دنیا کی مخلوق ہر گھڑی وجود کا نیا لباس اختیار کرتی ہے۔ اور اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ نئی شان سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر دنیا کی مخلوق اپنی انفرادیت کا احساس کرتی ہے۔ بدیں وجہ کہ اپنے ماحول میں دوسرے افراد کو بھی دیکھتی ہے۔ اور یہی احساس خالق اور مخلوق کے جدا جدا وجود کا تصور پیدا کرتا ہے۔ ورنہ فی الواقعہ نہ تو کوئی عالم ہے اور نہ ہی کوئی دنیا اور یہ سب کچھ حق سبحانہء وتعالیٰ کے حضرت علم میں ہے۔ اسی بناء پر کوئی چیز بھی انفرادی طور پر مستقل اور حقیقی وجود نہیں رکھتی۔ اور نہ ہی تخلیق (نیست سے ہست) ہوئی ہے۔

انائے حقیقی وحدۃ الوجود ہے:۔

اگر ہم عدم کے قائل ہو جائیں۔ اور من بعد تخلیق کو مان لیں تو اس صورت میں اشیاء کی تخلیق تو یقیناً ثابت ہو جائے گی۔ لیکن ساتھ ہی وجود حق سبحانہ وتعالیٰ بھی حادث اور محدود ثابت ہو جائے گا۔ البتہ ہر اضافی یا محسوس تصوری عالم کی مخلوق اپنے تئیں مخلوق سمجھتی ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ اپنی انفرادیت محسوس کرتی ہے۔ اور اپنی انفرادیت اس لئے محسوس کرتی ہے۔ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی "انا" جو خود اپنے وجود کا احساس اور علم رکھتی ہے۔ اسی کا ظہور اعیان ثابتہ میں بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ کل کی ہر صفت اجزاء میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور اسی بناء پر ہر چیز بھی ایک "انا" رکھتی ہے۔ یعنی ہر چیز میں "میں" کا احساس موجود ہوتا ہے۔ اور جس طرح حق سبحانہ وتعالیٰ کے شیون لا احصیٰ ہیں۔ تو اس تعالیٰ شانہ کا "میں" جو فی الحقیقت "میں" ہے۔ اپنی معلومات میں بھی "میں" کا احساس پیدا فرماتا ہے۔ لہذا ثابت ہوا۔ کہ درحقیقت صرف یہی "میں" موجود ہے۔ اور بقایا کچھ

بھی نہیں اور یہی وحدۃ الوجود ہے۔

خلاصۂ کلام :۔

مگر یاد رہے کہ سلوک میں یہ ضروری نہیں کہ ہر سالک لازمی طور پر وجود کو ایک مان لے۔ یا کوئی سالک بالضرور وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود کا قائل ہو۔ بس یہ سمجھ لینا چاہئے۔ کہ یہ ہر ایک سالک کی اپنی اپنی استعداد اور بصیرت پر منحصر ہے۔ ورنہ اصل بات یہ ہے کہ سلوک کا مطلب ہی حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی معرفت ہے۔ اور اسی کے وجود میں اپنے آپ کو فنا کرنا ہے۔ اور فنا سے مراد یہ ہے کہ بحیثیت کلی حق سبحانہ وتعالیٰ کی رضا قبول کی جائے اور اپنی رضا کو ترک کیا جائے۔ مفہوم یہ کہ جب سالک اپنی ہستی کے تصرف سے نکل جائے۔ تو حق سبحانہ وتعالیٰ کی ہستی کا احساس اور اس کی معرفت پیدا ہو جائے گی۔

ہماری ایک طوفانی بحث اور حضور بادشاہ جانؒ :۔

ہمارے سلسلۂ حشتیہ نظامیہ اور خصوصاً چشتیہ صابریہ پر وحدۃ الوجود کا تصور بہت غالب ہے۔ اور ہمارے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔

1940ء کا ذکر ہے۔ کہ ہمارے مرشد پاک حضور بادشاہ جانؒ حضور خواجہ خواجگان غریب النوازؒ کے عرس مبارک کے موقعہ پر اجمیر شریف کے محلّہ اندر کوٹ کے ایک مکان میں مقیم تھے۔ اسی مکان میں ہمارے برادر طریقت ہزار گل عرف کوہاٹ بادشاہ نے میرے ساتھ مسئلہ وحدت الوجود کے بارے میں بحث چھیڑ دی۔ اس مباحثے نے خاصی طوفانی شکل اختیار کی۔ وجہ یہ تھی کہ ہمارے برادر طریقت کوہاٹ بادشاہ کافی عرصہ تک طریقہ نقشبندیہ سے منسلک رہے تھے۔ اور اس سلسلہ سے ہو کر سلسلہ عالیہ چشتیہ میں شامل ہو گئے تھے۔ تاہم ہنوز ان کے پرانے رنگ ڈھنگ اور دیرینہ تصورات محونہ ہوئے تھے (اگر چہ آج کل ان کا یہ عالم ہے کہ اپنی محفلوں میں توحید وجودی کے سوا کسی دوسری بات کے روداد نہیں ہیں۔ الا ماشاء اللہ!) تو خیر! بحث کے دوران میں کوہاٹ بادشاہ نے بالآخر کہہ دیا۔ کہ ”وحدۃ الوجود کے قائلین سب کے سب کافر ہیں“۔ اس وقت ہم مکان کی بالائی منزل میں کمرے سے باہر بیٹھ کر سرگرم بحث تھے۔ حضور بادشاہ جانؒ اندر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے کوہاٹ بادشاہ کا کلام سماعت فرمایا تو غصے کی حالت میں کمرے سے باہر تشریف لے آئے۔ اور ارشاد فرمایا کہ:۔

”کیوں۔ کوہاٹ بادشاہ! تم اتنے ناسمجھ ہو۔ کہ میں خود وحدۃ الوجود کا قائل ہوں؟ بتاؤ! اب کیا کہتے ہو؟“

یہ ارشادگرامی سن کر کوہاٹ بادشاہ مزید کچھ نہ بولے اور اسی طرح اس کے ساتھ ہی ہماری بحث بھی ختم ہوگئی۔

فطری استعداد اور صلاحیت سے چارہ نہیں:۔

1949 میں جبکہ ہم حضور بادشاہ جانؒ کے ہمراہ حضرت پیر بابا قدس سرہٗ کی زیارت کرنے علاقہ بنیر گئے تھے۔تواب کی بار مولوی عبدالمجید افغانی سعدی مرحوم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ایک روز جبکہ میں اور مولوی عبدالمجید صاحب مسجد کی صحن میں ایک چنار کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے تو باتوں باتوں میں وحدۃ الوجود کا ذکر بھی آ گیا۔مولوی صاحب کا عندیہ یہ تھا۔کہ وحدۃ الوجود کو ماننا صریحاً کفر وشرک ہے۔اور جب میں نے یہ معلوم کرلیا۔تو تعجب کے ساتھ ان سے یہ دریافت کیا۔کہ''مولوی صاحب! حیرت ہے کہ آخر کس بنا پر کفر ہے۔اور کس وجہ سے شرک ہے؟''انہوں نے جواب دیا۔کہ''اس بنا پر کہ پھر تو ہر چیز خدا ہو جائے گی!''محترم مولوی صاحب کی زبانی یہ بات سن کر مجھے یقینی طور پر تاسف بھی ہوا اور تعجب بھی۔! چنانچہ عرض کیا کہ''مولوی صاحب! متاسفانہ آپ کے متعلق جو نظریہ میں نے پہلے قائم کیا تھا وہ غلط ثابت ہوگیا۔مجھے اس کا ملال ہے۔اور میں معافی بھی چاہتا ہوں کیونکہ آپ میرے استاد ہیں۔اور کافی اشعار میں آپ سے اصلاح لی ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک''جسم''اور''وجود''میں کوئی فرق نہیں ہے۔حالانکہ ''جسم''ایک الگ چیز ہے۔اور''وجود''کچھ اور ہے۔اسی طرح ہر چیز خدا بھی نہیں بلکہ ہر چیز کا وجود حق سبحانہ وتعالیٰ کا وجود ہے۔''اس بات کو بھی مولوی صاحب نہ سمجھ سکے اور فرمایا کہ''بعید از عقل ہے؟اس کے جواب میں۔میں نے دوبارہ عرض کیا کہ''اچھا مولوی صاحب! یہ بتا دیجئے کہ ہر چیز کس کے''ہونے''سے''موجود''ہے؟تو مولوی صاحب نے جواب دیا۔کہ''ہر چیز حق سبحانہ وتعالیٰ کے''ہونے''سے''موجود''ہے۔''چنانچہ اب میں نے گزارش کی کہ''خوب! تو''ہونے''یا ''ہے''کے معنے وجود کے بغیر کچھ اور بھی مفہوم ہو سکتے ہیں؟''یہ سن کر مولوی صاحب کچھ وقفہ کے لئے تو خاموش رہے۔اور ابھی کچھ کہنے والے ہی تھے۔کہ اسی اثناء میں حضور وقبلہ انوار بادشاہ جانؒ تشریف لے آئے۔اور تبسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''کیا بات چیت ہو رہی تھی۔۔۔؟''

مولوی صاحب نے بھی مسکراتے ہوئے عرض کیا۔کہ''اس مہمل سے گفتگو کر رہا تھا''۔اور بعد ازاں ساری روئیداد سنا دی۔حضور بادشاہ جانؒ نے تمام ماجرا سماعت فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''وجود کی بحث ایک انتہائی پیچیدہ اور ادق ترین بحث ہے۔مگر یہ بھی ہے کہ سارا معاملہ اپنے اپنے عندیئے اور اپنی اپنی بصیرت پر منحصر ہے۔یعنی جس قدر بھی کسی کی استعداد ہو گی اسی قدر وجود کے

بارے میں علمیت اور بصیرت رکھے گا۔ دوسرے اس مسئلہ میں ایک دوسرے پر تکفیر و تفسیق کے فتاوے صادر کرنا ناجائز ہے۔ اور نہ کسی کو زیب دیتا ہے۔ البتہ بعض باتیں ایسی بھی ہیں۔ جن کی وجہ سے شرائع پر اثر پڑتا ہے۔ تو اس ضمن میں جہاں تک ممکن ہو سکے ایسی باتوں سے اجتناب کیا جائے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ایسا بھی تو ناممکنات میں سے ہے۔ کہ کوئی انسان اپنی فطری صلاحیت اور استعداد سے گلو خلاصی حاصل کر لے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ آدمی یقیناً اپنی فطری استعداد کے بموجب فکر کرنے پر مجبور ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ گویا ہر آدمی کی اپنی اپنی دنیا ہے۔ اور اس کے لئے اپنی دنیا سے باہر نکلنا ہرگز ممکن نہ ہو گا۔

ہاں! اس امر کا لحاظ رکھنا اشد ضروریات میں سے ہے کہ آدمی کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے۔ جو اس کے مخالف کے فہم و ادراک سے باہر ہو۔ اور یا پھر اختلاف رکھنے والے کے عقیدے کے مخالف ہو"۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے بھی جسم اور وجود میں فرق نہیں کیا ہے:۔

مندرجہ بالا ارشادات کو سن کر مولوی صاحب کی بھی تسلی ہو گئی۔ اور مجھے بھی از حد فائدہ پہنچایا۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ وجود کی گہرائیوں تک رسائی ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ جو ابتداً اپنے مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ اور اپنے والد ماجدؒ (جو سلسلہ چشتیہ صابریہ سے منسلک تھے) کی توجہات کے طفیل ایک طویل عرصہ تک وحدۃ الوجود کے سرگرم عقیدتمند تھے۔ لیکن بذات خود حضرت مجددؒ کی فطری استعداد وجودی توحید سے متحد نہ تھی۔ چنانچہ بعد میں ایک ایسا وقت بھی آ گیا کہ انہوں نے اپنے مرشد اعلیٰؒ اور پدر بزرگوارؒ کے نظریئے کے برعکس توحید وجود کی برملا تردید شروع کی۔ گویا ان کی فطری استعداد ان کے مرشد مکرمؒ اور والد محترمؒ کی توجہ پر غالب آ گئی لہذا حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے وجود کی نفی کر ڈالی۔ اور اسی طرح انہوں نے جہاں کہیں بھی وجود پر بحث کی ہے۔ تو اس قسم کی بحثوں سے الم نشرح ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی "جسم" اور "وجود" میں کوئی خاص فرق نہیں کرتے۔

لیکن اس کے باوجود توحید وجودی کا وہ تصور جو انہوں نے بنیادی طور پر اپنا لیا تھا۔ اس کو خود بھی تا آخر محو نہ کر سکے۔ چنانچہ حضرت مجدد صاحبؒ کی تحریروں کے کئی مقامات پر غیر شعوری طور پر توحید وجودی کے حقائق کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔

"ذات الشئی ..." :۔

واضح رہے کہ اس مسئلہ کا تعلق علمیت سے نہیں ہے۔ بلکہ بیشتر انسانی وجدان سے ہے۔ مزید برآں جس خوبی سے مجاہدہ اس مسئلہ کو حل کرتا ہے۔ علمی بحث و تمحیص نہیں کر سکتا۔ اب جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے۔ تو چاہے ان کو اس ضمن میں یہ شبہ ہو جائے کہ۔ اگر وجود ایک ہو اور وہ بھی صرف حق سبحانہ وتعالیٰ کا وجود ہو۔ تو گویا ہر چیز خدا ہو گئی۔ تو ظاہر ہے کہ وہ بچارے معذور سمجھے جائیں گے۔ لیکن عوام سے قطع نظر طبقۂ علماء میں بھی ایسے افراد موجود ہیں۔ جو اسی قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ حالانکہ اگر وہ ذرا سا بھی غور فرمالیں۔ نیز ان خشک اور معاند ملاؤں (جو مجاہدانہ تفکر سے یکسر عاری ہوتے ہیں) کی اندھی تقلید سے تھوڑی دیر کے لئے اپنے ذہنوں کو خالی کر دیں۔ تو ان کے فہم میں آ جائے گا۔ کہ کسی چیز کی ذات وہ کہلاتی ہے جس پر وہ قائم ہوتی ہے۔ اور اسی پر اس کی تشخیص کا مدار ہوتا ہے۔

اس سے بھی آسان لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ اور اس سے تو کوئی فرد بشر بھی انکار نہیں کر سکتا۔ کہ اشیاء ذات حق سبحانہ وتعالیٰ ہی پر قائم ہیں۔ تو اس حقیقت کی رو سے خود اشیاء کی اپنی ذات کیوں کر رہ سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ جب اشیاء کی اپنی ذات ہی نہ رہے گی۔ تو لازماً وجود بھی ان کا اپنا نہ رہے گا۔ نہ ہو گا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اشیاء اعیان اور مختلف صفات کے اجتماع کا نام ہے۔ اور جس وقت صفات منتشر اور منفصل ہو جائیں۔ تو چیز کا وجود ظاہری ختم ہو جاتا ہے۔

آفتاب میں عین آفتاب :۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہئے۔ کہ وحدۃ الوجود کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر چیز خدا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ہر چیز کا وجود حق سبحانہ وتعالیٰ کا وجود ہے۔ یعنی جس طرح مختلف رنگوں کا وجود آفتاب میں پنہاں ہے۔ اور ان تمام رنگوں کا اجتماع آفتاب میں عین آفتاب ہے۔ مگر جوں ہی آفتاب کی شعاعیں اشیائے مختلفہ پر پڑتی ہیں۔ تو ہر شئے بحیثیت استعداد ایک رنگ ظاہر کر دیتی ہے۔ تو اس حقیقت کی روشنی میں کوئی معقول آدمی بھی کسی رنگ کو آفتاب نہ کہے گا۔ اور فرق مراتب کا خیال رکھے گا۔

بنیادی فطری تربیت کے سوا دوسری ہر قسم کی تربیت بیکار ہے :۔

یہاں پر اس بات میں کوئی شک نہیں رہا۔ کہ ہر انسان کی بنیادی صفت کا مدار حق سبحانہ وتعالیٰ کی ایک صفت پر ہوتا ہے۔ اور اسی بنا پر ایک آدمی صرف ان اخلاق و خصائل کو قبول کر سکتا ہے۔ جو اس

اسم معظم سے متحد ہوں۔ دوسری یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی۔ کہ تربیت کے بارے میں وہ عام نظریہ صحیح نہیں کہ کسی شخص کو خواہ جس قسم کی بھی تربیت دی جائے۔ تو وہ شخص ہر حال میں وہ تربیت قبول کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ درست نہیں۔ اس لئے کہ اگر یہ ممکن ہوتا۔ تو آج دنیا میں کوئی بد اخلاق اور بد کردار آدمی نام کو بھی نہ ملتا۔ وجہ یہ ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا فرمایا ہو۔ جس کو ہم حضرت آدمؑ کہتے ہیں۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے بہت سے انسان یکمشت پیدا فرمائے ہوں۔ یا بالفرض ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے مطابق مخلوقات عالم کی ابتداء درجہ بہ درجہ کیڑوں مکوڑوں وغیرہ سے ہوئی ہو۔ تو لازمی تھا۔ کہ ان کی فطرتوں میں نہ تو نیکی کی استعداد موجود ہو اور نہ بدی کی البتہ ایسا ہوسکتا ہے۔ کہ ان میں نیکی اور بدی ہر دو چیزوں کو قبول کرنے کی صلاحیتیں موجود ہوں۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس حال میں کون ان کو تربیت دیتا؟ نیز ان پر نیکی اور بدی کی تمیز کون اور کس طرح اجاگر کرتا؟ مطلب یہ کہ نیکی اور بدی کا تصور ہی نہ ہوتا۔

چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر نیکی اور بدی کے بارے میں انسان کا کوئی مورث نہ ہوتا۔ تو اب تک نہ بھلے کو سمجھتا اور نہ برے کو۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے خود اپنے ذہنی ارتقاء کے ذریعے برے اور بھلے۔ نیکی اور بدی۔ حسن اخلاق اور بد اخلاقی کا معیار قائم کرلیا۔

آلوچے کے تخم سے توت نہ اگے گا:۔

اب اگر مادئین اس عندیئے پر معترض ہوں۔ اور یہ سوال اٹھائیں۔ کہ یہ سب کچھ مسلسل اور متواتر تجربات کے نتائج ہیں۔ تو ہم جواباً یہ عرض کریں گے۔ کہ یہاں پر غور طلب امر یہ ہے۔ کہ جب کوئی چیز اساسی طور پر ان کی سرشت اور طینت ہی میں داخل نہ ہوں گی۔ تو تجربے کا سوال کس طرح پیدا ہوسکتا ہے۔؟ ظاہر ہے کہ اس حال میں تجربہ سے کیا حاصل ہوسکتا تھا؟

لہذا معلوم ہوا۔ کہ نیکی اور بدی کی استعداد لازمی طور پر انسان کی فطرت میں موجود تھی۔ مثال کے طور پر تخم کے دانے میں جس درخت یا پودے کے اگنے کی استعداد ہوگی۔ تو کوئی شک نہیں کہ اس تخم سے وہی مخصوص درخت یا پودا اگے گا اور یہ تو قطعی ناممکن ہے۔ کہ کوئی شخص تخم تو آلوچے کا بوئے مگر درخت اگے تو وہ توت کا ہو؟ اسی مثال کی روشنی میں توت اور الوچے کے مابین جو فرق ہے۔ تو وہ صاف طور پر بتاتا ہے کہ اس فطری استعداد کے مطابق جو کچھ تخم کے اندر موجود تھا وہی کچھ ظاہر میں آگیا۔

کردار بنیادی تخلیق کے مطابق ہوگا:۔

ایک روز حضور بادشاہ جانؒ سلطان سرائے کی ڈیوڑھی میں رونق افروز تھے۔ اور میں سامنے رفیع الدین چائے والے کی دکان میں بیٹھا ہوا رخ انور کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ کہ یکا یک ایک شخص کی بد اخلاقی کی وجہ سے میں سخت متردد اور مضطرب ہوگیا۔ چنانچہ دل ہی دل میں مجھے تشویش ہو رہی تھی۔ اس وقت حضور بادشاہ جانؒ اخبار کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ اچانک انہوں نے اخبار کو چارپائی میں رکھتے ہوئے مجھ سے خطاب فرما کر اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشاد فرمایا کہ:۔
''حق سبحانہ وتعالیٰ نے جس انسان کو جس نہج پر تخلیق فرمایا ہو۔ تو اسی کے مطابق اس شخص کا عمل اور کردار بھی ہوگا۔ لہٰذا اس ضمن میں کسی اور کا بس نہیں چلتا''۔
اور اس ارشاد عالی کے بعد دوبارہ اخبار مطالعہ فرمانے لگے۔

فضل خان اور وحدۃ الوجود:۔

حضور بادشاہ جانؒ کے مریدوں میں موضع غزدم بک (علاقہ ہشت نگر) کے فضل خان کو بذریعہ مجاہدہ وحدۃ الوجود مفہوم ہوگیا تھا۔ مگر چونکہ فضل خان کی علمی استعداد کم تھی۔ اس لئے اس کے مکمل اظہار کے لئے اس کے پاس مناسب الفاظ کا سرمایہ نہ تھا۔ ویسے بھی وہ جذب کی حالت سے مغلوب تھے۔ اور ہر چیز کو خدا کہتے تھے۔
اسی سلسلہ میں میرے اور فضل خان کے درمیان اکثر اوقات تبادلہ خیالات ہوتا۔ خود حضور بادشاہ جانؒ بھی ان کو ایسی گفتگو سے باز رہنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ مگر اس نیک بخت کا ایسی باتوں سے باز آنا تو رہا ایک طرف، الٹا وہ اور بھی شدومد سے کہنا شروع کردیتے۔

حوالات کی سیر:۔

فضل خان علاقہ ہشت نگر میں کافی جائداد کے مالک تھے۔ زمین زرخیز تھی۔ مگر ان کے کھیت بنجر اور اجاڑ رہتے۔ ایک بار لگان ادا نہ کرنے کی صورت میں پابند حوالات کئے گئے۔ ان دنوں قلی خان خٹک حاکم تھے۔ وہ حوالات کی طرف چلا گیا تھا۔ اندر دیکھا تو فضل خان پر نظر پڑگئی۔ اور چونکہ قلی خان نے پہلے ہی سے فضل خان کے وحدۃ الوجود کی باتیں سن رکھی تھیں۔ اس لئے اس نے فضل خان سے دریافت کیا کہ'' آیا تم وہی فضل خان ہو جو ہر چیز کو خدا کہتا ہے۔؟'' انہوں نے اثبات میں جواب دے دیا۔ خیر تو اس کے بعد قلی خان نے اس سے یہ سوال کیا کہ۔'' خوب اچھا تم کیسے خدا ہو کہ میں نے تمہیں گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا؟'' یہ سن کر فضل خان نے برجستہ جواب

دیا۔ کہ ''بھلے مانس! چھوٹے بڑے کا تو کچھ خیال رکھتے!''

محض ڈھانچے کی پٹائی:۔

مدعا یہ کہ حضور بادشاہ جانؒ فضل خان کو اس قسم کی گفتگو سے بشدت تمام منع فرماتے تاہم وہ باز نہ آئے۔ کئی بار مارا پیٹا۔ اور یہاں تک کہ ایک روز تو سر بازار حضور بادشاہ جانؒ نے ان کی ایسی پٹائی کی کہ مارتے مارتے قریب پڑے ہوئے گنوں کے سارے ڈھیر کو ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا۔ اس وقت فضل خان زمین پر بلا حرکت اور بے چون و چرا پڑے تھے۔ مگر جونہی حضور بادشاہ جانؒ ان کی اچھی طرح سے مرمت کرنے کے بعد تشریف لے گئے۔ تو فضل خان نے آہستہ آہستہ سر اٹھا کر کہ دیا۔ کہ ''مضائقہ نہیں۔ کیونکہ حضور بادشاہ جانؒ محض میرے ڈھانچے کو مار رہے تھے۔ اور بیچ سے میں خود غائب تھا!''

ایک مولوی صاحب سے گفتگو:۔

غالباً یہ 1949ء کا ذکر ہے۔ کہ ایک روز جب میں حضور بادشاہ جانؒ کی خدمت مبارک میں حاضر ہوا۔ تو اس سے قبل ایک مولوی صاحب بھی ان کے ہاں تشریف فرما تھے۔ حضور بادشاہ جان رضی اللہ عنہ نے مجھے دیکھا تو تبسم فرما کر ارشاد فرمایا کہ:۔

''اچھا۔ ہوا کہ تم آ گئے۔! مولوی صاحب وحدۃ الوجود پر تبادلہ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ اتنی باتیں میں نہیں کر سکتا۔ تم ہی ان سے گفتگو کر لو''۔

میں نے عرض کیا کہ ''حضور! جب آپ کے ارشادات سے مولوی صاحب کی تسلی نہ ہو سکی تو میری گفتگو کی کیا وقعت ہو سکتی ہے؟'' بہر حال میں بیٹھ گیا۔ اور گفتگو شروع ہوئی۔ مولوی صاحب نے اپنے سلسلہ کلام میں وہی دلیل پیش کی کہ ''اگر وجود ایک ہو تو پھر ہر چیز خدا ثابت ہو جائے گی۔ اور یہ صریحاً شرک ہے''۔ میں نے مولوی صاحب کو طرح طرح کے استدلال پیش کئے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ اپنی کہے جاتے تھے۔ اور میری نہ سنتے تھے۔ بالآخر میں نے یہ دلیل پیش خدمت کی۔ کہ ''صاحب! دیکھئے۔ جب رباب بجتا ہو تو ایک گانے کی ترکیب اور ترتیب و تدوین کے لئے مختلف قسم کے آہنگ بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ اور تمام مختلف پردوں سے مختلف قسم کی آوازیں نکلتی ہیں۔ پھر اس وقت جبکہ تمام مختلف آوازیں ایک خاص ترتیب کے اندر آ جاتی ہیں۔ تو ان سے ایک نغمہ بن جاتا ہے۔ مگر خیال رہے کہ وہ سب آوازیں اسی ایک رباب سے نکلتی ہیں۔ لیکن اسی ایک نغمہ کے وجودی اجزاء ہی نہیں بلکہ عین نغمہ بھی ہوتی ہے۔ اس لئے ان مختلف النوع آوازوں کے اجتماعی اور متحدہ تاثر کو بس ایک ہی نغمہ کا نام دیا جاتا ہے۔ لہذا اس حقیقت کے رو سے یہ دنیا بھی

حق سبحانہ وتعالیٰ کی صفات (جو صفات حق سبحانہ وتعالیٰ میں اعتبارات کا درجہ رکھتے ہیں) بھی ایک نغمہ تصور فرمالیں جسے (بلاشبہ) حق سبحانہء وتعالیٰ نے بجادیا ہے"۔

یہ سب کچھ میں نے بطور مثال پیش کیا۔ مگر ان معروضات کو سماعت فرمانے کے بعد مولوی صاحب نے وحدۃ الوجود کی بحث تو چھوڑ دی۔ اور سماع کی حرمت ثابت کرنے پر اتر آئے اور اسی طرح کھانے کے وقت تک برابر ہمارا وقت ضائع کرتے رہے۔

سِماع:۔

سماع فطرت انسانی کے عین مطابق ہے:۔

سماع کے بارے میں میں نے اپنی کتاب ''تجلیات محمدیہ'' علیہ ﷺ میں بہت کچھ لکھا ہے۔اور براہین ودلائل پیش کرنے کیلئے بعد حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ کا یہ قول نقل کیا ہے۔کہ''یہ مسئلہ امت میں مختلف ہے اور لازمی ہے۔کہ اس قسم کے اختلافی مسئلہ میں مسلمان ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق سے احتراز کریں۔اگر کوئی شخص اس کو حرام سمجھے یا مباح جانے۔یا اگر کوئی شخص اسے مستحب کہے تو اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیے۔''

مگر حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو نغمہ کو مطلق حرام جانتے ہیں۔اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا حق سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو دو عدد کان عبث دیئے ہیں حالانکہ منشائے الٰہی عزوجل تو یہ تھی کہ کوئی سنے !البتہ وہ چیز جو خلاف شریعت ہو تو لامحالہ اس کا سننا جائز نہ ہوگا۔

تعجب ہے کہ کیا حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایک طرف انسان کی فطرت میں غِنا کی پسندیدگی کو شامل بھی فرمالیا ہو۔اور دوسری جانب اس کو منع بھی فرمالیا ہو۔یہ واقعی ناقابل فہم ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کے خیال میں اسلام دین فطرت نہیں ہے۔اور اسی طرح گویا یہ دین تمام فطری تقاضوں کو ایک معتدل اصول کے ماتحت پورا کرنے کو جائز نہیں سمجھتا۔حالانکہ شریعت میں بھی غِنا کے مطلق حرمت کے بارے میں کچھ وارد نہیں ہے۔اس کی وجہ بعض یہ ہے کہ اچھی آواز اور سندر نغمہ عین فطرت انسان کے مطابق ہے۔اور جس طرح اوپر عرض کیا گیا ہے۔کہ اسلام دین فطرت ہے۔اور یہ دین کسی طرح سے بھی فطری تقاضوں پر کوئی قدغن نہیں لگاتا کیونکہ اگر ایسا ممکن ہوتا اور یہ بات مبنی بر حقیقت ہوتی تو ابتک کوئی فرد وبشر بھی اسلام کے شرعی شکنجے میں بخوشی آجانے کو قبول نہ کرتا۔

اسلام فطری تقاضوں کو یکسر ختم نہیں کرتا:۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ تمام فطری تقاضے حق سبحانہ وتعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں۔اور وہ تعالیٰ شانہ ان کو بحیثیت کُل فنا نہیں فرماتا۔بلکہ ان کو اعتدال کے اندر رکھنے اور افراط وتفریط سے بچانے کی تاکید فرماتا ہے۔ظاہر ہے کہ اگر اسلام فطری تقاضوں کو ختم کرتا تو ابھی کوئی مسلمان بھی موجود نظر نہ آتا۔

حدودشریعت اورانسانی فطری تقاضے:۔

مثال کے طور پر انسان کے اندر شہوت اور غضب کی دوایسی طاقتیں موجود ہیں۔جن کو پورا کرنے کے لئے شریعت نے حدود مقرر فرما دیئے ہیں۔اوراس میں شک نہیں کہ شریعت ان طاقتوں کو قطعی بے لگام نہیں چھوڑتی۔غور فرمایئے۔ایام شباب میں جب مرد کوایک عورت کی اورعورت کوایک مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔یاجب کسی کو بھوک لگ جائے اوراسے روٹی کی ضرورت ہو،یا پیاس لگے اور پانی پینے کی خواہش رکھتا ہو۔تو ظاہر ہے کہ ان سب امور کے لئے شریعت نے حدود مقرر فرمادیئے ہیں۔اوراگر بصورت دیگرحق سبحانہ وتعالیٰ بنی آدم کو پیٹ پالنے اور پیاس بجھانے کا حکم نہ فرماتے تواس صورت میں واقعی یہ اعتراض ہوسکتا تھا۔کہ ان فطری تقاضوں اوران خواہشات کوحق سبحانہ وتعالیٰ نے انسانی فطرت میں داخل تو فرمادیا ہے لیکن اب ان کو پورا کرنے سے منع بھی فرماتا ہے۔

اسی طرح اس مثال کی روشنی میں یہ بات سراسر خلاف عقل ہے۔کہ انسانی فطرت میں غِنا سننے کی خواہش موجود تو ہولیکن انسانوں اورفطرتوں کے مالک حق تعالیٰ جل وعلا کی بھیجی ہوئی شریعت ان سے باز رکھے؟

حقیقت حال یہ ہے کہ بذات خود غِنا ایک بڑی پاکیزہ چیز ہے اوراگر یہ چیز ایک خاص انداز ے سے اور خاص اصول سے سنی جائے تو بدیہی طور پر اس کے انتہائی خوبصورت روحانی نتائج اور فائدے برآمد ہوتے ہیں۔البتہ اگراس میں افراط وتفریط سے کام لیا جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ یہی چیز ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچاتی ہے۔

نغمے سے خیالات منتشر نہیں ہوتے:۔

ایک روز میں نے حضور بادشاہ جاںؒ کی خدمت اقدس میں عرض کیا۔کہ ''حضورؒ! ہرشب کو غِنا سننا میرے خیال میں تعجب انگیز ہے۔اور مجھے افسوس ہے۔کہ میرے پاس اس کی کوئی خاص تاویل موجود نہیں!''میری گزارش سماعت فرما کرحضور بادشاہ جاںؒ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے ارشادفرمایا کہ:۔

''ہماری محفل میں شریک ہونے والے لوگ علماءیازیادہ ترقی یافتہ طبقہ نہیں ہے۔لہذااگر ہم غِنا کو ترک کردیں۔تو یہ لوگ ایک دوسرے کی غیبت سے آلودہ ہوجائیں گے۔اسی لئے اس سے یہ امر بدرجہا بہتر ہے۔کہ غِنا کا اہتمام ہواکرے۔''

بلیٰ کا اقرار یاد دلاتا ہے:۔

بعد میں جب میں نے خوب سوچا تو میری سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ کہ حضور بادشاہ جاںؒ کے اس ارشادِ گرامی میں بڑی حکمت کارفرما تھی۔ اور وہ ایسے کہ دورِ حاضر کا انسان ہر طرف سے نفسِ امارہ کے انتہائی قبضے میں ہے۔ اور اس کی زندگی کے اکثر لمحات عصیان و نافرمانی کے نذر ہوتے ہیں۔ اور اگر حضور بادشاہ جاںؒ کی محفل میں رباب نہ ہوتا تو یہ لوگ سینما کا رخ کرتے یا دیگر قسم کی فضولیات میں مشغول ہو جاتے۔ اس لئے یہ خوب تر تھا کہ وہ لوگ رباب سنیں۔
اس نتیجے میں ہم نے دیکھا ہے کہ اسی مبارک اور قدسی محفل میں نشست و برخاست رکھنے والے بہت سے لوگ معصیت اور دیگر قسم کی کجرویوں سے توبہ کر چکے ہیں۔ ویسے بھی اگر ہم غور کر لیں۔ تو رباب کا سننا ذہن انسانی کو تناسب کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غِنا۔۔ یا نغمہ۔۔ بذاتِ خود عالمِ تناسب یا حسن سے تعلق رکھتا ہے۔ اور حسن بھی بذاتِ خود ایک پاک اور قابلِ ستائش چیز ہے۔ چنانچہ اس زمانے کے حکماء بھی اس امر پر متفق ہیں۔ کہ نغمے کا مجموعی تاثر ایسا ہے کہ سماعت کے دوران سننے والوں کے ذہن میں کسی قسم کے شہوانی جذبات پیدا نہیں ہوتے۔
اور یہ بات خود میرے اپنے تجربے میں بھی آ چکی ہے۔
البتہ یہ بات الگ ہے کہ اگر نغمے کے دوران عورت بھی موجود ہو تو لامحالہ شہوانی جذبہ پیدا ہوگا۔ ، ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ نغمہ بذاتِ خود ایک بڑی پاکیزہ چیز ہے۔ اور بقول حضرت غوث پاک محبوب سبحانی شیخ عبد القادر جیلانی اور شیخ الشیوخ۔۔ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس اسرارہم نغمہ انسان کو (قالو بلیٰ) کا اقرار یاد دلاتا ہے۔'' لیکن اگر دوران نغمہ شہوت کو برانگیختہ کرنے والے اسباب موجود ہوں۔ تو شہوانی جذبے کا بھڑک اٹھنا بھی یقینی امر ہے۔ اسی بناء پر حضرات صوفیہ صافیہ قدس اسرارہم کا قول ہے۔ کہ نغمہ کو ایسی آفتوں سے مملو نہ کیا جائے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ جنس لطیف یا لڑکے سے غِنا سننا حرام ہے۔
رضی اللہ عنہم

جمعۃ المبارک یکم صفر المظفر ۱۳۸۹ھ
مطابق ۱۱۹ اپریل ۱۹۶۹ء ۸ بجکر ۵ منٹ

اعتزار

مندرجہ ذیل عبارت حضور بادشاہ جانؒ کے وصال کے باب میں درج کرنے سے رہ جانے پراب کتاب کے آخر میں لکھنی پڑی۔ اسلئے ناظرین سے معذرت خواہ ہوں۔

(مئولف)

سجادہ نشینی کا سوال:۔

حضور بادشاہ جانؒ کا وصال فرمانے کے بعد یہ سوال پیدا ہوا۔ کہ اب سجادہ نشینی کے فرائض کون انجام دیگا؟ اس صورت حال نے اختلافات کی شکل اختیار کی۔ دراصل بات یہ تھی۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ نے اپنی حیات مبارک میں کسی خاص شخص کا تعین فرما کر وصیت نہ فرمائی تھی۔ بلکہ انہوں نے یہ کام اپنے مریدوں کے متفقہ فیصلے پر چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں حضور بادشاہ جانؒ کے جملہ مریدین ڈگبری میں صلاح ومشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ باتیں ہوئیں اور باتیں ہوتی رہیں۔ مگر اتفاق رائے کی صورت نہ نکل سکی۔ بالآخر میں نے یہ تجویز پیش کر دی۔ کہ چونکہ حضور بادشاہ جانؒ تفضیلی عقیدہ رکھتے تھے۔ اور سادات کرام کو فوقیت دینے کے قائل تھے۔ اس لئے بہتر یہی ہوگا۔ کہ حضور بادشان جانؒ کی جگہ کسی سید کو بٹھا دیا جائے۔ میری تجویز کی سب نے تائید کی۔ مگر اب یہ مشکل پیش آئی۔ کہ وہ سید کون ہوں گے۔ یہاں پر میں نے دوبارہ بتا دیا کہ حضرت خواجہ نیاز بے نیازؒ کے دربار (بریلی شریف) سے بھی میرے اسی خیال کی تائید پہنچ چکی ہے۔ اور وہاں کے سجادہ نشین نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر حضور بادشاہ جانؒ کا کوئی فرزند ہو۔ تو ان کو سجادہ نشین بنا دیا جائے۔ ورنہ بصورت دیگران کے کسی قریبی رشتہ دار کو گدی نشینی کے فرائض سونپ دیئے جائیں۔ اس سلسلہ میں چونکہ حضرت خواجہ خواجگان معین الدین اجمیریؒ کے دربار کے متولی جناب سید اسرار احمد صاحبؒ سے بھی پوچھ گچھ ہوئی۔ اور وہ خود بھی یہاں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا۔ سو میں نے جرگے کے سامنے اس کا تذکرہ بھی کر دیا۔ اور ساتھ ہی بھی کہہ دیا۔ کہ اب اگر آپ لوگ بھی تفضیلی عقیدے پر کاربند ہوں۔ اور بریلی شریف اور اجمیر شریف کا مشورہ قبول کرتے ہوں۔ تو اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم سب اسی بات پر متفق ہو جائیں۔ کہ کوئی سید اور وہ بھی حضور بادشاہ جانؒ کا کوئی رشتہ دار ان کا جانشین بنے۔ اس کے جواب میں تمام حاضرین مجلس نے بیک آواز کہہ دیا۔ کہ بلا شبہ ہمارا عقیدہ تفضیلی ہے۔ اور یہی فیصلہ ہم کو بسروچشم منظور ہے۔

اب یہ مرحلہ طے کرنا باقی تھا۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ کے کس عزیز کو ان کی جگہ پر بٹھا دیا جائے۔ کیونکہ ظاہر ہے۔ کہ حضور بادشاہ جانؒ کے فرزند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ تو مجرد تھے۔ لہذا میں نے اسی مشکل کو حل کرنے کے لئے سید واقف شاہ بادشاہ کا نام پیش کر دیا۔ جو رشتے میں حضور بادشاہ جانؒ کے بھانجے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میری اس تجویز کو بھی سب کی تائید حاصل ہو گئی۔ اور سید واقف شاہ بادشاہ جانؒ کے جانشین ہو گئے۔ البتہ اس ضمن میں بریلی شریف کے سجادہ نشینؒ اور متولی سید اسرار احمد صاحبؒ نے یہ ہدایت بھی فرما دی تھی۔ کہ خواہ حضور بادشاہ جانؒ کا کوئی بھی رشتہ دار جانشین بنے۔ لیکن اگر حضور بادشاہ جانؒ نے ان کی تربیت نہ فرمائی ہو تو اس صورت حال میں اسی سلسلے کا کوئی خلیفہ نئے جانشین کو تربیت دیدے۔ بہر حال سید واقف شاہ بادشاہ حضور بادشاہ جانؒ کے جانشین تسلیم کئے گئے جو بقید حیات ہیں۔

باقاعدہ خلفاء:۔

اب میں حضور بادشاہ جانؒ کے باقاعدہ تربیت یافتہ خلفاء کا ذکر کروں گا۔ ان کے نامہائے نامی اور اسمائے گرامی یہ ہیں۔ محمد زرین خان آفریدی مرحوم، مولوی شیر محمد تیراہی مرحوم، سید خان محمد عرف اسٹشن ملا مرحوم، سید ہزار گل بادشاہ عرف کوہاٹ بادشاہ (حال نواب شاہ، سندھ۔ سید عبدالرشید بادشاہ مرحوم (بٹی کوٹ۔ افغانستان) عبدالشکور اجمیر شریف، قاضی فدا محمد مرحوم (لنڈی ارباب پشاور)، سید چراغ شاہ بادشاہ (حال افغانستان) بنگالی بابا (اصل نام معلوم نہیں) (مشرقی پاکستان)، نرے ملنگ (اس صاحب کا اصل نام کسی کو معلوم نہیں بس اسی نام سے مشہور تھے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے کسی ہندو مہاراجے کا بیٹا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے۔ کہ دوڈھائی سو برس عمر پائی تھی ۔اور بڑھاپے میں حضور بادشاہ جانؒ سے بیعت کی تھی) سید قبول شاہ بادشاہ (حال الائی ضلع ہزارہ) سید عثمان سید بادشاہ (حضور بادشاہ جانؒ کے ماموں زاد بھائی ہیں۔ بقید حیات ہیں۔ اور پشاور میں مقیم ہیں) عبدالغور غوری اور راقم الحروف (حمزہ شنواری) ہوسکتا ہے کہ حضور بادشاہ جانؒ کے بعض خلفاء کا مجھے علم نہ ہو یا اس وقت ان کے نام یاد نہ آتے ہوں۔ بہر حال اگر بعد میں ایسے حضرات کا علم ہوا۔ تو انشاء اللہ کتاب کی دوسری اشاعت میں ان کے نام بھی شامل کر دیئے جائیں گے۔

----------ختم شد----------